درد کاکوروی
حیات
اور
کارنامے
ڈاکٹر فرقان علی مخمور کاکوروی

میر نذر علی دردؔ کاکوروی

حیات اور کارنامے

ڈاکٹر فرقان علی مخمور کاکوروی

کتاب : میر نذر علی درد کاکوروی، حیات اور کارنامے
مصنّف : ڈاکٹر فرقان علی سلمانی مخمور کاکوروی
ناشر : ڈاکٹر فرقان علی سلمانی مخمور کاکوروی
۶۸۔ چودھری محلّہ۔ کاکوری لکھنؤ
سن اشاعت : ۱۹۹۷ء
تعداد : چار سو (۴۰۰)
کتابت : عبدالسمیع قاسمی۔ محمد ہارون ندوی
طباعت : آفسیٹ انڈیا پریس، مشک گنج لکھنؤ
قیمت : ۱۴۰/= روپے

تقسیم کار

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی
۲۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڈھ
۳۔ دانش محل امین آباد۔ لکھنؤ
۴۔ نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ
۵۔ اقصیٰ پبلک لائبریری، کاکوری لکھنؤ

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل
کمیٹی، حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے
مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

اس تحقیقی مقالے پر مصنّف کو لکھنؤ یونیورسٹی نے

۱۹۹۴ء میں

ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری سے سرفراز کیا۔

دولت علم و ہنر جس کو بھی مل جاتی ہے
اس کو ہرگز غم افلاس نہیں ہوتا ہے

مخمور کاکوروی

انتساب

استاذ گرامی پروفیسر سید محمود الحسن رضوی

صدر شعبہ اردو

لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ

کے نام

شبنم از فیضِ نگاہِ او گہر

عنوانات

باب سوم

درد کاکوروی بحیثیت غزل گو

(الف) درد کاکوروی کی غزلوں میں لکھنوی غزل گوئی کے اثرات
(ب) غزلوں میں تصوّف کے مضامین
(ج) درد کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ

باب چہارم

درد کاکوروی کی نظم گوئی

(الف) درد کی نظموں کے موضوعات
(ب) نعتیہ نظموں کا جائزہ
(ج) تاریخی اور مذہبی نظمیں
(د) درد کی نظموں کی مجموعی خصوصیات

باب پنجم

درد کاکوروی کی رباعیات اور دیگر اصناف سخن کا مطالعہ

(الف) رباعیات کے بنیادی موضوعات
(ب) قطعات، تاریخ گوئی، تضامین کی خصوصیات
(ج) فارسی شاعری کا جائزہ

باب ششم

درد کاکوروی بحیثیت نثر نگار

(الف) درد کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین
(ب) سوانحی اور تاریخی مضامین کا مطالعہ
(ج) مذہبی اور صوفیانہ موضوعات

باب ہفتم

اردو ادب میں درد کاکوروی کی قدر و قیمت کا تعین

کتابیات

پیش لفظ

پروفیسر سید محمود الحسن

اردو تنقید کی یہ بڑی کوتاہی رہی ہے کہ اس نے بیسویں صدی کے لکھنوی شعراء کا مطالعہ کرتے وقت محض ایک مخصوص رجحان کو پیش نظر رکھا جس کے تحت الفاظ کی تراش خراش، زبان و بیان کی لطافت، تغزل کی دلکشی اور موضوعات کے لحاظ سے محبوب کے ناز و انداز، جسمانی حسن یا گور و کفن اور خارجی عناصر کے علاوہ دوسرے مضامین کی طرف دھیان ہی نہیں دیا گیا۔ اسی انداز فکر کا نتیجہ تھا کہ محض ان شعراء کو اہمیت دی گئی جنھوں نے یہاں کی قدیم روایات کو آگے بڑھایا اور اپنے مخصوص فنی رجحانات سے چپٹے رہے۔ چنانچہ اس دور کی شاعری کا ذکر آتے ہی سوائے صفی، ثاقب، عزیز، آرزو، سراج، اثر اور سالک وغیرہ کے ایسے شعراء کو نظر انداز کر دیا گیا جنہوں نے یہاں کے روایتی انداز فن سے الگ ہٹ کر موضوعات اور طرز اظہار میں وسعت دینے کی کوشش کی۔ ایک دلچسپ اور قابل توجہ پہلو یہ بھی ہے کہ اس سلسلہ میں لکھنؤ سے قریب قصبہ کاکوری کے شعراء اور ادیبوں نے فن میں ایسا انداز اپنایا جو یہاں سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ چنانچہ اگر ملیح آباد میں جوش نے بیسویں صدی کی شاعری میں ایک امتیاز اور انفرادیت پیدا کی تو کاکوری کے شعراء کی بڑی تعداد ایسی تھی جس نے لکھنوی اساتذہ سے زبان و بیان کی نزاکت لطافت اور باریکیوں کے عناصر سے تو استفادہ کیا لیکن موضوعات کے لحاظ سے اپنا الگ رنگ اختیار کرتے رہے۔ اس سلسلہ میں بیسویں صدی کے جن شعراء کے نام قابل ذکر ہیں ان میں نادر کاکوروی، ارتضیٰ علی مشتہر، نورالحسن نیر،

نورالدین کیفیؔ، فخرالدین سفیؔر، حیدر حسن نشترؔ، غلام احمد فرقتؔ اور ناظرؔ کاکوروی وغیرہ شامل ہیں، ایک اہم پہلو یہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ تمام شخصیتیں محض شاعری کے ذریعہ ادب کے دامن کو وسعت نہیں دے رہی تھیں، بلکہ تقریباً سبھی دانشور بھی تھے، عالم بھی، تصوف و معرفت کے مسائل کے ترجمان بھی تھے اور عارفانہ مزاج بھی رکھتے تھے، ان میں صحافی بھی تھے اور طنز و مزاح کے فنکار بھی اور اس طرح اپنی خدمات سے علم و ادب کے مختلف شعبوں کو وسعت دے رہے تھے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے لکھنؤ سے قربت کے باوجود اپنا ایک الگ ادبی مرکز بنالیا تھا۔ اسی فہرست میں ایک نام اور بھی اہمیت رکھتا ہے لیکن اردو شعر و ادب کی تاریخ میں اسے وہ امتیاز نہ مل سکا جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق تھے اور وہ ہیں میر نذر علی دردؔ کاکوروی۔

دردؔ نے جب شعر و ادب کے میدان میں قدم رکھا اس وقت اردو شاعری مختلف رجحانات سے متاثر ہو رہی تھی۔ ایک طرف لکھنؤ کے غزل گو شعراء کے فنی تقاضے دوسری طرف جوشؔ کے شاعرانہ آہنگ کے ذریعہ انقلاب و بغاوت کے جذبات کا اظہار، غیر ملکی حکومت کے خلاف آزادی کی جدو جہد کے نعرے اور ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند شعراء کے نظریات کی گونج ــ دردؔ نے اپنے کو ان سب سے الگ رکھا چنانچہ شعرائے کاکوری کی جو روایت تھی اس کو جب تک ہندوستان میں قیام رہا اور جب تقسیم ہند کے بعد کراچی ہجرت کر گئے تو وہاں بھی وہی نظریۂ فن ہر منزل پہ حاوی رہا۔ دراصل ان کو جو شاعری ورثہ میں ملی تھی اور جس پر ان کے والد حکیم حبیب علی علوی کا اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ کسی اور رجحان یا تحریک سے متاثر نہ ہو سکے۔ ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۲۰ء میں ہوئی تھی اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں انتقال کے وقت تک ایک ہی انداز قائم رہا

جس میں معرفت و تصوف کے عناصر حاوی رہے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں لکھنوی تنزل کے زیر اثر اس طرح کے اشعار نظر آتے ہیں ؎

عجب کیفیت دل ہے مسرت صورت غم ہے
تعیش گاہ ہستی کیا سراپا بزم ماتم ہے

ہمارے عشق محکم سے کسی کا حسن کہتا ہے
یہ فتنہ آدمی کی خانہ بربادی کو کیا کم ہے

یہ تری بے خود نگاہیں یہ نشیلی انکھڑیاں
دل اسی پیمانہ لبریز سے مدہوش ہے

ہائے کیا حسرت کدہ ہے تیرے عاشق کا مزار
شمع پہلے جل رہی تھی وہ بھی اب خاموش ہے

دہن تیرا ہے اک غنچہ وہ غنچہ غنچۂ خنداں
نگاہ سرمگیں خنجر وہ خنجر خنجر بُراں

لیکن یہ روایتی انداز بہت کم غزلوں میں نظر آتا ہے اور مجموعی طور پر عشق حقیقی اور عارفانہ مسائل کی ترجمانی پر توجہ دی گئی ہے۔ غالب نے تو ایک جگہ لکھا تھا کہ "عاشقانہ شاعری سے مجھے وہی بُعد ہے جو کفر سے ایمان کو ہوتا ہے"، لیکن حقیقتاً ان کی شاعری اس نظریہ سے قریب نہیں ہے لیکن درد نے جب انھیں خیالات کا اظہار کیا تو وہ ان کے دل کی آواز بن کر سامنے

آگیا۔ انھوں نے اپنا نظریۂ فن پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

" ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ عاشقانہ رنگ میں شاعری نہ کیجئے لیکن مدعا یہ ہے کہ اس میں بھی کوئی مفید بات پیدا کیجئے نئی روح پھونکئے، ایسے مضامین لکھئے جو پایۂ تہذیب سے گرے نہ ہوں۔ کچھ کہئے مذاق سلیم کے مطابق کہئے خلاصہ یہ کہ نہ اس دائرے کو اس قدر تنگ کیجئے کہ تہذیب کی چہار دیواری ہمارے جذبات کے لئے قید خانہ بن جائے اور نہ اس قدر وسیع کہ کوئی معیار ہی قائم نہ رہ سکے۔"

لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ جدید تقاضوں سے بالکل انحراف چاہتے ہوں۔ انھوں نے مغربی شاعرانہ اسلوب اور اس کے نظریات کا مطالعہ کیا تھا۔ نئے مسائل سے واقف تھے، ادب میں بدلتی ہوئی قدروں کے قائل تھے اور یہاں تک احساس تھا کہ:۔

" زمانہ کا مذاق بدل گیا اس لئے ہم کو بھی جدید رنگ سے استفادہ کرنا چاہئے ہم کو غزل کے ساتھ نیچرل نظمیں بھی لکھنا چاہیئے۔ جہاں تک ہو نئی تلاش نئی بندش نئے مناظر نئے خیالات نظم کریں تاکہ ہم بھی میدان ترقی میں کسی سے پیچھے نہ رہیں مگر اس کا خیال رہے جو کچھ کہیں اس میں واقعیت ہو، نرا مبالغہ ہی نہ ہو بلکہ اس میں سچے جذبات ہوں۔ نظموں کی طرف توجہ دلانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غزل کہنا موقوف کر دی جائے نہیں غزل ضرور کہی جائے لیکن بے معنی فارسی جملوں کی موزوں ترکیب کا نام غزل نہ ہو۔ روز مرہ کی پابندی کی جائے

اگر فارسی ترکیب سے کام لیا جائے تو الفاظ اور ترکیبیں غیر
مانوس نہ ہوں غزل کو مواد ہوس اور صرف عاشقانہ مضامین
کے لئے محدود نہ کر دیا جائے بلکہ اس کو ہر قسم کے مہذب
اور دلچسپ مضامین سے زینت دی جائے ۔

یہ خیالات ان کے قوت مطالعہ اور مشاہدہ کا احساس دلاتے ہیں جن کے مطابق وہ فن کے مواد کی تبدیلی پر توجہ دیتے رہے لیکن مجموعی طور پر غزل میں تصوف کے مضامین ہی اثر انداز رہے یہاں تک کہ انھوں نے خواجہ میر درد کے رنگ ہی میں شاعری کے موضوعات کو قبول کر کے اپنی اہمیت قائم کرنے کو ترجیح دی ۔

داد دیں کیوں کر نہ تجھ کو آج ارباب سخن
رنگ ہے تیری غزل میں درد خواجہ میر کا

اور اس رنگ میں ان کی جو غزلیں ملتی ہیں ان میں حقیقتاً فن کی امتیازی خصوصیات نظر آتی ہیں ۔ مثال کے طور پر یہ اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں ۔

تصور یہ کسی کے حسن کا ہے یا مرے دل میں
کسی نے کر دیا ہے جلوہ گر مہر درخشاں کو

تیرا جلال ہے الگ تیرا جمال ہے الگ
ملتی نہیں تری ادا جلوۂ مہر و ماہ سے

کس کے جمال کا ہے یہ افسانہ آدمی
کس کے خیال کا ہے پری خانہ آدمی

پی کے شراب معرفت پھرتے ہیں مست ہو کے ہم
خانہ بخانہ در بہ در دشت بہ دشت کو بہ کو

ملائے بحر جس قطرہ کو ہو جائے سمندر وہ
بحمد اللہ وہ قطرہ ہوں دریا بن کے جاتا ہوں

دراصل درد کی غزلیں ان کے روحانی اور ذہنی ارتقا کی کہانی ہے جس میں زندگی کے داخلی تجربات بھی شامل ہیں اور دروں بینی بھی۔ ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ ہر غزل پر ایک عنوان قائم کیا ہے اور اس کا ہر شعر ایک ہی کیفیت اور جذبہ میں ڈوب کر ادا ہوتا ہے اسی لئے جب انھوں نے یہ کہا کہ

شعر وہ ہے سنتے ہی ہو جائے فوراً دل نشیں
شعر وہ ہے جس میں دنیا ہو خیالوں کی حسیں

تو ہر جگہ ان کی یہی ترجمانی ہو جاتی ہے۔

درد کاکوروی ممتاز غزل گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منفرد نظم نگار بھی تھے۔ ان کے یہاں نادر کاکوروی کے اثرات ضرور موجود ہیں لیکن جوش ملیح آبادی کی منظر کشی کے مقابلہ میں فطری حسن اور قدرتی کیفیات کا اظہار جمالیاتی گہرائی سے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ وہ تھوڑا بہت اپنے ہم عصر شعراء سے متاثر ضرور ہیں لیکن ان کی انفرادیت اپنا راستہ الگ اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح ان کی رباعیاں اور قطعات وغیرہ بھی مضامین کی جدت اور موضوع کے تنوع کے لحاظ سے روایتی انداز کے بجائے ایک طرح کی وسعت کا احساس دلاتے ہیں۔ نعتیہ اور منقبت کے موضوعات سے متعلق نظموں میں ان کی تخلیقی صلاحیت اور صناعی زیادہ فطری اور حقیقی نظر آتی ہے جس میں زبان و بیان اور طرزِ ادا سے خلوص و عقیدت کا بیساختہ

اظہار ہوتا ہے۔

درد کی نثری تصانیف کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ مذہبی، تاریخی معرفت و تصوف کے مسائل کے علاوہ انھوں نے اردو زبان و ادب اور تحقیق و تنقید سے متعلق بھی اہم مضامین سپرد قلم کئے ہیں۔ جن سے آج بھی ادب کے مورخین استفادہ کر رہے ہیں۔ ممکن ہے ادبی قدر و قیمت کے لحاظ سے ان کی نثری تصانیف کو شاعری کے مقابلے میں ترجیح نہ دی جا سکے لیکن ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں ان اسباب پر غور کرنا مقصود نہیں ہے کہ درد کاکوروی کی ادبی خدمات کو اردو کے محققین نے نظر انداز کیوں کیا۔ ڈاکٹر فرقان علی مخمور کاکوروی کے ذوق تحقیق کی قدر کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ انھوں نے اس کمی کو محسوس کیا اور تحقیق کے لئے میر نذر علی درد کاکوروی کی حیات و ادبی خدمات کا موضوع منتخب کیا۔ اس انتخاب کے لئے محض یہی جذبہ کارفرما نہیں تھا کہ ان کا تعلق بھی کاکوری سے ہے بلکہ ان کے ذوق مطالعہ نے اس ذخیرہ کو تلاش کر لیا تھا جس کی بنیاد پر وہ چیزیں قارئین کے سامنے آ سکتی تھیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح درد نے ادب کے مختلف شعبوں کو وسعت بخشی۔ ڈاکٹر مخمور خود ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور محقق بھی۔ وہ صحافی بھی ہیں اور ادب کی باریکیوں کے نکتہ شناس بھی چنانچہ جب انھوں نے اپنی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پُر اعتماد انداز میں اس موضوع پر قلم اٹھایا تو بہت سے ایسے گوشے سامنے آ گئے جن پر آج تک کسی کی توجہ نہیں ہوئی تھی۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ خواہ موضوع کے لحاظ سے کوئی انفرادیت محسوس نہ ہوتی ہو لیکن ان کی کاوش، تحقیقی و تنقیدی شعور نے زیر نظر مقالہ کو نہ صرف وقیع بنا دیا بلکہ تحقیقی مقالات کو ایک وقار بھی

بخش دیا۔ ان میں محنت، لگن اور تجسس کے ساتھ زبان و بیان پر جو قدرت اور موضوعات کو پیش کرنے کا جو سلیقہ ہے وہ بہت کم لوگوں میں نظر آتا ہے۔ اور انھیں خصوصیات نے اس تصنیف کو زیادہ اہم بنا دیا ہے یہ کتاب دوسرے تحقیق کرنے والوں اور تنقیدی جائزہ لینے والوں کے لئے ایک اچھا نمونہ ثابت ہوگی۔

یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ یہ تصنیف محض ایک شاعر وادیب کی تخلیقات کا فنی، علمی تجزیہ نہیں ہے بلکہ ایسا تنقیدی کارنامہ بھی ہے جس میں سنجیدگی، متانت، استدلال اور توازن و اعتدال کی خصوصیات پوری طرح موجود ہیں۔ اس میں اسلوب و زبان کی دلکشی بھی ہے اور تجزیاتی اور علمی تنقید کی گہرائی بھی۔ انھیں چیزوں نے اسے تحقیق کا معیاری کارنامہ بنا دیا ہے۔ میں اس تحقیقی و تنقیدی کاوش کے لئے ڈاکٹر فرقان علی مخمور کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ علمی وادبی حلقوں میں اس مقالہ کی اشاعت کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

سید محمود الحسنؔ

ابتدائیہ

قصبۂ کاکوری اپنی شاندار علمی اور ادبی روایات کے لحاظ سے قصبات اودھ میں نمایاں اور ممتاز رہا ہے اس قصبے کی شہرت نہ صرف کاکوری کیس کی وجہ سے ہے جو جدوجہد آزادی کی تاریخ میں زرّیں باب کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ فرزندان کاکوری نے سلوک و معرفت، علم و فن، شعر و ادب، تحقیق و تنقید، طنز و ظرافت اور صحافت و لغت نگاری میں بھی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، شاہ تراب علی قلندر کاکوروی، حسّان الہند علامہ محسن کاکوروی، نور الحسن نیر، مفتی عنایت احمد، مولانا ظفر الملک علوی، نادر کاکوروی، منشی سجاد حسین (مدیر اودھ پنچ) ڈپٹی امیر احمد علوی، غلام احمد فرقت کاکوروی اور میر نذر علی درد کاکوروی وغیرہ ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔

۱۹۸۳ء میں شیعہ کالج میگزین کیلئے استاد محترم ڈاکٹر کاظم علی خاں نے مضمون لکھنے کا حکم دیا تو درد کاکوروی پر مضمون لکھنے کا خیال پیدا ہوا مگر بعض وجوہ کی بناء پر درد کے بجائے "کاکوری کے چند ہندو شعراء" عنوان کے تحت مضمون نے سپرد قلم کیا۔ اس مضمون سے متعلق معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں جب کتابوں رسالوں اور تذکروں کی ورق گردانی کی تو یہ احساس ہوا کہ میر نذر علی درد کاکوروی کی شخصیت اور فن پر ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا جاسکتا ہے۔

اردو میں ایم اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے کا ارادہ کیا تو اس خواہش کو پورا کرنے کا موقع ملا کہ درد کاکوروی پر باقاعدہ تحقیقی کام کیا جائے، پروفیسر گیان چند جین کے ان خیالات نے میری مزید ہمت افزائی کی :-

"اپنے علاقے کی قابل تحقیق شخصیتوں اور مواد پر نظر ڈالیئے اگر وہاں سے متعلق کوئی موضوع مل جائے تو سہولت رہے گی اور علاقے کی دھرتی کا حق بھی ادا ہو جائے گا۔" ؎۱

چنانچہ جب میں نے "میر نذر علی درد کاکوروی حیات اور کارنامے" کے موضوع پر تحقیق کرنے کی خواہش کا اظہار استاد محترم پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی سے کیا تو انھوں نے کہا کہ درد کا اس قدر کام ہے کہ ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جا سکے میں نے درد صاحب کی متعدد تصنیفات ان کے سامنے پیش کیں جنھیں دیکھ کر انھوں نے موضوع کی منظوری عطا کر دی۔

میں نے جب یہ کام شروع کیا تو مجھے یہ خیال تھا کہ یہ کام میرے لئے زیادہ مشکل نہ ہوگا مگر جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا مشکلیں درپیش آتی گئیں، مواد کی فراہمی میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا وہ ناقابل بیان ہیں، دور دراز کے سفر، پاکستان و ہندوستان کے تعلقات کے نتیجے میں ویزا کا حاصل کرنے میں جن زحمتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ان کا خیال کر کے آج بھی دل لرز جاتا ہے، سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے پاکستان پہنچا، درد صاحب کی دختر سے بھی خاطر خواہ مواد فراہم نہ ہو سکا، بہر کیف ہمت مرداں مدد خدا کے مقولے کے تحت تلاش و جستجو کرتا رہا اور بالآخر یہ مقالہ مکمل ہو گیا۔

؎۱ تحقیق کا فن از گیان چند جین ص ۹۰

میں نے مقالے کو اپنی سہولت کے پیش نظر سات ابواب میں تقسیم کیا ہے
باب اول میں سماجی اور ادبی پس منظر کے تحت بیسویں صدی میں ہندوستان کے تاریخی مسائل، آزادی کی جد و جہد، کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش، جلیان والا باغ، خلافت تحریک، ہندوستان چھوڑو تحریک، پاکستان کا قیام نیز اودھ کا ادبی پس منظر اور کاکوری کے علماء و شعراء کی علمی اور ادبی خدمات کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب دوم میں درد کاکوروی کے حالات زندگی اور شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں ان کے خاندان، نام و نسب، ولادت، ابتدائی ماحول، تعلیم و تربیت، عادات و اطوار، شاعری کا آغاز، تلمذ، ملازمت، شادی، اولاد، تلامذہ، مختلف شہروں میں قیام اور وفات وغیرہ کو سپرد قلم کیا گیا ہے۔

باب سوم میں درد کاکوروی بحیثیت غزل گو عنوان کے تحت ان کی غزلوں میں لکھنوی غزل گوئی کے اثرات غزلوں میں تصوف کے مضامین اور درد کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں درد کی نظم گوئی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے ان کی نظموں کے موضوعات، نعتیہ شاعری کا جائزہ، تاریخی اور مذہبی نظموں پر اظہار خیال کرنے کے بعد ان کی نظموں کی مجموعی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب پنجم میں درد کی رباعیات اور دیگر اصناف سخن کا مطالعہ کے ذیل میں ان کی رباعیات کے بنیادی موضوعات، قطعات، تاریخ گوئی اور مضامین کی خصوصیات نیز فارسی شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

باب ششم میں درد کاکوروی بحیثیت نثر نگار کے تحت ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین، سوانحی اور تاریخی مضامین اور مذہبی و صوفیانہ نگارشات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

باب ہفتم میں اردو ادب میں درد کاکوروی کی مجموعی قدر و قیمت کا تعین ان کے نثری اور شعری کارناموں کے پس منظر میں کیا گیا ہے۔

مقالے کی تیاری میں حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بات خلاف واقعہ نہ ہو اور درد کی حیات و خدمات کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہنے پائے مگر فطرت بشری کے تحت خامیاں باقی رہنے کا بہرحال امکان موجود ہے، ارباب علم و دانش خامیوں اور کوتاہیوں کو دامن عفو میں جگہ دے کر ان کی نشاندہی فرمانے کی زحمت کریں گے۔

آخر میں پروفیسر سید شبیہ الحسن سابق صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض اولین سمجھتا ہوں جنھوں نے اس موضوع پر کام کرنے کی منظوری دی، استاد محترم پروفیسر سید محمود الحسن صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میرے استاد اور نگراں ہی نہیں میرے محسن بھی ہیں جن کی رہنمائی ہر لمحہ میرے شامل حال رہی ہے، اگر قدم قدم پر ان کی رہنمائی حاصل نہ ہوتی تو شاید یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکتا، ان کا شکریہ ادا کرنے کیلیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، ڈاکٹر سید سلیمان حسین، ڈاکٹر انیس اشفاق اور ڈاکٹر شمیم رضوی کا بھی میں شکرگذار ہوں۔

مرحوم نثار احمد علوی ساقی مؤلف سخنوران کاکوری کا شکریہ نہ ادا کرنا بڑی ناانصافی ہوگی انھوں نے درد کاکوروی کی دس کتابیں پاکستان سے بذریعہ ڈاک مجھے ارسال کیں، افسوس کہ وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

جناب طاہر محسن علوی، جناب معین احمد علوی، جناب مرزا محمد کاظم، جناب اظہر مسعود رضوی، سید شمیم حسین، جناب عبدالرب، جناب رشید قریشی جناب احتشام عباس حیدری، جناب عبدالحسیب، جناب عرفان علی ڈاکٹر کمال الدین، سید فدا حسین حسینی، جناب معظم امید، جناب معاذ اختر

جناب غفران علی اور جناب عبدالعزیز کا بھی بےحد مشکور ہوں، ان حضرات نے مجھے بڑا تعاون دیا، آخر میں اپنی شریک حیات کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنھوں نے میرے مطالعے کے اوقات میں مجھے ہر طرح کے انتشار سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

فرقان علی سلمانی مخمور کاکوروی

۲۹ر دسمبر ۱۹۹۳ء

کاکوری اکیڈمی

حکیم نثار احمد علوی ۔ ڈی، یو، ایم، ایس (علیگ) : البشیر ۔ ا ۔ ای ایچ ۔ ۸ ۔ ۲۲
فون دفتر : ۷۹۸۲۴ ناظم آباد، کراچی ۔ نمبر ۱۸

عزیزم ! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط ملا ۔ یہ معلوم ہو کر مسرت ہے کہ آپ کو تحقیق سے دلچسپی ہے وطن کی سرزمین سے جب کسی ایسے نوجوان کی سرگرمی کی خبر ملتی ہے تو میرا دل خوش ہو جاتا ہے، اللہ آپ کو کامیاب کرے ۔

درد صاحب کی جو کتب دستیاب ہو سکی ہیں، روانہ ہیں، میں نے دو ایسی کتابیں رکھدی ہیں جو آپ کو مل گئی ہیں، امید ہے کہ ان سے آپ کا کام چل جائے گا سخنوران کاکوری سے آپ کو بڑی مدد ملے گی اور اس میں درد صاحب پر جو کچھ لکھا ہے وہ مفید ہو گا ۔

دو کتابیں اور ہیں جو ابھی نہیں مل سکی ہیں اگر ملیں تو روانہ کروں گا، ایسے لوگوں نے طبع کی نقلیں جواب نہیں رہے ۔

۱ ۔ امیر خسرو اور ان کا کلام اردو

۲ ۔ ملفوظات وحالات شاہ فخر دہلوی

اگر کسی لائبریری میں ملیں تو فوٹو اسٹیٹ روانہ کروں گا ۔ شاید تکیہ شریف کاظمیہ میں موجود ہوں کیونکہ مرحوم عم محترم ایک کاپی ہر تصنیف کی وہاں بھیج دیتے تھے ۔

دعا گو
نثار علوی

۳۰ رجنوری ۱۹۸۶ء

باب اوّل

سماجی اور ادبی پس منظر

الف: بیسویں صدی میں ہندوستان کے تاریخی مسائل، آزادی کی جدوجہد
کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش، جلیان والا باغ، خلافت تحریک
ہندوستان چھوڑو تحریک، پاکستان کا قیام۔
اودھ کا ادبی پس منظر اور کاکوری کے علماء و شعراء کی علمی اور ادبی
خدمات (ایک مختصر جائزہ)

•

دنیا کا ہر انسان اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوتا ہے، ادیب اور شاعر چونکہ زیادہ حساس ہوتا ہے اس لئے وہ عام لوگوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اثرات قبول کرتا ہے، شاعر عوام کا ترجمان ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، اخلاقی اور معاشی مسائل کی اپنی تخلیقات میں سچی عکاسی کرتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی شخصیت اور اس کی تخلیقات کو سمجھنے کے لئے ان اسباب وعوامل اور حالات ومسائل کا جائزہ لیا جائے جن سے براہ راست وہ متاثر ہوا ہے اور اپنی تخلیقات کے ذریعے اس نے ان حالات اور مسائل کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔

درد کاکوروی کی پیدائش انیسویں صدی کی آخری دہائی سنہ ۱۸۹۱ء میں ہوئی تھی اور انھوں نے طویل عمر پاکر سنہ ۱۹۷۲ء میں دارفانی سے کوچ کیا۔ پیدائش آبائی وطن قصبہ کاکوری میں ہوئی اور وفات کراچی (پاکستان) میں، یہ بجائے خود ایک سانحہ ہے۔

اترپردیش کے اہل قصبات کو اپنے آبائی وطن سے غیر معمولی محبت رہی ہے اور زیادہ تر وہ فکر معاش کے سلسلے میں اپنے آبائی وطن کو خیرباد کہنے کے باوجود دل میں یہی تمنا رکھتے تھے کہ ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کے

بعد اپنی زندگی کے آخری ایام اپنے وطن میں بسر کریں گے اور وہیں پیوند خاک
ہو جائیں گے جہاں ان کے آباء و اجداد آسودۂ خواب عدم ہیں۔

درد کاکوروی کے دل میں بھی یہی تمنا ہوگی لیکن جن حالات کے تاریخی
عمل نے ان کو مہجور وطن کیا وہ بیسویں صدی میں ہونے والی انقلابی تبدیلیوں
نے پیدا کئے تھے اور درد کاکوروی نے اپنی زندگی میں اس سارے نشیب و فراز
کو خود دیکھا تھا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ سارے سیاسی مسائل ان کی
اپنی عمر کے مرحلوں کی طرح یکے بعد دیگرے پروان چڑھے۔ بیسویں صدی کی
ابتدا میں جب وہ بہت کم عمر تھے تو آزادی کی قومی تحریک پوری طرح نمودار
ہو چکی تھی، انڈین نیشنل کانگریس ہندوستانی عوام کے سیاسی شعور کی واحد
ترجمان بن کر سامنے آچکی تھی۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہندوستانی
مسلمانوں کی جداگانہ سیاست کا وجود بھی ہوا، پہلے شملہ ڈیلی گیشن کی شکل میں
جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ہندوستان کے قانونی اور آئینی ڈھانچے میں اپنی
جگہ طلب کی، پھر آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اس کے باوجود مسلم لیگ
اور کانگریس کے درمیان کوئی ناقابل عبور خلیج حائل نہیں تھی مسلم لیگ صرف
آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے کچھ آئینی تحفظات کی طلب گار تھی۔ مسلم لیگ
اور کانگریس میں باہمی تعاون اور مفاہمت بھی مدتوں برقرار رہی، محمد علی جناح
نے ایک ملک گیر شہرت کے مالک قومی لیڈر کی حیثیت سے ۱۹۱۶ء میں
کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان وہ تاریخی معاہدہ کروایا جو لکھنؤ پیکٹ
(LUCKNOW PACT) کہلاتا ہے، یہ تاریخی معاہدہ تعلیم یافتہ
مسلمانوں کے بنیادی مطالبات کو تسلیم کرتا تھا اور مسلم سیاست میں اس کو
"میثاق ملی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پہلی عالمی جنگ نے خلافت کا ایک مسئلہ بھی ہندوستانی مسلمانوں کیلئے

کھڑا کر دیا۔ یہ ایک جذباتی مسئلہ تھا، مسلمان چاہتے تھے کہ ترکی کی خلافت کسی طرح محفوظ رہے، جس نے جنگ میں جرمنی کا ساتھ دیا تھا لیکن اس جنگ میں برطانیہ، فرانس اور روس کا اتحاد بھاری رہا تھا اور آخر ترکی کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا، خلافت تحریک ایک جذباتی تحریک تھی لیکن اس نے ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو متحد کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا، گاندھی جی کی قیادت، کو مولانا ابوالکلام آزاد، علی برادران اور مسلمان رہنماؤں کی اور مسلمانوں کی اکثریت نے تسلیم کر کے آزادی کی جد و جہد تیز سے تیز تر کر دی، اسی دوران امرتسر میں جلیان والا باغ سانحہ رونما ہوا، جس نے سارے ملک میں آگ لگا دی، کانگریس نے ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو ستیہ گرہ تحریک کا اعلان کر دیا تھا اور ۹ اپریل کو ملک گیر پیمانے پر تحریک شروع ہو گئی پنجاب میں ستیہ گرہ کا سب سے زیادہ زور لاہور اور امرتسر میں تھا جہاں مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا، امرتسر میں گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر پھیلی تو لوگ بے قابو ہو گئے، ایک بینک پر حملہ ہوا کچھ انگریزوں اور ایک میم کو قتل کر دیا گیا انگریزی حکومت کی سختیوں اور جوابی کارروائیوں کے خلاف امرتسر کے عوام نے جلیان والا باغ میں ایک عام احتجاجی جلسے کا اعلان کر دیا، جنرل ڈائر نے مشین گنوں سے مسلح فوجی دستوں کے ذریعے جلیان والا باغ کو ہر طرف سے گھیر لیا اور پر امن جلسے پر بے وجہ فائرنگ شروع کر دی اور جلیان والا باغ میں ۳۷۹ ہندوستانی افراد شہید ہو گئے جن میں ہندو مسلمان، سکھ بوڑھے، بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں، ۱۲۰۰ افراد زخمی ہوئے اس واقعے نے ہندوستانی عوام کو ہلا کر رکھ دیا، سارے ملک نے دیکھنا کہ برطانوی سامراج عظیم تہذیب و تمدن کے پردے میں کتنے بھیانک مظالم کر سکتا ہے، عظیم انسان پرور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے

احتجاج کرتے ہوئے سرکاری خطاب واپس کر دیا اور لکھا کہ:

"وہ وقت آگیا ہے کہ اعزازی تمغے ہماری ذلت
کے دیکھتے ہوئے نشان بن گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ
تمام مخصوص اعزازات سے معرّا ہو کر اپنے ان ہم وطنوں کے
دوش بدوش کھڑا ہو جاؤں جو اپنی نام نہاد کم حقیقتی کی
وجہ سے ایسی ذلت واہانت کے مستحق قرار دئے گئے
ہیں جو کسی انسان کے شایان شان نہیں ہو سکتی"۔[1]

جلیان والا باغ کے سانحے نے جو آگ لگائی تھی اس نے ہندوستان میں عوامی بیداری کی پہلی لہر پیدا کر دی، عوام بھی ہر جگہ ستیہ گرہ، عدم تعاون اور جیل بھرو تحریک کے نعروں سے متاثر ہونے لگے، سیاسی بیداری کا یہ دور ہندوستانی سیاست میں بڑا مبارک دور تھا لیکن چند ہی برس کے بعد حالات میں بنیادی تبدیلی ہونے لگی، تحریک خلافت کو پہلا دھچکا ہجرت کی تحریک میں ناکامی سے لگا جس کے تحت بڑی تعداد میں لوگ حد پار کر کے افغانستان پہنچ گئے تھے لیکن ان کو وہاں ناقابل بیان مصائب کا سامنا کرنا پڑا، تحریک خلافت کا خاتمہ اس وقت ہوا جب نومبر ۱۹۲۲ء میں اتاترک نے ترکی خلافت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا، ترکی کو ایک سیکولر طرز کی جمہوریہ بنا دیا گیا اور سلطان عبدالمجید خاں کو برائے نام خلیفہ مقرر کر دیا گیا لیکن یہ صورت حال بھی زیادہ دنوں تک باقی نہ رہی اور مارچ ۱۹۲۴ء کو اتاترک نے اس برائے نام خلافت کا بھی خاتمہ کر دیا، ان چند برسوں کے درمیان گاندھی جی کی قیادت میں ستیہ گرہ اور عدم تعاون کی تحریک سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور کانگریس ملک کی سب سے بڑی سیاسی طاقت بن گئی تھی،

[1] جدید ہندوستان ص ۲۸۱، نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ ۱۹۷۱ء

خلافت تحریک کی جذباتیت کا تذکرہ بہت ہوتا ہے اور یہ کسی حد تک درست بھی ہے، لیکن اس تحریک نے ملک کی سیاست میں ایک بڑا تعمیری کردار ادا کیا تھا، پروفیسر محمود الٰہی نے بہت کامیاب انداز میں تاریخ کے اس سنہرے باب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"خلافت ایک مذہبی مسئلہ تھا لیکن انگریزوں کی ریشہ دوانیوں نے اُسے ایک سیاسی مسئلہ بنا دیا تھا ہندوستان میں اس مسئلے کو مذہبی بھی سمجھا گیا اور سیاسی بھی اور اسے دونوں حیثیتوں سے حل کرنے کی کوشش کی گئی یہاں اس امر کی نشاندہی نامناسب نہ ہوگی کہ وہ ہندوستانی جو انگریزی حکومت کے وفادار تھے اس تحریک کو کچلنے کے درپے تھے، مسلمانوں سے کہا جاتا تھا کہ یہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے اور ہندوؤں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی تھی کہ یہ مسئلہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات سے متعلق ہے جس سے انھیں کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے ہمارے رہنماؤں کی تقریباً ساری قوت اس کے دفاع میں صرف ہوگئی انھوں نے اس کے مذہبی رخ کو بھی آئینہ کر دیا اور اس کے سیاسی عمل اور ردِّ عمل کو بھی واضح کر دیا۔

تحریک خلافت نے قوم کو ترکِ موالات کا حربہ دیا جس نے انگریزوں کے حواس مختل کر دئے اور جو تحریک ترکی میں خلافت کی بقا کیلئے شروع کی گئی تھی وہ جنگ آزادی کی سب سے بڑے محاذ میں بدل گئی، انگریز حکومت اس قدر بوکھلائی تھی کہ اس نے علماء سے ترکِ موالات کے خلاف

فتوے حاصل کیے لیکن قوم تھی کہ آگے ہی بڑھتی جارہی
تھی، سرکاری ملازمتوں سے کتنے استعفے پیش ہوئے
ولایتی کپڑوں کی کس کس طرح ہولی جلائی گئی، سرکاری
درس گاہوں کا کس کیسے انداز سے مقاطعہ کیا جاتا
تھا اور سودیشی مال واسباب کی محبت نے کس بڑی حد تک
دلوں میں گھر کرلیا تھا ان کے جوابات تاریخ نے محفوظ
کرلیے ہیں اور جب جب ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی
تاریخ لکھی جائے گی تو یہ جوابات سب سے مستند اور اہم ماخذ
کی حیثیت سے جگہ پائیں گے "[1]

تحریک خلافت اور قومی آزادی کی تحریک کے ایک سرگرم مجاہد
قاضی محمد عدیل عباسی نے یہ پورا دور اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزرتا ہوا
دیکھا تھا، انھوں نے اس کی سبق آموز داستان اپنی کتاب "تحریک خلافت"
میں بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

"تحریک خلافت نے ہندوستان کے اندر ایک عام
جذبہ منزل آزادی کامل کی جانب، عزم وہمت سے چلنے کا
اور راہ کی مشکلات ومصائب پر استقامت بالحق اور
تمنائے سرفروشی سے کام کرنے کا عملی سبق دیا۔ ہم چلے
اور گرے، ہم کو ٹھوکریں لگیں، ہمارے لیڈروں نے غلطیاں
کیں لیکن جو کارواں روانہ ہوا تھا اس کا بانگ جرس
خاموش نہیں ہوا اور اس جذبے کو تحریک خلافت نے جنم دیا تھا"[2]

---

[1] انتخاب خطبات خلافت مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی ص ۶-۷ ہشتہ ۱۹۸۸ء، اردو اکادمی لکھنؤ
[2] تحریک خلافت از قاضی عدیل عباسی ۱۹۷۸ء ترقی اردو بیورو نئی دہلی،

بیسویں صدی کی تیسری دہائی ہندوستان کیلئے بہت منحوس ثابت ہوئی اس میں نہ صرف تحریک خلافت، تحریک ہجرت اور ستیہ گرہ کی تحریک کی ناکامی کے واقعات سے عوام میں مایوسی اور تلخی پیدا ہونے لگی بلکہ فرقہ وارانہ اختلافات نے بھی سر اٹھایا، شدھی اور سنگھٹن کے اندولن ابھرے اور اس کے ردعمل میں تنظیم و تبلیغ کے نام سے جوابی اقدام کئے گئے، ملک میں چند بڑے خون ریز فسادات ہوئے اور پورے ملک میں ماحول درہم برہم ہوگیا، تیسری دہائی کے خاتمے پر یہ اختلافات اپنے عروج پر پہنچ گئے تھے آخرکار جب ملک کے آئندہ آئینی نظام کی بابت کانگریس نے اپنے نقطۂ نظر کو نہرو رپورٹ کی شکل میں واضح کردیا تو علی برادران سمیت بہت سے مسلم رہنما کانگریس سے مایوس ہوکر اس سے الگ ہوگئے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ نے مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم ہونے کی حیثیت اختیار کرنا شروع کردی، چوتھی دہائی میں علامہ اقبال اور آغا خان، محمد علی جناح کو جو لندن چلے گئے تھے ہندوستان آنے پر مجبور کردیا گیا اور مسلم لیگ کی قیادت ان کے ہاتھوں میں سونپ دی گئی سنہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ پاکستان کا ابتدائی تصور پیش کیا اور پھر سنہ ۱۹۴۷ء میں اس کو اپنا بنیادی مطالبہ بنا دیا۔

مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اختلافات اس سے پہلے ہی آخری انتہا کو پہنچ چکے تھے، جب گاندھی جی کی سربراہی میں کانگریس نے سنہ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ دو کا نعرہ بلند کیا اور انگریزی حکومت سے براہ راست ٹکر لی تھی تو مسلم لیگ نے اپنے آپ کو اس سے بالکل الگ رکھا تھا، اسی طرح ہندوستان چھوڑ دو تحریک سے کچھ پہلے جب کانگریس وزارتوں نے عدم تعاون کرتے ہوئے استعفے پیش کر دئے تھے تو مسلم لیگ نے "یوم نجات" منایا تھا، لیگ اور کانگریس کی یہ کشمکش ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان آویزش کا سبب بنتی

چلی گئی، آخر میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کو حالات نے اس مقام پر پہنچا
دیا جہاں ان دونوں نے ملک کی تقسیم کو قبول کر لیا، ہندو مسلم کے ٹکراؤ سے
زیادہ یہ دراصل کانگریس اور مسلم لیگ کی رقابت کا نتیجہ تھا، جو ہوا اس کی
ذمہ داری کسی ایک فرقے پر نہیں ڈالی جا سکتی، بہر حال ۱۹۴۷ء میں آزادی
ملک کی تقسیم کے ساتھ حاصل ہوئی اور تقسیم ہند نے غیر معمولی مسائل پیدا کیے
جن کے تلخ نتیجے عوام آج تک بھگت رہے ہیں، اس تقسیم نے ہندو اور
مسلمان کے درمیان وہ خلیج پیدا کر دی جس کا پُر ہونا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے
یہ بیسویں صدی میں برصغیر کیلئے صرف ایک سیاسی مسئلہ نہیں ہے بلکہ تہذیبی
اور سماجی مسئلہ بھی ہے، اردو زبان اور اس کے مستقبل سے زیادہ اردو زبان
کی موجودہ حیثیت، اور حالیہ مسائل تقسیم کا نتیجہ ہیں مستقبل تو پردۂ غیب میں ہے
جو کچھ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں لکھنؤ دہلی اور حیدرآباد دکن کے
علمی اور ادبی مراکز اچانک حالات کے شکار ہو گئے، لاہور ایک بڑا مرکز تھا
جو ہندوستان سے کٹ کر پاکستان میں رہ گیا، اردو کی تعلیم کو بڑا دھکا پہنچا
یہاں تک اردو بولنے والے گھروں میں ایک ایسی نسل نے جنم لیا اور پروان
چڑھی جو اردو سے ناواقف ہے، شہری علاقوں کی طرح شمالی ہند اور خاص
طور سے اودھ کے قصبات اردو تہذیب کا گہوارہ تھے وہاں بھی زمین آسمان
بدل گئے اور اردو کا چرچا باقی نہ رہا، ہندوستان میں اردو کو یونیورسٹی
کی سطح تک تعلیم کی زبان بنانے کا جو تجربہ جامعہ عثمانیہ (عثمانیہ یونیورسٹی)
اور اس کے دارالترجمہ نے کیا تھا وہ بھی ایک قصۂ پارینہ بن گیا اس طرح
بیسویں صدی میں اردو کو اپنی تاریخ کے سب سے برے دن دیکھنے
پڑے، درد کاکوروی نے بھی ان تبدیلیوں کی ساری اذیت برداشت
کی اور ان کو اپنے وطن کاکوری اور ہندوستان سے دور ہونا پڑا وہ کراچی

چلے گئے اور وہیں ۱۹۷۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا اور عزیز آباد کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے، ایک مہجور وطن شاعر کی حیثیت سے وہ کبھی نہ کاکوری کو فراموش کر سکے اور نہ ہندوستان کو جہاں انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ گذارا تھا ان کے دل میں اس انقلاب نے جو زخم لگائے تھے وہ برابر رستے رہے جن کا اظہار انھوں نے اپنی نظم "امر اور انسانیت" میں کیا ہے۔

اودھ کا ادبی پس منظر
اور کاکوری کے علماء و شعراء کی علمی و ادبی خدمات
(ایک مختصر جائزہ)

شمالی ہند کے جس علاقے کو اودھ کہا جاتا ہے وہ اودھی زبان کا علاقہ ہے جو ایک قدیم زبان ہے، اس کے ارتقاء میں ان مسلمان صوفیوں نے بڑا حصہ لیا تھا جو اودھ کے علاقے میں آباد ہونے والے مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوئے تھے ان میں پدماوت کے خالق ملک محمد جائسی اور ہنس جواہر کے خالق قاسم شاہ دریابادی کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے ان دونوں نے اودھی زبان میں ایک صوفیانہ تمثیل تخلیق کی ہے، لیکن اپنے پیام کی اشاعت کیلئے عوام کی زبان اودھی کو استعمال کیا ہے، اسی طرح اودھ کے علاقے میں اودھی زبان کے ارتقاء کے پہلو بہ پہلو کھڑی بولی کا بھی ارتقاء ہوا جو ایک ملی جلی زبان تھی، اودھ کے تمام قصبات شعر و ادب، اور تہذیب کے اہم مرکز تھے اور یہاں خانقاہوں، مدرسوں میں علم و معرفت اور شعر و سخن کی گرم بازاری صدیوں تک رہی، لکھنؤ بھی ابتداء میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہی تھا جو بتدریج ترقی کر کے ایک بڑے شہر کی

شکل میں نمودار ہوا۔ لکھنؤ کا ارتقا آصف الدولہ کا سب سے زیادہ مرہون منت ہے جنہوں نے ۱۷۷۴ء میں عنان حکومت سنبھالنے کے بعد لکھنؤ کو اودھ کی راجدھانی بنانے کا تاریخی فیصلہ کیا اور لکھنؤ کو آخر کار شمالی ہند کا سب سے بڑا اور ممتاز علمی ادبی و تہذیبی مرکز بنا دیا مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھنؤ کی اس عظمت رفتہ کا ذکر کرتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے :

"زبان اور شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم و فضل میں بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگر سچ پوچھیے تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد و قرطبہ اور اقصائے شرق کا نیشاپور اور بخارا تھا۔" [1]

مختلف علوم و فنون میں مہارت رکھنے والے باکمال افراد کے بارے میں مرزا رجب علی بیگ سرور یوں رقم طراز ہیں :

"امیروں میں حسین علی خاں بلبل ہزار داستان، خوش الحان، مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر، صاف باطن نیک ضمیر، خلیق فصیح مرد مسکین مکروہات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب، دبیر مرغوب سکندر طالع بصورت گدا بار احسان اہل دول کا نہ اٹھایا۔ عرصۂ قلیل میں مرثیہ سلام کا دیوان کثیر فرمایا، طبیب ہر ایک مسیحائی کرتا ہے، ہم بازی کا دم بھرتا ہے جسے دیکھا، بقراط، سقراط جالینوس زماں ہے۔ اس معنی میں یہ خطہ رشک زمین یونان ہے۔ بیرک جان صاحب پیرنے کے فن سے ایسے آشنا ہوئے کہ مردم بحر و بر سرگرم ثنا ہوئے۔ شاعر زبان داں ایسے کہ عرفی و خاقانی کی غلطی بتائی، فردوسی و انوری کی یاد بھلائی۔ شیخ امام بخش ناسخ نے یہ ہندی کی چندی کی اور روزمرے کو ایسا فصیح و بلیغ کیا کہ کلام سابقین منسوخ ہوا۔

---

[1] گذشتہ لکھنؤ ص ۱۵۱ ہندوستان بک ڈپو ۱۹۸۸ء لکھنؤ

فصحائے شیراز و اصفہان اس سیف زبان کا لوہا مان گئے اپنے قیچ پر منفعل ہوئے اس زبان کا حُسن جان گئے۔ زمین شعر کو آسمان پر پہنچایا سیکڑوں کو اُستاد بنایا۔ خواجہ حیدر علی آتش کی آتش بیانی شرر افشانی سے دل جلوں کے سینوں میں سوز و گداز ہے، مرزا رفیع شاعر ممتاز ہے۔" [1]

لکھنؤ نے شعر و سخن کے ایک بڑے اور بنیادی مرکز کی حیثیت سے اودھ کے پورے علاقے کو اپنے رنگ میں رنگ لیا، اودھ میں کھڑی بولی کے ارتقا کے دور میں جس اسلوب کو اختیار کیا گیا وہ ہندوی یا ریختہ کی ترقی یافتہ شکل یعنی اردوئے معلّٰی تھی لکھنؤ اردو کا مستند اور معتبر علمبردار تھا اور اودھ میں ہر جگہ لکھنؤ کے اہل زبان کے لسانی رویے کو آخری سند تسلیم کر کے لکھنؤ کے لسانی رویے کو قبول کر لیا گیا اس طرح وہ شعری زبان اور نثر سکہ رائج الوقت قرار پائی جو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کہلائی لکھنؤ اور اودھ کا فرق یہاں پہنچ کر بالکل ختم ہو گیا۔ بیسویں صدی میں اردو کے جو بے شمار شاعر اور ادیب منظر عام پر آئے ان سب کی زبان تمام اودھ میں لکھنؤ کی مستند زبان ہی تھی جن لوگوں نے اودھ کے علاقے میں شہروں قصبات اور دیہی علاقوں سے ابھر کر اردو دنیا میں دوامی شہرت حاصل کی ان کی گنتی بھی آسان نہیں ہے۔ بیسویں صدی میں غیر معمولی شہرت حاصل کرنے والے نثر نگاروں میں بہت نمایاں نام ان لوگوں کے بھی ہیں جو انیسویں صدی کے آخری حصے میں اپنا سکہ جما چکے تھے ایسے نثر نگاروں میں مولانا عبد الحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی سجاد حسین کاکوروی، محمد علی طبیب، مرزا ہادی رسوا سب سے زیادہ ممتاز ہیں لکھنؤ سے شائع ہونے والے اودھ پنچ، اودھ اخبار اور رسالہ دلگداز نے لکھنے والوں کی ایک نسل پیدا کی۔ بیسویں صدی میں لکھنؤ سے مسلم گزٹ شائع ہونے لگا جو علمی سیاسی اور سماجی مسائل پر لکھنے والوں کا ترجمان تھا اس کے بعد ادب تنقید اور نثر نگاری کے مستند اسلوب کو فروغ دینے میں

---

[1] فسانۂ عجائب ص ۲۱-۲۰ رام نرائن لعل بینی مادھو، الہ آباد ۱۹۷۶ء

ظفرالملک علوی کے ماہ نامے الناظر نے غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ الناظر نے اپنے دور میں روشن خیالی اور فکری آزادی کو فروغ دینے میں بہمایانہ کردار ادا کیا۔ مولانا شبلی پر پہلی سنجیدہ تنقید الناظر میں شائع ہوئی جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم کی مرہون منت تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے بعد میں سچ، صدق اور صدق جدید کے ذریعے اردو انشا پردازی کی روایت میں اضافہ کیا۔ انھوں نے انگریزی سے نفیس ترین ترجمے بھی کیے اور تاریخ و فلسفہ پر قلم اٹھا کر علمی نثر کے ذخیرے میں اضافہ کیا۔ شعر و سخن کی تنقید بھی لکھی اور قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کی سعادت بھی حاصل کی۔

اردو شعر و ادب کو فروغ دینے میں رسالوں کے کردار کو عام طور پر بہت نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن اردو کے ہفتہ وار اور ماہ ناموں نے اردو نثر اور شاعری دونوں ہی کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے میں بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ کانپور سے منشی دیانرائن نگم نے اپنے رسالے زمانہ کے ذریعے کم و بیش نصف صدی تک اردو ادب کی نئی تخلیقات اور نگارشات کو منظر عام پر لانے کا فرض انجام دیا۔ بے شمار لکھنے والوں کو اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ اسی طرح لکھنؤ سے نیاز فتحپوری نے ماہ نامہ نگار کی اشاعت کر کے اردو زبان میں ایسی وسیع تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم کیا جس میں ادب، مذہب اور شاعری کے بنیادی مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

اردو میں شعر و ادب کی نئی تحریک شروع ہوئی تو اودھ میں اردو کے لکھنے والوں نے نمایاں حصہ لیا، مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا جیسا شاہ کار ناول لکھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر اور محمد علی طبیب نے تاریخ کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل پر بھی معیاری ناول لکھے۔ ناول نگاری اس دور میں خاصی مقبول ہوئی اور بے شمار اردو ناول وجود میں آئے۔ بیسویں صدی میں ناول نگاری اور افسانہ نویسی پر توجہ روز بہ روز بڑھتی گئی اور اودھ میں منشی پریم چند، نیاز فتحپوری، علی عباس حسینی اور سید رفیق حسین نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ان کے علاوہ افسانہ نگاری اور ناول نگاری کے میدان میں

اودھ کے لکھنے والوں نے بہت کچھ کارنامے یادگار چھوڑے ہیں جن کا تفصیلی جائزہ یہاں ممکن نہیں ہے۔

اردو تنقید کی ابتدا یقینی طور پر مولانا حالی پانی پتی کے مقدمۂ شعر و شاعری اور مولانا شبلی کے موازنۂ انیس و دبیر سے ہوتی ہے لیکن اس سے پہلے لکھنؤ اور اودھ میں قدیم طرز کے بے شمار تذکرے لکھے جا چکے تھے جن میں نہ صرف ہماری ادبی تاریخ کا تسلسل محفوظ ہو گیا ہے بلکہ ان میں سخن شناسی کے وہ اصول اور معیار بھی تذکرہ نگاروں نے آنے والی نسل کیلئے درج کر دئے جو دراصل تنقید و تحقیق کو ایک علم اور فن کا درجہ دیتے ہیں یہ تذکرے تحقیق و تنقید کرنے والوں کی کافی حد تک رہنمائی کرتے ہیں۔

جدید تنقید کی داغ بیل ڈالنے والوں میں نیاز فتحپوری پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر سید احتشام حسین وغیرہ کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے اردو تنقید کو ایک نئی منزل کی طرف گامزن کیا۔

لکھنؤ کے تنقیدی رجحانات کے مطالعے کے سلسلے میں گلزار نسیم پر شرر کے اعتراضات اور چکبست کی جانب سے گلزار نسیم اور اس کے مصنف پنڈت دیا شنکر نسیم کے جارحانہ دفاع اور ان کے ادبی معرکے کا مطالعہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے جس میں لکھنؤ اور اودھ کے چند ممتاز شاعروں اور ادیبوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یگانہ چنگیزی نے لکھنؤ کے ہم عصر اساتذۂ سخن پر تحریری حملے کر کے جتنی بھی زیادتی سے کام لیا ہو بہر حال یہ اس دور کا مزاج تھا اساتذۂ سخن پر اس زمانے میں تحریری تنقیدیں ہوتی رہتی تھیں، یہاں تک کہ بیسویں صدی میں لکھنؤ نے ایک ادبی تنازعے کو عدالت تک پہنچا دیا۔[۵]

لکھنؤ نے مرثیہ کو بھی بام عروج پر پہنچانے کی خدمت انجام دی ہے انیس و دبیر اور ان کے شاگردوں نے مرثیہ کو اردو میں پہلی مرتبہ ایک اہم اور باوقار صنف سخن کی حیثیت عطا کی۔ لکھنؤ کے مرثیہ نگاروں کی شہرت و مقبولیت سارے ہندوستان میں پھیلی

۵ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب، از مرزا جعفر حسین،

اور اودھ کے قصبات میں گھر گھر ان کے مرثیے پڑھے جانے لگے اس کے اثر سے سارے اودھ میں مرثیہ کو بڑا فروغ ہوا۔ مرثیہ کی تحقیق و تنقید بھی وجود میں آئی چنانچہ انیس پر جدید نقطہ نظر سے ڈپٹی امیر احمد علوی کاکوروی نے یادگار انیس لکھی جو انیس شناسی کی ابتدا کرنے والی ابتدائی کتابوں میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے میر انیس کا کوئی بھی نقاد اس کتاب سے بے نیاز نہیں گزر سکتا۔ کاکوری کے ہی ایک فرزند منشی منظور علی علوی ابن حکیم محب علی۔ نیر شاگرد مرزا غالب نے انیس کے مرثیوں کو واقعات کے اعتبار سے ترتیب دے کر ۱۹۱۵ء میں واقعات کربلا کے نام سے کتابی شکل میں شائع کرایا۔

لکھنؤ اردو شاعری کا ایک ایسا مرکز تھا جس نے شعر و سخن کے تمام اسالیب میں اپنی انفرادیت کو نمایاں کیا اور اپنے لسانی رویے سے اردو شاعری میں سادگی، سلاست اور روانی، روزمرہ اور محاورے کے استعمال کو قائم اور برقرار رکھنے پر زور دیا یہ طرز سخن سارے اودھ میں ایک مثال کے طور پر فنکاروں کے سامنے ہمیشہ رہتا تھا اور وہ اہل زبان کی پیروی اپنا فرض سمجھتے تھے، ناسخ اور ان کے سلسلے کے استادان سخن نے زبان کی اصلاح کا جو ڈھنگ اختیار کیا تھا وہی آخر کار نہ صرف لکھنؤ اور اودھ بلکہ سارے شمالی ہند میں شاعری کی مستند زبان بن گیا۔ دراصل دبستان لکھنؤ اسی رجحان کا نام ہے ورنہ دہلی اور لکھنؤ کے الگ الگ دبستانوں کے وجود کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ بیسویں صدی میں شاعری میں اودھ کے جو شعرا اپنے جوہر دکھاتے نظر آتے ہیں ان میں نادر کاکوروی اور عبدالحلیم شرر بھی ہیں جنھوں نے اردو میں جدید شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ نادر کاکوروی نے مغربی شاعری کے بہت کامیاب اور اثر انگیز ترجمے کیے اور خود بھی عصری اسلوب میں بہترین نظمیں لکھیں۔ عبدالحلیم شرر نے ردیف و قافیے سے آزاد شاعری کا اردو میں پہلا تعارف کرایا اور پہلا تجربہ بھی کیا اردو میں نظم نگاری میں برج نرائن چکبست اور ان کے ہمعصروں کے

بعد جوش ملیح آبادی نے غیر معمولی کامیابی اور شہرت حاصل کی ۔ ان کے پاس انقلاب
کی گھن گرج بھی ہے اور گہرا جمالیاتی شعور بھی ہے ترقی پسندی کی تحریک کے دور میں
مجاز نے اپنی رومانی و انقلابی نظموں سے نوجوانوں کی کم از کم دو نسلوں کو متاثر کیا ان کی
نظم آوارہ کا شمار تو اردو کی لافانی نظموں میں ہوتا ہے ۔

بیسویں صدی میں اردو غزل ایک بڑی سخت آزمائش کے مرحلے سے گذری
مغربی شاعری کے اثرات نے نظم نگاری کی طرف توجہ کا رخ پھیر دیا تھا اور غزل کو
مشرقی شاعری کی علامت سمجھ کر اس سے گریز بھی شروع ہو گیا تھا لکھنؤ کے استادان سخن
نے اس خطرے کو سب سے پہلے بھانپ لیا تھا اور صفی لکھنوی نے دائرۂ ادبیہ کے نام سے
ایک انجمن بھی بیسویں صدی کے ابتدائی حصے میں قائم کر کے غزل کے زبان و بیان میں
اصلاح کی جدوجہد شروع کر دی تھی ۔ صفی لکھنوی سے پہلے جلال اور امیر کے زمانے میں
غالب کے طرز سخن پر توجہ کی جانے لگی تھی ، صفی اور ان کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے
شاعروں کی نئی نسل نے میر و غالب [illegible] پر زور دیا تھا ، اور یہ سب اردو غزل
کو بچانے اور اسے مقبول بنانے کی ایک کوشش کے سوا کچھ اور نہیں تھا بہرحال ایک
خوشگوار پہلو یہ نکلا کہ غزل کو نئی توانائی ملی اور لکھنؤ اور اودھ میں غزل گوئی خوب خوب
پروان چڑھی ، لکھنؤ میں یگانہ چنگیزی ، نظم طباطبائی ، عزیز ، آرزو ، ثاقب ، صفی ، اثر ،
سالک ، سراج اور قدیر اور اودھ کے دوسرے علاقوں میں حسرت موہانی ، اصغر گونڈوی ،
جگر مرادآبادی ، ریاض خیرآبادی ، رواں اناوی ، فراق گورکھپوری ، بیخود موہانی اور
ثاقب کانپوری لیلائے غزل کے گیسو سنوارنے میں مصروف تھے ۔ غزل اتنی مقبول
صنف ہے کہ اس کے تمام اہم شعراء کے ناموں کا احاطہ بہ آسانی نہیں کیا جا سکتا ۔
صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اودھ نے اپنی ادبی صحبتوں ، مشاعروں اور غزل گوئی کے
ذریعے اردو شاعری کی اس مقبول ترین صنف سخن کو زندہ رکھنے کیلئے اپنے خون جگر کا
استعمال کیا ، شاید ہی کوئی بستی ایسی ہو جس میں غزل کہنے والے نہ پائے جاتے ہوں

بیت بازی کا رواج بھی عام تھا اور بچوں کو ابتدائی تعلیم کے دوران ان کے شعری ذوق کی تربیت غزل کے اچھے اشعار کے یاد کرنے سے ہو جاتی تھی، شعری تربیت کا ایک ذریعہ طرحی مشاعرے بھی تھے، اور ان کا رواج بھی عام تھا، بیسویں صدی میں طرحی مشاعروں کی غزلیں شائع کرنے والے گلدستوں کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اودھ کے قصبات اپنی تہذیب کے دور شباب میں شعر و سخن کے خود مرکز تھے اس لئے وہاں فارسی شاعری کا بول بالا تھا زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ انیسویں صدی میں قصبات میں اردو شاعری نے اپنی بالادستی قائم کرلی، درد کاکوروی کا وطن عزیز کاکوری بھی علم و ادب، شعر و سخن کا ایک ایسا ہی مرکز تھا۔ مقالے کے آئندہ صفحات میں اہل کاکوری کے علمی و ادبی اور شعری کارناموں کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

———— ••• ————

۴

کاکوری کے علمار و شعرار کی علمی و ادبی خدمات

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں اودھ کے جن قصبات کو ممتاز مقام حاصل ہے ان میں ایک قصبہ کاکوری بھی ہے، کاکوری کی علمی اور ادبی شاندار روایات بڑی اہمیت کی حامل ہیں اس قصبہ نے مختلف ادوار میں ایسی شخصیتوں کو جنم دیا ہے جن کے کارنامے رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے، کاکوری کے فرزندوں نے نہ صرف اپنی بزرگی اور کشف و کرامات سے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنا لیا بلکہ علم و فن، شعر و ادب، صحافت و لغت نگاری میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، طنز و ظرافت اور تحقیق و تنقید میں بھی اس قصبہ کو اہم مقام حاصل ہوا ہے، صوفیائے کرام میں حضرت شاہ مولانا کاظم قلندر، شاہ تراب علی قلندر، شاہ علی حیدر قلندر، شاہ علی انور قلندر، شاہ علی اکبر قلندر، قاری نظام الدین، شیخ بھیکہ، شاہ کرامت علی، شاہ حبیب حیدر قلندر وغیرہ کا روحانی فیض آج بھی جاری ہے، خانوادۂ کاظمیہ سے تعلق رکھنے والے بزرگوں کے علمی، ادبی اور شعری کارنامے بھی لائق صد تحسین ہیں۔

کاکوری نے مولانا حمید الدین محدث، مولانا امین الدین محدث، مفتی عنایت احمد، مولانا عبد الشکور فاروقی اور مولانا شیر محمد سلمانی جیسے عالم باعمل کو پروان چڑھایا، شیخ کمال الدین سعدی، مولوی محی الدین ذوق، محسن کاکوروی، ارتضیٰ علی شررؔ، محب علی نیرؔ، امیر حسن بسملؔ نادر کاکوروی، غلام میناساحرؔ، شاہ تراب علی قلندر، نور الحسن نیرؔ، فخر الدین سفیرؔ، نور الدین کیفیؔ، اعجاز حسین علوی اعجاز کاکوروی، غلام احمد فرقت کاکوروی، معراج الدین خردؔ، محمد عالم قیصریؔ، محمد عاصم تبسؔ اور قدر کاکوروی جیسے باکمال شعرار، اور منشی فیض بخش سے جعفر علی شیونؔ، عظمت علی نامیؔ، عابد علی خاں فریادؔ، ظفر الملک علوی، منشی سجاد حسین، ڈپٹی

امیر احمد علوی، حیدر علی نشتر، اور نثار احمد علوی ناظر جیسے ادیب، صحافی اور مؤرخ بھی پیدا کئے ہیں۔ اہل کاکوری کی انفرادیت اور اہمیت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے، شاہ علی حیدر قلندر رقم طراز ہیں:۔

"صوبۂ اودھ (ملک ہندوستان) میں چند قصبات منتخب روزگار شمار کئے جاتے تھے جن میں یہ قصبہ کاکوری بھی اپنی بے نظیر خوبیوں میں منفرد سمجھا جاتا تھا۔ اس نے ایسے ایسے صاحبان کمال پیدا کئے جنھوں نے عہد اسلامی سے لیکر عہد انگریزی تک ہر زمانے میں سیف و قلم، علم و عمل، جہد و ریاضت تدبیر و سیاست سے اپنی ذات اور اپنے وطن کو تمام ملک میں ممتاز کر دکھایا یہی وہ لوگ تھے جن کی خدا پرستی و شان اسلامی کو دیکھ کر شاعر بے اختیار کہہ اٹھا تھا ؎

خصوصاً روز عیدین و ادینہ
نماید شہر کاکوری مدینہ"[1]

کاکوری کی تاریخی حیثیت اور اہل کاکوری کی علمی، ادبی اور شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتحپوری رقم طراز ہیں:۔

"کاکوری کا شمار یو، پی کے ان قصبات میں ہوتا ہے جو اپنی علم دوستی دانش جوئی، سخنوری اور دینی و دنیوی خدمات کیلئے پاک و ہند میں غیر معمولی شہرت و اہمیت کے مالک ہیں اس قصبے نے شعر و ادب سے لیکر صحافت تک اور علم و فن سے لیکر سیاست و مذہب تک بہت سے ایسے ارباب فکر کو جنم دیا ہے جن کا مسلمانان پاک و ہند کی تقدیر بنانے میں بڑا حصہ ہے ان کے خدمات و اثرات کا دائرہ صرف کاکوری کے گرد و نواح تک محدود نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے برصغیر کے ہر گوشے اور ہر طبقہ خیال کو کسی نہ

---

[1] سخنوران کاکوری ص ۹ مرتبہ نثار احمد علوی

کسی نہج سے متاثر کیا ہے۔

اردو کے دامن کو اہل کاکوری نے طرح طرح سے مزین کیا ہے اس میں بہت سے نئے ستارے ٹانکے ہیں، کئی تازہ سمتوں سے آشنا کیا ہے اور اس کی تاریخی قدامت کو محمد شاہ سوم کے سے بہت آگے بڑھا کر عہد اکبری تک پہنچا دیا ہے شعر و ادب کا شاید ہی کوئی شعبہ جس میں انھوں نے انمٹ نشانات یادگار نہ چھوڑے ہوں۔[1]

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے اپنے پیش لفظ مشمولہ سخنوراں کاکوری میں آگے چل کر فرزندان کاکوری کے قابل قدر کارناموں کا مفصل بیان ان لفظوں میں کیا ہے:-

"تحقیق و تنقید اور لغت نگاری کے شعبوں کی طرف بھی کاکوری حضرات نے توجہ کی ہے اردو کو پہلا اور مبسوط در لوط لغت دینے کا سہرا ایک کاکوروی ہی کے سر ہے، میری مراد نور الحسن نیّر کاکوروی کے "نور اللغات" سے ہے، یہ چار ضخیم جلدوں میں ہے اور یہی نہیں کہ بہ لحاظ ذخیرۂ الفاظ ممتاز ہے بلکہ اس میں لفظ کے معنی کے ساتھ اس کے محل استعمال کا تعین بھی کر دیا گیا ہے تنقید اور سوانح نگاری کے میدان میں امیر احمد علوی کے نام سے اردو ادب کا ہر طالب علم واقف ہے اردو مثنویات کی تاریخ و تنقید پر اوّل اوّل ان ہی نے قلم اٹھایا ہے، یادگار انیس تو ان کی ایسی تصنیف ہے جس سے میر انیس کا کوئی سوانح نگار یا نقاد بے نیاز نہیں گذر سکتا۔

شعبہ تحقیق میں بھی اہل کاکوری کے بعض اضافے بہت اہم ہیں امیر نذر علی درد کاکوروی نے نگار دسمبر ۱۹۲۵ء کے شمارے میں حضرت امیر خسرو کے ایک معاصر اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالہ معرفت کا سراغ دے کر اہل نظر کی

---

[1] سخنورانِ کاکوری ص ۱۱ مرتبہ نثار احمد علوی (پاکستان)

توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ اردو نثر کی پہلی تصنیف یہی رسالہ ہے اور اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اردو نظم و نثر کا زمانہ ایک ہی قرار پاتا ہے اور اردو نثر کی تاریخ بھی کوئی سات سو سال پرانی ہو جاتی ہے۔" [۱]

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں بھی فرزندان کاکوری نے بڑی نمایاں خدمات انجام دی ہیں، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں، لمبی لمبی سزائیں کاٹی ہیں اور مادر وطن کی آزادی کیلئے اپنی جانیں قربان کی ہیں، کاکوری ڈکیتی کیس آزادی کی تاریخ میں ایک زریں باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ منشی رسول بخش جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مجاہدین میں سے تھے ان کو اور ان کے بیٹے حافظ عبد الصمد کو تختۂ دار پر چڑھا دیا گیا مفتی عنایت احمد کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ مولانا ظفر الملک علوی کو کئی بار جیل کی سلاخوں کے پیچھے اپنے شب و روز گذارنے پڑے۔

کاکوری کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی نگارشات اور تخلیقات سے غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے ہر شعبے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں منشی فیض بخش مستند اور معتبر مورخ کی حیثیت سے نمودار ہوئے تاریخ فرح بخش اور چشمہ فیض ان کی یادگار کتابیں ہیں۔ تاریخ فرح بخش اودھ کی مستند تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے اس کتاب کا انگریزی میں ولیم ہوئی WILLIAM HOEY نے ترجمہ کیا ہے، اصل کتاب فارسی میں ہے، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی تاریخ فرح بخش کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

> "محمد فیض بخش مصنف فرح بخش فارسی نسخہ جو مصنف کا ذاتی نسخہ ہے لٹن لائبریری علی گڈھ میں محفوظ ہے اس کا انگریزی ترجمہ ولیم ہوئی نے کیا ہے مصنف نے برہان الملک کو دیکھا تھا اور ان سے شاہ جہاں آباد میں اکثر ملاقات کی تھی، بعد میں فیض آباد رہے"۔ [۲]

۱۔ سخنوران کاکوری ص ۱۳ از شاد احمد علوی

۲۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۱۹

کاکوری نے ایک اور اہم مورخ کو جنم دیا ہے ان کا نام ہے عظمت علی نامی کاکوروی جنھوں نے اودھ کی تاریخ مرتب کی، انھوں نے مرقع خسروی کے نام سے اودھ کی تاریخ لکھی ہے، مرقع خسروی شاہان اودھ کی معاصر تاریخوں میں بہت اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اس کے حوالے برابر بعد کی تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں اس کتاب میں کافی مواد ایسا ہے جو اور کہیں دستیاب نہیں، خصوصاً واجد علی شاہ اور ان کے بعد کے بیشتر حالات جو نامی کے بہت حد تک چشم دید ہیں اردو کی سب سے قدیم غزل شیخ کمال الدین سعدی کاکوروی کے نام سے منسوب ہے اردو کے بیشتر تذکروں میں سعدی کا ذکر ملتا ہے مگر یہ بات ابھی پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچ سکی ہے کہ سعدی سے منسوب غزل ان ہی کی ہے یا کسی اور شاعر کی ہے۔

اردو کے داستانی ادب میں جعفر علی شیونؔ کی "طلسم حیرت" خاصی شہرت کی حامل ہے، طلسم حیرت فخر الدین سخن دہلوی کی سروش سخن کے جواب میں لکھی گئی تھی، اس کی مقبولیت کے شیدائی لوگ ہیں جادو داں عطائی، طلسم حیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو کی نثری داستانیں میں پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں:-

"سچ یہ کتاب انداز بیان کا ایک ایسا طلسم ہے کہ جو پڑھنے والا اگر اس میں پھنس جائے تو نکلنا محال ہو جائے" [1]

پروفیسر گیان چند جین طلسم حیرت پر اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:-

"طلسم حیرت میراتن اور سرور کے معرکہ کی آخری کڑی ہے اس کی تحریک سروش سخن کے دیباچہ سے ہوئی، یہ اس کے جواب میں ہے، طلسم حیرت فسانۂ عجائب کے طرز پر لکھی گئی ہے لیکن اس کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ یہ کتاب تمام و کمال ضلع جگت ہے

---

[1] اردو کی نثری داستانیں، بحوالہ شفیع الزماں کاکوروی۔

ضلع جگت کے ایسے ایسے لطیفے اس کتاب میں ہیں کہ شیفتہ کی طبیعت کی رسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔" لہ

قاضی عابد علی خاں فریاد کاکوروی کی فسانۂ اعجاز بھی اردو کے داستانی ادب میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب فسانۂ عجائب کی تقلید میں لکھی گئی پہلی کتاب ہے، عابد علی خاں فریاد انشا پردازی میں غالب کے شاگرد تھے ان کے نام پنج آہنگ میں ایک رقعہ موجود ہے۔ اردو میں نواب سید محمد رند کے شاگرد تھے ایک تاریخ قصبہ کاکوری کی "صبح وطن" کے نام سے لکھنا شروع کی تھی، عمر نے وفا نہ کی اور یہ مکمل نہ ہو سکی، مسودہ کتب خانہ انوریہ کاکوری میں موجود ہے۔

کاکوری کے کسی تذکرہ نگار نے فریاد کی "فسانۂ اعجاز" کا ذکر نہیں کیا ہے اس کتاب کا قلمی نسخہ (۱۸۶۰ء) ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی میں موجود تھا جس کا سراغ پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے لگایا۔ پروفیسر ہاشمی نے اس پر مبسوط مقدمہ لکھ کر (۱۹۸۸ء) میں اردو اکاڈمی کے مالی اشتراک سے شائع کیا ہے فسانۂ اعجاز کی پوری داستان مافوق الفطرت عناصر سے بھری پڑی ہے۔ فسانۂ اعجاز کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں:-

"یہ داستان مسمّیٰ بہ "فسانۂ اعجاز" اگرچہ فسانۂ عجائب کے مرتبے کی ہرگز نہیں ہے، پھر بھی عہد محمد علی شاہ میں لکھی گئی ہے اس لئے اہمیت رکھتی ہے کیونکہ نصیرالدین حیدر (۱۸۲۷-۳۷ء) اور محمد علی شاہ (۱۸۳۷-۴۲ء) کے زمانے میں رجب علی بیگ سرور اور فقیر محمد خاں گویا کے علاوہ کسی اور دوسرے ادیب کی تحریریں ہمیں نہیں ملتی ہیں اس کے علاوہ فسانۂ عجائب کی تقلید میں لکھی گئی یہ پہلی تصنیف ہے اس لئے بھی قابل توجہ ہے۔" ۲ے

لہ شمالی ہند کی نثری داستانیں بحوالہ سخنوران کاکوری ۲ے فسانۂ اعجاز ص۱۶ از عابد علی خاں فریاد مرتبہ ہاشمی

ادیب سحر طراز ڈپٹی امیر احمد علوی کی معروف مرثیہ گو شاعر میر انیس پر لکھی گئی کتاب "یادگار انیس" بڑی اہمیت کی حامل ہے اس کے علاوہ ان کی دیگر چند کتابیں لائق صد تحسین ہیں، جن میں مثنویات، طرۂ امیر، تذکرۂ رند، بہادر شاہ ظفر اور بہارستان نراب شامل ہیں، امیر احمد علوی کے صاحبزادے مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی کی دو کتابیں اردو کے ہندو ادیب اور حالی کا نظریۂ شاعری قابل ذکر ہیں، ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی "اصنام خیالی" کے نام سے شائع ہوا۔

زرد کاکوروی کا عہد بڑا روشن اور تابناک تھا، کاکوری میں ان کے معاصرین میں جو علماء ادباء اور شعراء بہت نمایاں تھے اور جن کے علمی، ادبی اور شعری کارنامے روز روشن کی طرح عیاں ہیں، اس باب میں ان کا ذکر نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی بیسویں صدی میں کاکوری کی جو قد آور شخصیات علمی اور ادبی سرمایہ میں اضافہ کرنے میں مصروف کار نظر آتی ہیں ان میں نادر علی خاں نادر کاکوروی، مدیر اودھ پنچ منشی سجاد حسین، ارتضیٰ علی علوی شرر کاکوروی، نور الدین کیفی، فخر الدین سفیر محمد عالم قیصری، مولانا شاہ حبیب حیدر قلندر، معراج الدین خسرو، مولانا شاہ تقی حیدر قلندر، نور الحسن نیر، حیدر علی نشتر، اعجاز حسین علوی اعجاز کاکوروی مولانا ظفر الملک علوی، مولانا شاہ علی حیدر قلندر، ڈپٹی امیر احمد علوی، محمد عاصم قیس، مولانا عبدالشکور فاروقی، مشیر احمد علوی، ناظر کاکوروی، غلام احمد فرقت کاکوروی، مولوی بشیر محمد سلمانی، مولانا مصطفےٰ حسن علوی فرہاد اور مرزا اسکندر بیگ قدر کاکوروی کے نام بڑی اہمیت رکھتے ہیں، یہاں ان کے کارناموں کا مختصر جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

۱۔ نادر علی خاں نادرؔ کاکوروی (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۲)

نادر علی خاں عباسی نادرؔ بحیثیت نظم نگار بڑی شہرت رکھتے ہیں ان کا کلام اس زمانے کے مشہور اور معتبر رسائل مثلاً اودھ پنچ، زمانہ، خدنگ نظر، دل گداز مخزن اور الناظر وغیرہ میں شائع ہوتا تھا، ان کا مجموعۂ کلام جذبات نادر کے نام سے دو حصوں میں ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا، اس پر مقدمہ مولانا عبدالحلیم شررؔ نے لکھا، پاکستان کے مشہور محقق جناب ممتاز حسین نے جذبات نادر کے دونوں حصوں کو ترتیب و تہذیب کے ساتھ ۱۹۷۱ء میں اردو اکیڈمی سندھ سے شائع کیا۔ نادر نے مغربی شاعری کا عمیق مطالعہ کیا اور انگریزی نظموں کو اردو کا پیراہن عطا کر کے اردو کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ حالیؔ اور آزادؔ نے جس شاعری کو نیچرل شاعری کا نام دیا تھا، نادرؔ نے اس میں فطری جذبات اور دلکش طرز اظہار کا اضافہ کیا۔ نادرؔ نے حالیؔ اور آزادؔ کی جدید نظم نگاری کی تحریک کو بڑی تقویت بخشی۔ وہ خود بھی اردو شاعری کی فرسودہ روش سے بیزار تھے اور اس روش سے ہٹ کر وہ الگ راہ پر گامزن ہوئے۔ نادرؔ کی شاعری اور فنکاری کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا عبدالحلیم شررؔ رقم طراز ہیں :-

"حضرت نادرؔ نے اردو کی ایک نئے میدان میں رہبری کی ہے اور ایک بہت وسیع حد تک کامیاب ہوئے ہیں لہٰذا قدر دانان ادب اردو کو ان کا شکرگذار ہونا چاہیئے، حضرت نادرؔ نے کوشش کی ہے کہ انگریزی شاعری کے لطیف مذاق کو اردو میں پیدا کریں۔ چنانچہ اس مجموعہ میں اکثر تو انگریزی کی مشہور نظموں کے ترجمے ہیں اور بہت سی نظمیں جو شاعر کے اصلی خیالات و جذبات کو ظاہر کر رہی ہیں وہ بھی اس قدر انگریزی شاعری کے رنگ میں ڈوبی ہیں کہ ان پر بھی ترجمے ہی کا دھوکا ہوتا ہے۔"[۱]

---

[۱] جذبات نادر ص حصہ دوم طبع اول ۱۹۱۰ء

نادر کاکوردی نے انگریزی نظموں کے بڑے صاف، دلکش اور اثر انگیز منظوم ترجمے کئے ہیں، ان کے ترجموں میں شاعر کا دل، مرحومہ کی یاد میں، اور گذرے ہوئے زمانے کی یاد، بہت مشہور ہیں، اردو اکیڈمی نے ڈاکٹر شفیق کاکوردی سے انتخاب کرا کے "انتخاب کلام نادر" شائع کی ہے۔

۲۔ منشی سجاد حسین (۱۸۵۶ - ۱۹۱۵ء)

منشی سجاد حسین کو اردو میں دو حیثیتیں حاصل ہیں وہ طنز و مزاح نگار ہونے کے ساتھ ہی ایک کامیاب صحافی بھی ہیں، انھوں نے اودھ پنچ کے نام سے ایک مزاحیہ اخبار جاری کیا جو اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد اخبار تھا، منشی سجاد حسین نے تمام عمر تصنیف و تالیف اور اخبار نویسی کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا، اخبار ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، ایک زمانہ ایسا آیا کہ انھیں اخبار بند کرنے پر مجبور ہونا پڑا، وہ اودھ پنچ کی زندگی اپنی زندگی سمجھتے تھے، منشی بالمکند گپتا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"اخبار اس لئے نکالتا ہوں کہ جیتے جی مر نہیں سکتا ورنہ اس عارضہ کے ہاتھوں سے

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اودھ پنچ زندہ اخباروں میں نہیں کہ اس کا ذکر ہو ہاں گذشتہ زمانے میں کچھ تھا" [۱]

منشی سجاد حسین مشرق کے دلدادہ اور مغربی تہذیب سے بیحد بیزار تھے اپنے اخبار میں سرسید کی پالیسی اور علی گڈھ تحریک کی مخالفت کرتے رہے اس وقت کے بیشتر معتبر ادیب اور شاعر ان کے ہمنوا تھے جن میں اکبر الہ آبادی، تربھون ناتھ ہجر، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی کسمنڈوی، محمد شفیع مہر

---

[۱] سخنورانِ کاکوری ص ۱۹۱ از نثار احمد علوی

رتن ناتھ سرشار، ظریف لکھنوی اور نادر کاکوروی قابل ذکر ہیں۔

اودھ پنچ کے صفحات پر بکھری ہوئی تحریروں اور نظموں کے علاوہ جو فرضی ناموں سے لکھی گئی ہیں انھوں نے سات ناول بطور یادگار چھوڑے ہیں، ان میں سے ایک تو طلسمی فانوس ہے جو انگریزی ناول کا ترجمہ ہے، باقی چھ ناول حاجی بغلول، طرحدار لونڈی احمق الذی، کایا پلٹ، میٹھی چھری اور پیاری دنیا طبع زاد ہیں۔

۳۔ ارتضیٰ علی شرر (۱۸۶۴ء - ۱۹۲۱)

ارتضیٰ علی شرر کاکوروی نے نظم و نثر دونوں میدانوں میں اپنے اشہب قلم کو جولان کیا ہے انھیں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے پر مکمل قدرت تھی، شروع میں دو چار غزلیں امیر مینائی اور جلال لکھنوی کو بغرض اصلاح دکھانے کے بعد باقاعدہ مرزا نواب داغ دہلوی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے انھوں نے نظم اور غزل کے ساتھ ہی مثنوی اور تاریخ گوئی میں بھی قابل قدر خدمت انجام دی ہے، شرر نے کثیر تعداد میں قطعات تاریخ بھی کہے ہیں، ان کا کلام اودھ پنچ، آزاد، مہذب اور دیگر رسائل میں شائع ہوتا تھا وہ نادر کاکوروی کے بعد دوسرے شاعر تھے جنھوں نے انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کئے، تذکرۂ مشاہیر کاکوری اور سخنوران کاکوری میں ان کی درج ذیل کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔

مضامین ایڈیسن (ترتیب و ترجمہ) ارمغان اودھ (تالیف) ارمغان احباب (تصنیف) شہید جفا، تصویر عبرت (نظم) دو پھول (نظم) صبح وصل (نظم) ہفت گلبن (نظم) مذکورہ دونوں تذکروں کے مولفوں کو غالباً شرر کی تصنیف "یادگار شرر" کا علم نہیں ہو سکا۔ یہ ان کی شاعری کا مجموعہ ہے جو ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا ہے، "یادگار شرر" کی ایک جلد جناب معین احمد سکریٹری اخوان الصفا لائبریری نے مجھے فراہم کی ہے جو میرے پاس محفوظ ہے۔

۴۔ نورالدین کیفی

(۱۸۵۳ - ۱۹۲۸ء)

نورالدین کیفی نے نثر و نظم دونوں میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں وہ اردو اور فارسی زبان میں مہارت تامہ رکھتے تھے، فارسی میں اپنے کلام پر وہ آغا صادق حسین دصفی اور اردو میں کاکوری کے ہی ایک کہنہ مشق شاعر محمد رضا صبر اور ان کے شاگرد رشید منشی مقصود علی نطق سے اصلاح لیتے تھے انھوں نے تاریخ گوئی پر خصوصی توجہ دی اور بڑی تعداد میں قطعات تاریخ سپرد قلم کئے ہیں، ان کے شاعری کے سلسلے میں شاہ علی حیدر قلندر رقم طراز ہیں :۔

"لطف زبان اور طرز بیان اور خوبی بندش اور علو مضامین اور جدت پسندی و سحر آفرینی میں ان کا کلام اساتذہ کے کلام کا ہم پلہ ہے :" [۱]

کیفی نے بڑی تعداد میں شعر کہے، دو ضخیم دیوان یادگار چھوڑے اور تین رسالے نظم کے طبع ہو چکے ہیں، جن میں سے ایک نظم میلاد شریف ہے جو اپنی خوبیوں میں بے نظیر ہے، دوسرا رسالہ "فغان محرم" جو سلام اور مراثی پر مشتمل ہے۔

کیفی صاحب شاعر ہونے کے ساتھ کامیاب نثر نگار بھی تھے، نثر میں ان کا قابل ذکر کارنامہ ایک طویل داستان "طلسم نورنگار" ہے یہ بوستان خیال کے طرز پر لکھی گئی ہے، یہ کتاب ۲۴ - ۲۵ جلدوں میں تیار ہوئی تھی کہ ان کا پیمانۂ حیات چھلک گیا کیفی کی مذکورہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر امیر حسن نورانی اور ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے :۔

"اردو کی غیر مطبوعہ نثری داستانوں میں غالباً "نورنگار" سے بڑھ کر کوئی داستان نہیں ہے اور مصنف (کیفی کاکوروی) کا یہ بڑا کارنامہ ہے اس کی ۱۹ جلدیں ہیں اور چند جلدیں دو دو حصوں میں

---

[۱] تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۶۳ء

اس لئے کل داستان ۴۲ حصّوں میں ہے، ہر حصّہ بڑے سائز کے کم سے کم پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور بعض حصّے ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، یہ داستان یوں تو امیر حمزہ کے طرز پر لکھی گئی ہے لیکن اس میں ایسی خصوصیات ہیں جو اور کسی داستان میں نہیں، اس میں علمی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی مضامین کو مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے، غیر ضروری عبارت آرائی بالکل نہیں ہے زبان عام فہم ہے، کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک نرالی داستان ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ عام معلومات کی انسائیکلوپیڈیا بھی ہے۔" ؎۱

کیفی کی شخصیت اور ان کا غیر مطبوعہ کلام نیز داستان لوزنگار اس بات کی متقاضی ہے کہ ان پر تحقیقی کام کیا جائے اور ان کے کلام کی تدوین کر کے اسے منظر عام پر لاکر ادبی دنیا سے ان کی شاعری اور نثر نگاری کو روشناس کرایا جائے۔

۵۔ فخر الدین سفیر (۱۸۷۶ء - ۱۹۳۰ء)

فخر الدین سفیر نے نادر کاکوروی اور سرور کاکوروی کی انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، شعر و ادب سے انھیں بڑا گہرا لگاؤ تھا ان کے مضامین اور اشعار اس عہد کے بلند پایہ اور معتبر رسائل و جرائد زمانہ کانپور، دلگیر آگرہ، مخزن لاہور، صلائے عام دہلی اور الناظر لکھنؤ میں شائع ہوتے رہتے تھے، انھوں نے اپنا مجموعہ کلام ترتیب دیا تھا اور اس پر سر شیخ عبد القادر نے مقدمہ لکھا تھا لیکن حالات ایسے پیدا ہوئے کہ یہ اشاعت سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

؎۱ شمالی ہند کی نثری داستانیں از گیان چند جین
بحوالہ سخنوران کاکوری ص ۱۸-۱۹

سفیرؔ نے بڑی خوبصورت اور دلآویز نظمیں کہی ہیں، ان کی نظموں میں نغمۂ جگیر گنہ گار محبت، ماہی گیر، الماس کے پھول، لسٹرن، تالاب حسین ساگر، حیدرآباد دکن، دولت حسن، بیراگی، جہان گریزاں، اور حکایات دلی بڑی کامیاب اور مشہور ہیں، انھوں نے اپنی نظموں کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی پوری کوشش کی ہے روزمرہ کے واقعات، حادثات، مناظر فطرت اور دوسری کیفیات کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا اور ساتھ ہی غزل کے حسن و خوبی کا دامن نہ چھوڑا، ان کی متعدّد نظموں میں تغزل کی کارفرمائی ہے۔

سفیرؔ نے انگریزی شاعری کے منظوم ترجمے کیے ہیں، وہ انگریزی شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو سے بیحد متاثر تھے، ان کی بہت سی نظموں میں نئے ارتباط، ہندو مسلم اتحاد اور اسلامی ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے، غالباً اسی وجہ سے سفیرؔ نے ان کی ان کی مختلف نظموں کو اردو کا پیراہن عطا کیا ہے جو درّ ثمین کے نام سے شائع ہوا ہے، مسز سروجنی نائیڈو نے سورۂ اخلاص سے متاثر ہوکر ایک نظم کہی تھی اس کا ترجمہ انھوں نے "اسمائے حسنہ" کے عنوان سے کیا اور ان کے تاثرات کو اردو حلقوں سے روشناس کرایا۔

۶۔ محمد عالم قیصری (۱۸۹۴ء - ۱۹۳۱)

محمد عالم قیصری قابل قدر شاعر اور نثّار تھے فارسی اور اردو میں بڑی اچھی استعداد رکھتے تھے، دونوں زبانوں میں شاعری کے موتی بکھیرے ہیں، علم تصوّف سے ان کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا، مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور تاریخ گوئی پر تو انھیں بڑی قدرت حاصل تھی، سیکڑوں کی تعداد میں قطعات تاریخ موجود ہیں، تکیہ شریف کاظمیہ کی بیشتر کتابوں میں ان کی تاریخ اشاعت کے قطعات قیصری کے فکر کا نتیجہ ہیں۔ تصوّف پر ان کی کئی کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

ملفوظات منشی دہاج الدین مرتب کیے تھے، فتوح الغیب کا ترجمہ رموز الغیب کے نام سے کیا، ان کی تقریباً پندرہ کتابیں مطبوعہ اور کچھ مضامین غیر مطبوعہ کتب خانہ انوریہ کاکوری میں محفوظ ہیں، ڈاکٹر مسعود انور علوی نے تنیصری کا دیوان اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ "رشحات قیصری" کے نام سے ۱۹۸۶ء میں شائع کر دیا ہے۔

۷۔ شاہ حبیب حیدر قلندر (۱۹۳۵-۱۸۸۲ء)

حضرت شاہ حبیب حیدر قلندر ایک عالم باعمل اور عارف کامل تھے، آپ نے ادب، حدیث اور فقہ کی بڑی خدمت انجام دی، آپ نہایت خلیق، ذہین اور محسن تھے جو ایک بار ملاقات کر لیتا آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا، آپ کے عہد سجادگی میں خانقاہ کاظمیہ کی خوب ترقی ہوئی، ہندوستان کے گوشے گوشے سے لوگ حاضر ہو کر فیض حاصل کرتے تھے، آپ نے کتب خانہ انوریہ پر خاص توجہ دی، اس میں نادر و نایاب مسودات، مخطوطات اور کتابیں یکجا کی ہیں جو دوسری جگہ دستیاب نہیں ہیں بعض خصوصیات کے لحاظ سے کتب خانہ انوریہ کاکوری ہندوستان کا منفرد اور ممتاز کتب خانہ ہے۔

شاہ حبیب حیدر اپنے زمانے کے انشاپرداز بھی تھے، آپ نے سادہ اور سلیس عبارت کے علاوہ مسجع اور مقفی عبارت بھی بڑے خوبصورت انداز سے لکھی ہے تصنیف و تالیف آپ کا محبوب مشغلہ تھا، آپ کی درج ذیل کتابیں ہیں۔

الکلمۃ الباقیہ (عربی) تنویر الہیاکل (عربی) اشرف المبین فی ذکر معراج سید المرسلین (اردو) شجرات المشائخ (اردو) تسکین الفواد بذکر عید میلاد (اردو) انشائے حیدری (مکتوبات فارسی) فیوض مسعودیہ، نور لاریب ترجمۂ فتوح الغیب، مفاوضات (مکاتب حضرت شاہ محمد کاظم اور شاہ تراب علی قلندر)

۸۔ معراج الدین خسروؔ (۱۹۳۵ - ۱۸۸۳ء)

نواب حسین نواز جنگ معراج الدین خسروؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی ان کے والد خان بہادر منشی تاج الدین جذبؔ خود بہترین شاعر تھے، ان کا شعری مجموعہ "جذباتِ جذب" کے نام سے شائع ہوا ہے، خسروؔ بڑے خوش مزاج اور خوش اخلاق انسان تھے ایک مدت تک ریاست۔ حیدر آباد دکن میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہے اور نظام دکن میر عثمان علی خان کی طرف سے نواب حسین نواز جنگ خطاب عطا ہوا، شعر و سخن سے موروثی ذوق اور موسیقی سے ان کو بہت عشق تھا، اپنے اشعار میں عشق و محبت کی واردات و کیفیات کا بیان بڑے خوبصورت انداز میں کرتے تھے جلیل حسن جلیلؔ شاگرد امیر مینائی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا انھوں نے غزلوں کے ساتھ سیکڑوں سلام، مرثیے اور قطعات تاریخ بھی کہے ہیں۔

ان کا اردو اور فارسی کلام جو کتب خانہ النوریہ میں موجود تھا اس کا ایک جامع انتخاب تیار کر کے ڈاکٹر مسعود انور علوی نے ۱۹۸۲ء میں "انتخاب کلام خسرو" کے نام سے اپنے سیر حاصل مقدمے اور تبصرے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۹۔ شاہ تقی حیدر قلندر (۱۹۳۹ - ۱۸۹۰ء)

مولانا شاہ تقی حیدر قلندر عالم، فاضل اور صوفی ہی نہیں بہترین انشا پرداز بھی تھے، فقہ، حدیث، تفسیر، تصوف، منطق، کلام وغیرہ علوم کی تحصیل کے ساتھ ہی اردو، عربی اور فارسی میں بڑی مہارت تھی، ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور وہ نثر نگاری کے رموز و نکات سے بخوبی واقف تھے، انھوں نے دوران تعلیم ہی تصنیف و تالیف کا آغاز کر دیا تھا انھوں نے عربی اور فارسی کی کتابوں کے اردو ترجمے کر کے اردو داں طبقے پر بڑا احسان کیا ہے، آپ کی مندرجہ ذیل کتابیں ہیں جو مقبول خاص و عام ہیں جن میں اکثر تصوف، فلسفہ اور اس کے رموز و نکات کو

بڑی آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

انسان کامل، الکہف الرقیم، مناظر الشہود فی مراتب الوجود، ہدیۃ الاشرف فاتح الابصار، کشف الدقائق عن رموز الحقائق، الدر الیتیم، زواہر الافکار شرح جواہر الاسرار، اقوال المختار، قول المختار، تنویر الافق، واقعات رشیدی تحفہ نظامیہ، تنویر الظلمات، انشائے نظامی، فیوض العارفین، جواہر المعارف تعلیمات فلسفیہ، اذکار الابرار، نفحات العنبریہ مجموعہ ہفت رسائل۔

۱۰۔ حیدر علی نشتر (۱۹۰۶ - ۱۹۳۹ء)

شیخ حیدر حسن عباسی نشتر کاکوروی بیک وقت ادیب بھی تھے اور شاعر بھی ان کی اردو اور فارسی غزلیات و منظومات ان کی ذہانت اور طبع رسا کی آئینہ دار ہیں نثر میں انھوں نے انگریزی ناول THE GIRL WHO WAS TOO GOOD LOOKING کا ترجمہ "اعجاز حسن" کے نام سے کیا ہے اس کے علاوہ ایک ناول "سیاہ پوش" بھی لکھا۔ انھوں نے درج ذیل ڈرامے بھی لکھے جو اردو کے ڈرامائی ادب میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

پریمی کسان، زراعت الدولہ، خواب پریشاں، عشق کا کرشمہ، ایثار، ہستی کا خمار جنگل کی شہزادی ان کی تصانیف ہیں، ڈرامہ پریمی کسان طبع ہوا تھا اور کوئی کتاب طبع نہ ہو سکی، جامعہ عثمانیہ میں پریمی کسان ۱۹۳۵ء کی نمائش میں ایکٹ کیا گیا تھا اور حکومت نظام کی جانب سے اس پر انعام بھی ملا تھا۔

۱۱۔ اعجاز حسین علوی اعجاز کاکوروی (۱۸۷۸ - ۱۹۴۰ء)

منشی اعجاز حسین علوی اعجاز کاکوروی نہایت ذہین اور خوش فکر شاعر تھے، صغر سنی سے ہی شعر گوئی کی طرف طبیعت مائل تھی، قدرت نے طبیعت میں غضب کا

موزونیت اور زود گوئی عطا کی تھی، ایک ایک نشست میں پچاس پچاس شعر آسانی کہہ لیتے تھے، انھوں نے اپنے کلام پر محسن کاکوروی سے اصلاح لی اور ان کے انتقال کے بعد علامہ نیر کاکوروی سے مشورہ کرتے رہے لکھنؤ کے مشہور مزاحیہ اخبار اودھ پنچ کیلئے ساقی نامے لکھتے رہے، ہجوگوئی سے بڑا ذوق تھا اور طبیعت ظرافت کی طرف مائل تھی، مسدس حالی کے جواب میں مسدس خالی لکھا تھا جو اودھ پنچ ۳۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء میں موجود ہے۔

اعجاز صاحب نے اپنے وطن قصبہ کاکوری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے "یاد وطن" کے نام سے ۱۹۲۸ء میں ایک مثنوی نیر پریس سے چھپوا کر شائع کی تھی اس میں انھوں نے قصبہ کا تابناک ماضی کا ذکر کرتے ہوئے کاکوری کی قد آور شخصیتوں کو یاد کیا ہے، شاعری کے میدان میں بڑے کامیاب و کامران تھے، ایک مسلسل نظم "جہان افروز" کے نام سے شائع کی تھی جس میں نعت، نظم اور قطعات شامل ہیں۔

۱۲۔ ظفرالملک علوی (۱۹۴۶ - ۱۸۸۴ء)

مولانا ظفرالملک کا اصل نام اسحاق علی علوی تھا لیکن ان کو ادبی اور سیاسی حلقوں میں ظفرالملک کے نام سے شہرت حاصل ہوئی، ان کو ماہ نامہ الناظر نے بڑی مقبولیت عطا کی، انھوں نے الناظر کے مدیر کی حیثیت سے ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں خود کو روشناس کرایا، انھوں نے الناظر کے ساتھ بک ایجنسی بھی قائم کی، الناظر کی طباعت کیلئے الناظر پریس بھی قائم کیا، انھیں ابتدا ہی سے ملک کے ممتاز و مشاہیر قلمکاروں کا تعاون حاصل ہو گیا اور کوئی ایسی ادبی شخصیت نہیں تھی جس کا کلام یا مضامین الناظر کے صفحات پر نمایاں نہ ہوتے ہوں ظفرالملک نے کاکوری سے بھی اپنی نگرانی میں ایک ہفتہ روزہ اخبار "کاکوری اخبار" جاری کیا ۱۹۱۱ء سے اس کا ایڈیٹر

کلیم الدین علوی کو مقرر کیا۔ کچھ شماروں کی ادارت کی ذمہ داری خود بھی نبھائی۔
وہ ہندوستان کی مختلف سیاسی تحریکوں سے باقاعدہ وابستہ رہے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، تحریک خلافت اور ہندوستان چھوڑو تحریک میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، قصبہ کاکوری کے جن لوگوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لیا ان میں مولانا ظفر الملک علوی کا نام بیسویں صدی میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

۱۳۔ شاہ علی حیدر قلندر (۱۹۴۷ - ۱۸۹۳ء)

حضرت شاہ علی حیدر قلندر بڑے عبادت گذار اور صاحب شریعت و طریقت بزرگ تھے، آپ نہایت مخلص، مہمان نواز اور سخی تھے، وہ اپنے دور میں روشنی کا مینارہ تھے، جس سے اپنے بیگانے سب ہی فیضیاب ہوتے تھے ان کی عالمانہ اور فاضلانہ تصانیف ہمیشہ زندہ رہیں گی، انھوں نے تذکرۂ مشاہیر کاکوری لکھ کے نہ صرف سیکڑوں علماء، صوفیا، ادبا، شعرا اور دیگر علوم و فنون میں قابل قدر کارنامے انجام دینے والوں کو گمنامی سے بچا لیا بلکہ اپنی کتاب میں ان کے حالات زندگی اور نمونہ کلام و تحریر کو بھی محفوظ کر کے ان کو حیات جاوداں بخش دی۔ بلاشبہ آپ نے وطن اور اہل وطن کی بڑی خدمت کی جس پر آئندہ نسلیں فخر کریں گی۔
شاہ علی حیدر قلندر نے جو دوسری کتابیں یادگار چھوڑی ہیں ان میں سیرت علی کرم اللہ وجہہ کئی ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے اس کے علاوہ حسب ذیل کتابیں بھی قابل ذکر ہیں۔
رسالہ در تشریح الجد، مصباح التعرف لارباب التصوف (اردو)، تفریح الاحباب (اردو) تذکرۂ حبیبی وغیرہ۔

۱۴۔ ڈپٹی امیر احمد علوی (۱۸۷۹ء - ۱۹۵۲ء)

ادیب سحر طراز ڈپٹی امیر احمد علوی علامہ محسن کاکوروی کے نواسے اور نور الحسن نیر مؤلف نور اللغات کے بھانجے تھے وہ نہایت کامیاب ادیب تھے ان کی تحریروں میں غضب کا جادو تھا۔ ڈپٹی امیر احمد علوی ایک نیک نفس علم و ادب کے شیدائی وطن کی محبت سے سرشار انسان تھے۔ اپنے مکان پر آئے دن شعری نشستیں منعقد کرتے تھے۔ وہ بیک وقت ادیب بھی تھے اور مورخ بھی، محقق بھی تھے اور ناقد بھی، انھوں نے پہلی بار لغتیہ شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور علامہ محسن کاکوروی کے قصائد کی شرح لکھی سرکاری مصروفیات اور ذمہ داریوں کے باوجود انھوں نے ادب، مذہب اور تاریخ کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔

انھوں نے کثیر تعداد میں ادبی، مذہبی، تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے۔ ساتھ ہی پندرہ سے زائد کتابیں بھی سپرد قلم کی ہیں۔ "یادگار انیس" تو ان کی وہ کتاب ہے جس سے میر انیس پر کام کرنے والے شروع سے استفادہ کرتے آئے ہیں۔ مثنویات میں انھوں نے مختلف شعراء کی مثنویوں پر تنقیدی نقطۂ نظر سے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ ان کی جو دوسری کتابیں ہیں ان میں طرۂ امیر، بہادر شاہ ظفر لطائف اشرفی، تذکرہ رند، بہارستان تراب، اردو شاعری اور تذکرہ ہند شاہان مالوہ، تاریخ اندور، گوتم بدھ، داستان زوال سفر سعادت اور مناسک حج شامل ہیں۔

۱۵۔ محمد عاصم قیس (۱۸۹۱ء - ۱۹۵۷ء)

مولوی محمد عاصم قیس کو اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر یکساں قدرت حاصل تھی! شعر گوئی کا فطری ذوق رکھتے تھے۔ ہر وقت کیف و مستی میں سرشار رہتے تھے اور ایک جذب کی سی کیفیت رہتی تھی۔ وہ اردو، فارسی اور عربی میں بڑی روانی کے

ساتھ شعر کہتے تھے۔ تاریخ گوئی میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ انھوں نے شاعری کی مختلف صنفوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ نعت و منقبت اور عاشقانہ غزلیں بڑی تعداد میں کہی ہیں ان کی غزلوں میں تصوّف کا غلبہ ہے۔

نفیس نے اپنے ماموں تاج الدین جذب کاکوروی کے اردو اور فارسی کلام کو ترتیب دے کر "جذبات جذب" کے نام سے شائع کیا۔ ان کی ایک کتاب ہے "تعلیمات اور مقام مولا علیؓ"، جو بہت مقبول ہوئی۔

نفیس کے کلام کو یکجا کر کے اپنے سیر حاصل مقدمے کے ساتھ ڈاکٹر مسعود الوز علوی نے سنہ ۱۹۹۱ء میں لیسلائے نفیس کے نام سے شائع کیا ہے۔

۱۶۔ مولانا محمد عبدالشکور فاروقی (۱۸۷۸ء - ۱۹۶۲ء)

امام اہلسنت مولانا محمد عبدالشکور فاروقی اپنے عہد کے علماء کی صف اوّل میں ممتاز مرتبہ اور مقام کے مالک تھے۔ علوم و معارف قرآنی کے آپ عارف کامل اور عالم و فاضل تھے۔ ان کی تحریروں میں علم اخلاص اور عقائد کی تعلیم ہے وہ تصوّف کو شریعت سے باہر سمجھنا بے دینی خیال کرتے تھے۔ مولانا نے اپنی ساری زندگی تحریر و تقریر، تصنیف و تالیف، بحث و مناظرہ کیلئے وقف کردی تھی۔

مولانا نے لکھنؤ سے ایک دینی ہفتہ وار "النجم" کا اجراء کیا جو کچھ عرصہ بعد سہ روزہ اور روزنامہ بھی ہوا۔ النجم کے مدیر وہ خود تھے۔ اس کا ہر مضمون ایک پوری کتاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ انھوں نے بڑی کثیر تعداد میں کتابوں کی تصنیف و تالیف کے فرائض انجام دئے ہیں ان کی چند ممتاز کتابوں کے نام یہ ہیں:-

ترجمہ قرآن مجید، کتاب الصلوٰۃ، اسد الغابہ (۹ جلدوں میں) علم الفقہ (۶ جلدوں میں) سیرت خلفائے راشدین، سیرت خیر البریہ، القول المحکم تحقیق آل و اہلبیت، ترجمہ تاریخ طبری، تفسیر آیات قرآنی، ترجمہ ازالۃ الخفا، سیرت الحبیب الشفیع، قاتلان حسین کی خانہ تلاشی۔

۱۷۔ مشیر احمد علوی ناظرؔ کاکوروی (۱۹۰۲ - ۱۹۶۹ء)

مشیر احمد علوی ناظرؔ کاکوروی بیک وقت ادیب، نقاد، شاعر اور افسانہ نگار تھے انھوں نے مختلف موضوعات پر سینکڑوں کی تعداد میں مضامین قلم بند کیے ان کے مضامین برابر "کاکوری اخبار" میں شائع ہوتے رہتے تھے، آل انڈیا ریڈیو کمپنی نئی دلی سے بھی ان کے متعدد مضامین نشر ہوئے ہیں۔ ایک عرصہ تک "اخبار حقیقت" لکھنؤ سے بھی وابستہ رہے۔ حکومت کی جانب سے نکلنے والے ہفتہ وار اخبار "ہماری آواز" کے ایڈیٹر بھی رہے جو دو سال تک جاری رہا۔ تصنیف و تالیف ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اردو کے ہندو ادیب، حالیؔ کا نظریۂ شاعری، تذکرۂ جمیل (شاعرات کا تذکرہ) اور اصنام خیالی (افسانوں کا مجموعہ) ان کے قلم کے شاہ کار ہیں، انھوں نے حضرت مولانا شاہ علی اکبر قلندر کی کتاب تصوف کا سلیس اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔ شوکت تھانوی مرحوم نے اپنی کتاب "شیش محل" میں ان کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے صدائے جوبلی علیگڈھ میں شائع دو نظمیں بطور پیش کی ہیں، اور لکھا ہے:-

> "وہ ایک اچھے ادیب، مہذب، صاف گو انسان تھے ان کے ظاہر و باطن میں تضاد نہیں تھا وہ منافق اور مصلحت پسند نہیں تھے اور بیک وقت ادیب، نقاد، شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ نجوم اور علم جفر میں بھی دلچسپی تھی اور اسے انھوں نے اپنے والد محترم سے سیکھا تھا۔ ناظرؔ ان کا تخلص تھا، عام طور پر شاعر نہیں تھے ان کا کلام میری نظر سے کہیں نہیں گذرا البتہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میگزین کی ادارت کے زمانے میں مادر علمی کی جوبلی کے موقع پر ایک مجلہ "صدائے جوبلی" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ جس میں ان کی دو نظمیں ملتی ہیں۔" [۱]

۱۔ بحوالہ سخنورانِ کاکوری ص ۳۵۸

۱۸۔ غلام احمد فرقت کاکوروی (۱۹۱۴ء - ۱۹۷۳ء)

اردو کے طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں غلام احمد فرقت کاکوروی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ انھوں نے نثر اور نظم دونوں کو اپنے مزاحیہ اور ظریفانہ مضامین اور شاعری کے ذریعے مالا مال کیا ہے فرقت باکمال شاعر اور صاحب طرز نثر نگار تھے وہ علامہ آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے صحافت میں بھی بڑی خدمت انجام دی۔ شروع میں اپنے ماموں انیس احمد عباسی کے اخبار حقیقت کے نائب مدیر رہے اس کے بعد دو سال تک انگریزی اخبار کریسنٹ سے وابستہ رہے اور ۱۹۳۸ء میں خود اپنا اخبار "صداقت" جاری کیا تھا۔

طنز و ظرافت نگاری بڑا مشکل فن ہے۔ ذراسی لغزش سے ظرافت رکاکت اور ابتذال کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ فرقت نہایت نکتہ فہم اور نکتہ سنج بھی تھے۔ انھیں متانت و ظرافت میں اعتدال و توازن برقرار رکھنے کا ہنر آتا تھا۔ فرقت نے تاحیات اردو طنز و مزاح کی خدمت کی، ن۔ م راشد کی کتاب ماورا کے جواب میں "ناروا" کے نام سے شعری مجموعہ طنز و مزاح شائع کیا۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور مایۂ ناز تصنیف "مداوا" بھی ہے جس میں ترقی پسند شاعروں کے کلام کے نمونے دے کر ان کے ہی رنگ میں اپنا کلام پیش کیا ہے "قد مچے" ان کی مزاحیہ اور ظریفانہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ ان کی ایک اور معرکۃ الآرا کتاب "اردو میں طنز و مزاح" ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ایک جلد نثری ادب پر اور دوسری شعری ادب پر، یہ طنز و مزاح کی مکمل تاریخ ہے ادب کا کوئی شائق جب تک ان کا مطالعہ نہ کرے وہ طنز و مزاح کو سمجھ نہیں سکتا، بلاشبہ وہ طنز و مزاح ندآور ادیب اور شاعر تھے فرقت کی حیات اور شاعری اور ان کی خدمات پر لکھنؤ یونیورسٹی میں اخلاق حسین عارف نے "فرقت کاکوروی حیات و کارنامے" کے عنوان سے ایم۔ اے کا مقالہ داخل کیا تھا جو کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے۔

۱۹۔ مولانا مصطفیٰ حسن علوی فریادؔ (۱۸۹۶ء - ۱۹۸۰)

مولانا مصطفیٰ حسن علوی فریادؔ برصغیر کے ممتاز عالم دین ہی نہیں ادیب، شاعر بھی تھے وہ مداح رسول علامہ محسنؔ کاکوروی کے پوتے اور مؤلف نور اللغات نور الحسن نیرؔ کاکوروی کے بھتیجے تھے اور انھیں سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ آپ شیخ الھند حضرت مولانا محمود الحسن کے شاگرد رشید تھے۔

شاعری کا ذوق فطری تھا، گھر گھر میں شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا انھوں نے بھی شعر گوئی پر توجہ کی اور تاجور نجیب آبادی اس کے محرک ہوئے آپ نے گراں قدر علمی اور دینی خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کو صدر جمہوریہ ہند نے ۱۵ اگست ۱۹۶۰ء کو یوم آزادی کے موقع پر ایوارڈ اور قیمتی خلعت دیا تھا۔

فریادؔ کاکوروی آخری عمر تک شعر کہتے رہے انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل اور نعت پر خاص توجہ کی ہے۔

ان کا کلام رسائل و جرائد میں شائع ہوتا تھا ان کی تالیفات میں دربار عالمگیر محتسب اسلام، فقیہ شام، فقیہ مصر، فائد بدر واحد، بہت مشہور ہیں۔

آپ نے ایک متنازعہ موضوع پر "تحدید نسل اور اسلام کا موقف" نام سے بھی کتاب لکھی ہے۔

۲۰۔ نور الحسن نیرؔ کاکوروی (۱۸۶۵ء - ۱۹۳۶ء)

مولوی نور الحسن نیرؔ کاکوروی، عظیم نعت گو شاعر علامہ محسنؔ کاکوروی کے چشم و چراغ تھے، نیرؔ صاحب نے علم و فن اور شعر و ادب کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ والد کے علاوہ چچا مولوی احسن بھی شاعری خصوصاً تاریخ گوئی پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ نیرؔ صاحب بیک وقت شاعر بھی تھے ادیب بھی صحافی بھی تھے اور لغت نگار بھی۔ اردو کی سب سے ضخیم، مستند اور معتبر لغت

"نوراللغات" ان کا لاثانی کارنامہ ہے۔ اس زمانہ میں جو کام بڑے بڑے ادارے انجام نہیں دے سکتے اسے تنہا شخص نے بے پناہ محنت و جانفشانی سے نہ صرف انجام دیا بلکہ تقریباً ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل "نوراللغات" کی طباعت کے لئے لکھنؤ میں نیتر پریس قائم کیا۔ نوراللغات کی پہلی جلد سنہ ۱۹۲۴ء، دوسری جلد سنہ ۱۹۲۷ء، تیسری جلد سنہ ۱۹۲۹ء اور چوتھی جلد سنہ ۱۹۳۲ء میں زیو طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن جنرل پبلشنگ ہاؤس کراچی پاکستان نے سنہ ۵۹-۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔

نیتر کاکوروی نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ حکومت نے ان کی غیر معمولی قانونی صلاحیتوں اور قابلیت کے اعتراف میں ان کو آنریری اسسٹنٹ کلکٹر کا عہدہ تفویض کیا جس پر وہ تقریباً دس بارہ سال فائز رہے۔ ہندوستانی اکادمی سے۔ الہ آباد کے ممبر نامزد ہوئے ان کو نہ صرف اردو بلکہ عربی فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انھوں نے جنوری سنہ ۱۹۲۱ء میں ادیب اردو کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا جس کا بنیادی مقصد لوگوں کو لغت سے متعارف کرانا تھا۔ رسالہ کے آخر میں لغت کے جستہ جستہ اوراق دیئے جاتے تھے اور باقی حصہ میں الفاظ و محاورات کی تحقیق و تصدیق کے سلسلہ میں مشاہیر نقادان فن اور ماہرین لسانیات سے رائیں طلب کی جاتی تھیں۔ ادیب اردو میں وہ خود بھی نقاد یا نشتر کے نام سے مضامین لکھتے تھے۔ ان کے متعدد مضامین اودھ پنچ میں بھی شائع ہوئے۔ نوراللغات میں الفاظ کے صحیح معانی و محل استعمال، محاورات و ضرب الامثال کے صحیح استعمال، صحیح تلفظ، املا اور تذکیر و تانیث پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور استاد و معتبر شعراء کے کلام سے مثالیں پیش کی گئیں ہیں۔

انھوں نے اپنے والد علامہ محسن کاکوروی کے منتشر نعتیہ کلام کو یکجا کر کے "کلیات نعت مولوی محمد محسن" کے نام سے شائع کیا جس کا عکسی ایڈیشن اتر پردیش اردو اکادمی نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ خورشید بدر، فارسی جدید، ڈائجسٹ آف اودھ کیس لا (انگریزی) اور تعلیلات منظوم ان کی قابل قدر تصانیف ہیں تعلیلات منظوم انھوں نے اپنے بیٹے طاہر حسن علوی کی تعلیم و تدریس کے لئے نظم کی تھی۔ عزیزالرحمن علیم صاحب نے اپنے ایم۔ اے کے مقالہ میں نیر صاحب کی حیات و خدمات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ یہ مقالہ "نیر کاکوروی حیات و خدمات" کے نام سے ۱۹۸۶ء میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔

۲۱۔ مولوی حافظ شیر محمد قادری

مولوی حافظ شیر محمد قادری کا تعلق پسماندہ طبقہ کی سلمانی برادری سے تھا ان کے والد حافظ حاجی رحیم بخش خالص علمی اور دینی مزاج کے آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں حافظ شیر محمد اور حافظ علی احمد کو حفظ قرآن کی سعادت حاصل کرنے کے مواقع فراہم کئے۔ مولوی حافظ شیر محمد قادری پیشہ کے لحاظ سے دستکار تھے۔ ان کی سلائی مشین کی مرمت اور پرزے فروخت کرنے کی دوکان نظیر آباد میں تھی اور مکان محلہ جھنجھری روضہ کاکوری میں تھا۔ ان کو علمی دینی اور اصلاحی کام کا بڑا شوق تھا۔ ان کی دو کتابیں، تاریخ عجیب اور مساوات اسلامیہ، منظرعام پر آچکی ہیں جن کی علمی اور دینی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ کاکوری کے کسی تذکرہ نگار نے ان کو قابل اعتنا نہ سمجھا بلکہ اس حد تک نظرانداز کیا کہ ان کے سالِ ولادت و وفات کا بھی کہیں سے علم نہ ہو سکا۔ اسی طرح قصبہ کے خوش فکر و زود گو شاعر شیخ منشی عبدالکریم سخن

کاکوروی کو بھی نظر انداز کیا گیا۔ ایک زمانہ میں پندرہ روزہ "کاکوری اخبار" میں نہ صرف ان کا کلام شائع ہوتا تھا بلکہ اخبار کے ٹائیٹل پر وطن کی محبت سے متعلق درج ذیل قطعہ مستقل شائع ہوتا تھا ؎

اک شعبۂ ایمان محبت ہے وطن کی — بے فیض ہے جس کو نہیں الفت ہے وطن کی
ہر قوم میں ہے جذبۂ ایثار اسی سے — گھربار فدا جس پہ وہ عزت ہے وطن کی

مولوی حافظ شیر محمد قادری کی پہلی کتاب "تاریخ عجیب" المعروف بہ "نسخۂ غریب" ہے۔ جو اسلام کے شیدائی، رسول پاکؐ کے سچے عاشق اور محبوب صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کی سوانح حیات پر مشتمل ہے اس میں انھوں نے حضرت سلمان فارسیؓ کی زندگی کے حالات و واقعات بڑے موثر اور مدلل طور سے سپرد قلم کئے ہیں۔ اس کتاب کی تیاری میں انھوں نے جامع الاصول، مشکوٰۃ شریف بخاری شریف، ترجمہ تاریخ طبری، اکمال فی اسماء الرجال، وفیات الاخیار، ترجمہ اسد الغابہ، روض الازہر اور انتصاح مسائل العشرت جیسی مستند اور معتبر کتابوں سے استفادہ کیا۔ "تاریخ عجیب" میں مولانا عبدالباری آسیؔ اور مولوی سید جعفر علی فاضلِ دیو بند کی تقریظیں شامل ہیں، یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں تیار اور ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ آخر میں منشی محمد یحییٰ زندہ لکھنوی کا درج ذیل قطعۂ تاریخ موجود ہے۔

تاریخ عجیب آمدہ خالی ز طمطراق — اے زندہ ماہ چاردہ چوں گشت بے محاق
۱۹۲۷ء — ۱۳۴۶ھ — ۵۸۲

چوں جد و جہد شیر محمد بسے نمود — نسخۂ غریب شد مرتب ز اتفاق
۱۹۲۸ء

ان کی دوسری کتاب "مساوات اسلامیہ" معروف بہ "انقلاب اسلامیہ" ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں میں پیدا ذات پات کی تفریق اور عدم مساوات

جیسی بیماریوں کو ختم کرنے کیلئے قرآن و حدیث اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں علاج تلاش کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ کل بنی آدم خواہ گورے ہوں یا کالے، امیر ہوں یا غریب، قوی ہوں یا ضعیف، شہری ہوں یا دیہاتی، شیخ ہوں یا سید، مغل ہوں یا پٹھان، پیشہ در ہوں یا دستکار، کوئی ہوں اسلام کی نظر میں سب برابر ہیں، دربار خداوندی میں طاقت یا اعلیٰ نسبی کوئی چیز کام نہیں آتی بلکہ وہاں فضیلت و فوقیت صرف ان لوگوں کو حاصل ہے جو متقی اور پرہیزگار ہیں۔

اس کتاب کی تعریف و توصیف میں خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی، افسر لکھنوی اور شفیق جونپوری وغیرہ کی منظومات اور مولانا قطب الدین عبدالوالی سجادہ نشین فرنگی محل لکھنؤ، سید محمد علی حسن سابق ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات ریاست بھوپال، مولانا مسعود عالم ندوی مدیر الضیا، مولانا محمد احمد زماں خاں مولانا ابوالقاسم محمد عتیق فرنگی محلی، مولانا شاہ عزالدین ندوی، مولانا سید محمد علی نقی صفی لکھنوی، اور مولانا بدرالدین چینی مدرس ندوۃ العلماء لکھنؤ کی آراء شامل ہیں۔ جن سے اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے یہ کتاب ۱۹۲۴ء میں منظر عام پر آئی۔ اب مذکورہ دونوں کتابیں تقریباً نایاب ہیں اس لئے ان کی دوبارہ اشاعت کی ضرورت ہے۔

۲۲۔ مرزا سکندر بیگ قدرؔ کاکوروی (۱۹۰۴ - ۱۹۸۵ء)

الحاج مرزا سکندر بیگ قدرؔ کاکوروی بیک وقت شاعر بھی تھے اور مصور بھی۔ شاعری میں نورالحسن نیرؔ کاکوروی (مولف نوراللغات) سے شرف تلمذ حاصل تھا اور مصوری میں ایڈورڈ مرسی سے ناگپور میں رہ کر استفادہ کیا۔ ان کی شاگردی میں فن مصوری کے وہ جوہر کھلے جنھوں نے ان کو مصورِ فطرت

بنادیا۔

قدر کاکوروی نے شاعری کی مختلف اصناف مثلاً حمد، نعت، قصیدہ، نظم غزل، مرثیہ، قطعات و رباعیات وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے بڑی تعداد میں سلام اور نوحے بھی قلم بند کئے ہیں۔ ان کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ہندی اور انگریزی کا بھی بخوبی علم تھا ان کا شعری مجموعہ 'بہار ادب'، ڈاکٹر مسعود انور علوی کے مبسوط مقدمے کے ساتھ ۱۹۸۷ء میں منظر عام پر آچکا ہے۔ جس پر اردو اکادمی نے انعام بھی دیا ہے۔ اندرا گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام پر مشتمل طویل نظم "بیس چاند" کی طباعت کے لئے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی نے مالی امداد منظور کی تھی۔ بعض وجوہ کی بنا پر یہ کتاب شائع نہ ہو سکی۔

شارب کوثر علوی نے اپنی کتاب 'تجلیات برق' میں کسی غلط فہمی کی بنیاد پر 'بہار ادب' کو ڈاکٹر مسعود انور علوی کی مرتب کردہ بتایا ہے۔ جبکہ قدر صاحب نے اپنی حیات میں 'بہار ادب' کا مسودہ میرے ساتھ اردو اکادمی میں خود جمع کیا تھا۔ روزنامہ عزائم (لکھنؤ) میں قدر صاحب کے انتقال کی جو خبر شائع ہوئی اس میں بھی 'بہار ادب' کے اردو اکادمی میں زیر غور ہونیکا ذکر ملتا ہے۔

قدر صاحب کی تصویروں کی نمائش ریاستی للت کلا اکادمی لال بارہ دری میں ۳ر اگست سے ۵ر اگست ۱۹۷۹ء تک لگی رہی تھی۔ اس نمائش کا افتتاح اس وقت کی ریاستی وزیر برائے سماجی بہبود محترمہ چندراوتی نے کیا تھا۔ مذکورہ نمائش کا دعوت نامہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

باب دوم

دردؔ کاکوروی کے حالاتِ زندگی اور شخصیت

خاندان ، نام و نسب ، ولادت ، ابتدائی ماحول ، تعلیم و تربیت ، عادات و اطوار ، شاعری کا آغاز ، تلمذ ، ملازمت ، شادی ، اولاد ، تلامذہ ، مختلف شہروں میں قیام ، وفات ۔

درد کاکوروی کا شجرۂ نسب

مورثِ اعلیٰ

قاری محمد صدیق

قاری امیر نصیر الدین

قاری حبیب نظام الدین

قاری امیر سیف الدین

قاری نظام الدین شیخ بھیکہ

حافظ شہاب الدین عرف شیخ سوندھن

ملا عبد الکریم — ملا عبد القادر

(ملا عبد الکریم کی اولاد:) محمد ماہ — ضیاء اللہ — عزیز اللہ

(ضیاء اللہ کی اولاد:)

شیخ سیف الدین

حافظ غلام محمد

حافظ عبد الرحمٰن

محب الرحمٰن

محمد بقا
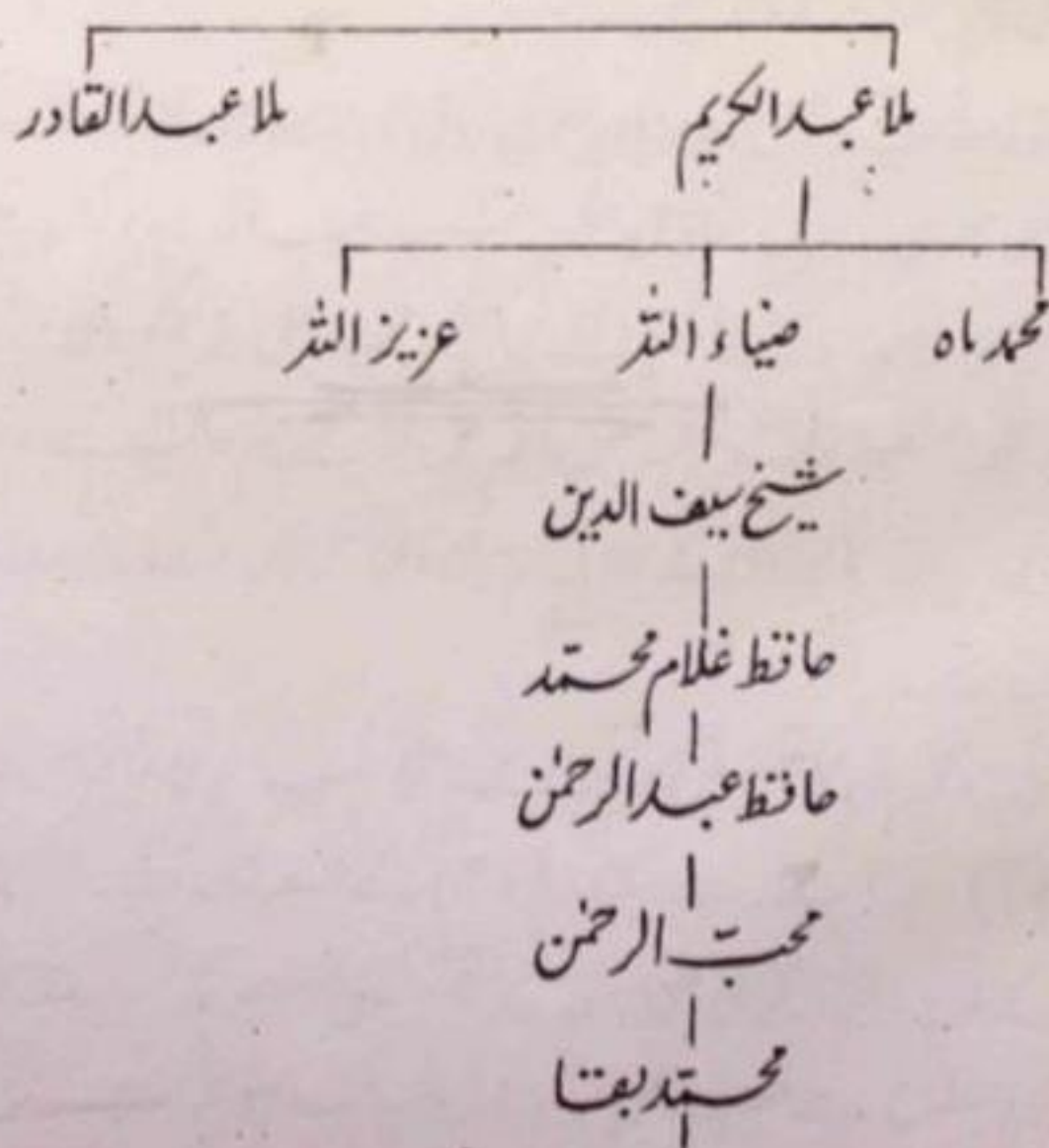
محبوب عالم

عاشق علی

مشتاق علی

محب علی نیرؔ　طالب علی　حبیب علی　زوجۂ انعام اللہ

(محب علی نیرؔ) مقبول علی　منظور علی　مشکور علی

(حبیب علی) وصی علی　رضی علی　سمی علی　اشتیاق علی　الطاف علی　بشیر احمد　محمد احمد　مکرم احمد
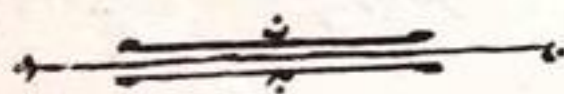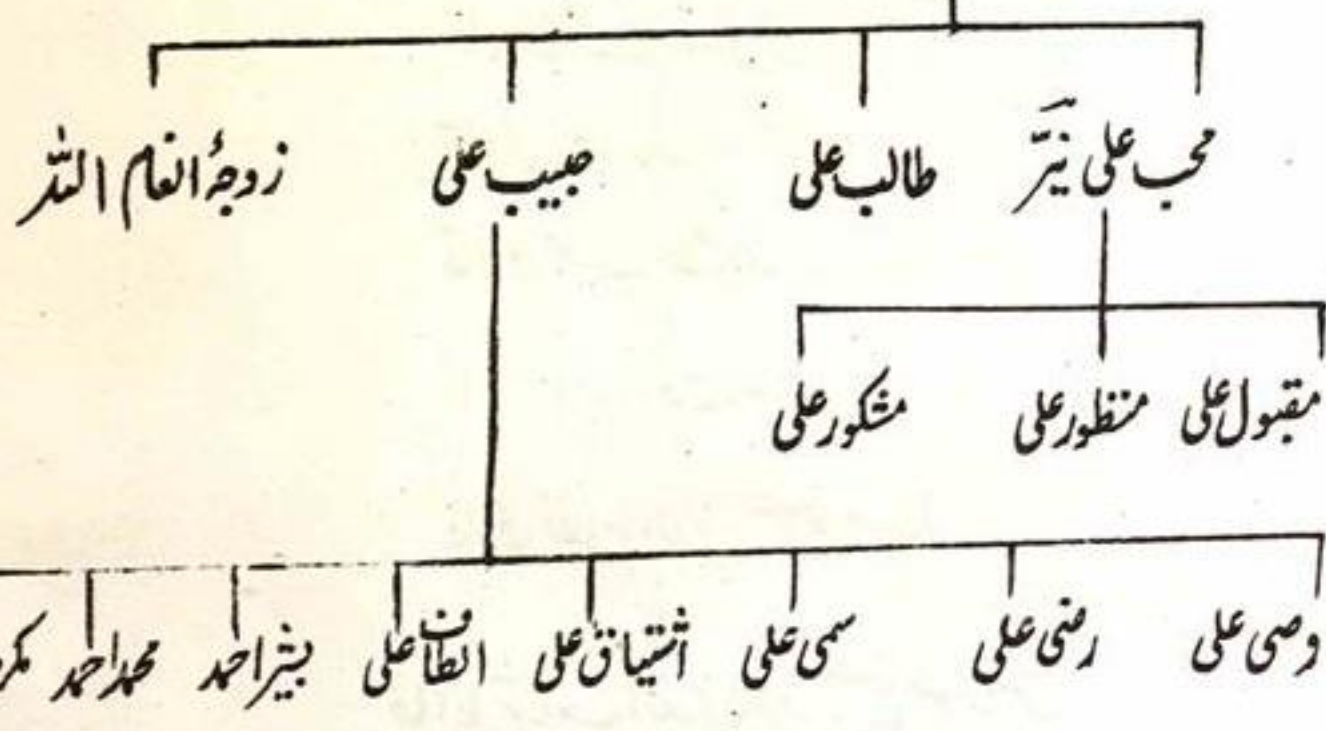
خاندان اور شجرۂ نسب

میر نذر علی درد کاکوروی کا اصل نام محمد مکرم احمد تھا لیکن وہ دنیائے ادب میں میر نذر علی درد کاکوروی کے نام سے مشہور ہوئے۔ میر نذر علی ان کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۱۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ مؤلف "نغمات النسیم" مولوی سمی علی علوی درد صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ ان کی مذکورہ کتاب میں درد کا تاریخی نام "شاداب بخت" لکھا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس میں "میر نذر علی" کے تاریخی نام ہونے کا ذکر نہیں ہے۔

درد صاحب کو علمی، ادبی، اور شعری ذوق وراثت میں ملا تھا ان کے والد حکیم حبیب علی علوی نہ صرف حاذق حکیم، مشہور طبیب اور ماہر وکیل تھے بلکہ ادیب اور شاعر بھی تھے۔ درد صاحب کے چچا حکیم محب علی نیر کاکوروی مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ خطوط غالب مرتبہ خلیق انجم میں نیر کے نام غالب کے دو خطوط بھی شامل ہیں۔ درد کاکوروی کے دادا حکیم مشتاق علی بھی اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔

درد کاکوروی کا تعلق کاکوری کے اعلیٰ نسب علوی خاندان سے ہے۔ ان کے آباء و اجداد نے سکندر لودھی کے عہد میں ترک وطن کرکے کاکوری میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ درد کا تفصیلی شجرۂ نسب درج ذیل ہے جو چند واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہونچتا ہے۔

ببر نذر علی درد کاکوروی ابن حکیم مولانا حبیب علی علوی ابن حکیم مشتاق علی ابن عاشق علی ابن محبوب عالم ابن محمد بقا ابن محب الرحمن ابن عبدالرحمن ابن حافظ غلام محمد ابن شیخ سیف الدین ابن شیخ ضیاء الدین ابن مخدوم ملا عبدالکریم ابن شیخ شہاب الدین عرف سوندھن ابن مخدوم قاری نظام الدین شیخ بھیکہ ابن قاری امیر سیف الدین ابن قاری حبیب اللہ نظام الدین ابن قاری امیر نصیر الدین ابن قاری محمد صدیق ابن قاری عبید اللہ ابن قاری عبدالصمد ابن قاری امیر شمس الدین خورد ابن قاری عبدالمجید دربان آستانۂ رسول کریم ابن حاجی حرمین سلطان حسین ابن قاری امیر ابراہیم نبیرہ و خلیفہ حضرت سید عبدالرزاق خلف و خلیفہ حضرت غوث الثقلین ابن قاری امیر سلیمان ابن مولانا وجیہ الدین احمد ابن قاری احمد علی ابن امام محمد حنفیہ ابن اسد اللہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ابن ابی طالب۔ [1]

درد کاکوروی کے جد اعلیٰ قاری محمد صدیق نے سب سے پہلے وطن مالوف کو خیر باد کہا۔ وہ کچھ ایسی پریشانیوں میں مبتلا ہوئے کہ وطن عزیز کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی ہجرت کے بارے میں حکیم نثار احمد رقمطراز ہیں:

"قاری محمد صدیق کے شیشۂ دل پر ایران کے ناسازگار حالات سے کچھ ایسی ٹھیس لگی کہ گھر بار سے منھ موڑا۔ اہل و عیال ساتھ لے کر سخت پریشانی اور مصیبت کی حالت میں وطن مالوف سے چل کھڑے ہوئے اور عرصہ تک ہرات و ملتان میں سرگرداں و پریشان پھر کر وارد لاہور ہوئے۔ پانچ سال وہاں گذارے بعد ازاں پٹیالی[2] کو محل سکونت شرفا خیال کر کے کچھ دنوں وہاں ٹھہرے

---

[1] سخنوران کاکوری از حکیم نثار احمد علوی ص ۳۰

[2] موجودہ علاقہ سرہند۔

پھر حاجی محمد خاں تاجر کی صلاح اور مظفر خاں صوبہ دار اودھ کے امرار سے اپنے چھوٹے بھائی کو پٹیالی میں چھوڑ کر بڑے بیٹے حافظ نصیر الدین اور دیگر متعلقین کو ہمراہ لے کر ملک اودھ میں داخل ہوئے۔ اور یہاں بھی مختلف مقامات پر سکونت کا اتفاق ہوا۔ آخر کار امیر سیف الدین نے باستقلال تمام واطمینان واقعی قصبۂ کاکوری میں سکونت اختیار کی جو آج تک ان کی اولاد کا ملجا و ماویٰ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لودیوں کا آفتاب اقبال کشور ہند کو منور کر رہا تھا اور سکندر لودی کا عہدِ سلطنت تھا۔" [1]

قاری نظام الدین شیخ بھیکہ دانشمند

قدما کاکوری کے اجداد میں قاری نظام الدین شیخ بھیکہ دانشمند صاحبِ علم و فضل اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ وہ حضرت ابراہیم ایرجی سے بیعت تھے انھیں کی خدمت میں رہ کر روحانی تعلیمات حاصل کیں۔ صوفیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ تصوف ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ سخنورانِ کاکوری میں عبد القادر بدایونی کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے قاری نظام الدین کی زیارت کے لیے کاکوری کا سفر کیا جبکہ ملا عبد القادر بدایونی نے کاکوری کا سفر کبھی نہیں کیا بلکہ لکھنؤ میں محمد حسین خاں کی معیت میں ملاقات کی انھوں نے خود لکھا ہے:

> "جامع این منتخب در صحبت محمد حسین خاں مرحوم در لکھنؤ بملازمت آں بزرگوار مشرف شد۔" [2]

بادشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر بھی آپ سے ملاقات کی غرض سے کاکوری تشریف لائے۔ اکبر کے داماد یعقوب سلطان بھی آپ کی خدمت میں حاضر

---

[1] سخنورانِ کاکوری از حکیم نثار احمد علوی ص ۲۰، ۳۰، ۴۰

[2] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۴۲ از ملا عبد القادر بدایونی۔

ہوئے۔

یہ روایت مشہور ہے کہ جب یعقوب سلطان سخت بیماری کا شکار ہوئے اور ان کو یہ اندازہ ہوگیا کہ اب موت کا وقت بالکل قریب ہے تو انہوں نے وصیت کی کہ بعد وفات انھیں اپنے پیر و مرشد حضرت قاری نظام الدین کے مزار مبارک کے پاس دفن کیا جائے چنانچہ وفات کے بعد ان کو ان کی خواہش کے مطابق "مقبرہ جھنجری روضہ" کاکوری میں سپرد خاک کیا گیا۔

سلطان یعقوب کی قبر سنگ مرمر کی ہے اور قبر کے سرہانے ایک گوشہ میں یہ کتبہ لگا ہوا ہے:

فلک قدر یعقوب سلطان کہ او
بجز تخم نیکی بہ دنیا نہ کشت
سوئے عالم قدس کردہ سفر
سرائے جہاں را بہ کلی بہشت
بنوشید از حوض کوثر شراب
کہ نیکو سیر بود و نیکو سرشت
چو کردہ ز تاریخ فوتش سوال
خرد گفت گردید ز اہل بہشت

۹۸۸ھ

قاری نظام الدین کے کئی بیٹے تھے لیکن علاوہ شیخ سوندھن کے کسی کی زندگی کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ شیخ سوندھن کا اصل نام شیخ شہاب الدین تھا۔ اپنے تمام بھائیوں میں علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز تھے۔ شیخ شہاب الدین نے اپنے والد کی زندگی میں دو بیٹوں کو چھوڑ کر انتقال کیا۔ یہ دونوں بیٹے ملا عبدالکریم اور ملا عبدالقادر فضل و کمال کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

حکیم مشتاق علی

درد کاکوروی کے دادا حکیم مشتاق علی نہ صرف فن طب میں مہارت رکھتے تھے بلکہ شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ مشتاق تخلص کرتے تھے۔ قدرت نے مزاج شاعرانہ عطا کیا تھا۔ اردو اور فارسی میں شعر کہنے پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اپنے احباب کو منظوم خطوط لکھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے۔

حکیم مشتاق علی بڑے دیندار اور روزہ نماز کے سخت پابند تھے۔ خدمتِ خلق کے علاوہ کسی چیز سے دل چسپی نہ رکھتے تھے، ہر وقت یادِ الٰہی میں منہمک رہتے تھے۔ بن پوری کی عیدگاہ میں امامت کے فرائض بھی ان کے ذمہ تھے۔ شاہ تراب علی قلندر کے مرید تھے۔ نثر میں اپنی دو کتابیں "تفریح الاطباء" اور "مفرح المشتاقین" یادگار چھوڑی ہیں۔ دونوں کتابوں کا تعلق فن طب سے ہے۔ یہ دونوں غیر مطبوعہ کتابیں نثار احمد علوی کے ذاتی کتب خانہ کراچی میں موجود ہیں۔ مشتاق صاحب نے اپنی خداداد ذہانت سے ایک ایسی گھڑی ایجاد کی تھی جس سے رات کا وقت دریافت کیا جا سکتا تھا۔ اس گھڑی کو قطب کی طرف رکھ کر دیکھا جائے تو پتہ چل جاتا تھا کہ ابھی کتنی رات باقی ہے۔

حکیم مشتاق علی ۲۴ رجمادی الاول ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۲ء کو کاکوری پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ عاشق علی قصبہ گلاؤٹھی ضلع میرٹھ میں تحصیلدار تھے[1]۔ یہ بڑے بہادر اور فن سپہ گری میں ماہر تھے۔ آپ کے جدِ امجد شیخ محبوب عالم اٹاوہ میں کلکٹر تھے۔ ابتدائی تعلیم عربی و فارسی تکیہ کاظمیہ کاکوری میں حاصل کی۔ اور اس کے بعد قصبہ گلاؤٹھی چلے گئے۔ وہاں درس نظامی کی تکمیل کے بعد طب کی ابتدائی کتابیں حکیم محبوب علی سے پڑھیں اور میرٹھ کی عدالت میں ناظر سررشتہ ہو گئے دو سال بعد دہلی چلے گئے اور حاذق الزماں طبیب حکیم عبدالقادر خاں دہلوی سے کتب طبیہ متداولہ پڑھ کر امتیازی سند حاصل کی۔ استاد نے طبیب زماں

---

[1] سخنورانِ کاکوری۔ نثار احمد علوی ص ۳۵۔

کے خطاب سے سرفراز کیا۔

طب کی تکمیل کے بعد ریاست آوا ضلع ایٹہ میں بحیثیت طبیب ملازمت کرلی۔ لیکن ان کی قلندرانہ طبیعت زیادہ دنوں تک ملازمت کی پابندیوں کو برداشت نہ کرسکی اور انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد مین پوری میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ۲۶ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۵ء کو سرائے فانی سے کوچ کیا اور مین پوری میں سپرد خاک ہوئے۔ علامہ محسن کاکوروی نے قطعۂ تاریخ کہا:

مشتاق علی طبیب حاذق
شبلی روش و ملک جنابے
بگذشت ازیں جہاں بگذاشت
رخلق ملال واضطرابے
چوں بار رخ اگرش حسنؔ[۱] بود
زنگ الفت بہ آب وتابے
ہاتف سر مرقدش رقم کرد
مہتاب قرین آفتابے

۱۳۰۲ھ

حکیم حبیب علی علوی

درد کے والد ماجد حکیم حبیب علی علوی نہ صرف صاحب طرز ادیب تھے بلکہ خوش فکر اور نادر الکلام شاعر بھی تھے۔ حکیم صاحب فن حکمت میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ وہ ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۰ھ میں انتقال کیا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم

---

[۱] مولوی حسن بخش مرحوم جو اُن کے برادر نسبتی تھے۔

اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ بے انتہائی ذہین تھے۔ صرف سترہ سال کی عمر میں کتب درسیہ سے فراغت حاصل کرلی تھی، مشہور عالم دین اور مجاہد آزادی مفتی عنایت احمد کاکوروی سے بھی فخر تلمذ حاصل تھا۔ کتب بینی اور تصنیف و تالیف آپکا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا دور دور چرچا تھا۔ انہوں نے تبلیغ اسلام اور شرعی احکام کے درس کی بدولت کتنے ہی گمراہ لوگوں کو راہِ راست پر لگا دیا۔ مفتی اٹاوہ اور امام عیدگاہ کے فرائض تاحیات انجام دیتے رہے۔ حکیم صاحب نے تقریباً پچاس کتابیں لکھی تھیں جن میں سے صرف ۱۶ کتابوں کا پتہ چلتا ہے یہ کتابیں شرعی مسائل، تصوف، تاریخ، اور فن طب سے متعلق ہیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ رسالہ تعلق دل بہ حلیہ شریف معروف بہ خیال حلیہ سید الانبیاء۔

۲۔ تقابل موذی۔

۳۔ سیف المسلول من ہو یمانع القیام بحولہ الرسول

۴۔ المواعظ الحسنہ۔

۵۔ دفع المعاند۔

۶۔ مرقع شریف۔

۷۔ وجوب القیام فی میلاد خیر الانام۔

۸۔ تحقیق حکایات امام ابی یوسف۔

۹۔ تحقیقات نادر جیبی۔

۱۰۔ تحفۂ تحریر اہل نجات۔

۱۱۔ تقریر کشاف۔

۱۲۔ تحقیق کنیت صدیقی۔

۱۳۔ جائز سجدۂ تحیات۔

۱۴۔ جوازالحاج بالغیر۔

۱۵۔ ازالۃ الخطرات محدود۔

۱۶۔ اثبات معانقۂ عیدین۔

حکیم حبیب علی علوی خداداد شاعرانہ صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ شاعری کا ذوق انھیں وراثت میں ملا تھا۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں جو ان کی فارسی شاعری کا بہترین نمونہ ہیں:۔

الٰہی عاصیم استغفر اللہ

توئی فریاد رس الحمد للہ

رہائی دہ مرا از خود رہائی

بنورِ خویشتن چشم کشائی

تن و جانم بہ فضلِ خویش داری

ضمانِ روزیم بر خود نہادی

ہمہ عمرم ز طفلی و جوانی

گنہ کردم باعلان و نہانی

غلط کردہ رہِ تحقیق بنما

سوئے توبہ مرا توفیق بنما

حبیبی یا ظلومی یا جہولے

مناجاتے شدہ بہر قبولے

حکیم حبیب علی علوی کے آٹھ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ حکیم وصی علی، منشی رضی علی جگر حکیم الطاف علی، حکیم مولوی محمد سمی علی، اشتیاق علی، حکیم بشیر احمد حافظ حکیم محمد احمد اور محمد مکرم احمد۔ یہاں پر درد کے بھائیوں کا مختصر ذکر کیا جا رہا ہے۔

حکیم وصی علی وصیؔ

حکیم وصی علی علوی ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۶ جولائی ۱۸۷۰ء اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ بلند اختر تاریخی نام تھا۔ انہوں نے ابتدائی عربی و فارسی نیز طب کی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ حافظ شاہ علی انور قلندر سے بھی فخر تلمذ حاصل تھا۔ شاہ علی اکبر قلندر کے مرید تھے۔ شاہ حبیب حیدر قلندر نے ان کو بیعت کی اجازت دے دی تھی لیکن احتراماً کسی کو مرید نہیں کرتے تھے۔

اٹاوہ اور اس کے قرب و جوار میں ان کے علم و فضل کی بڑی شہرت تھی۔ قاضی مفتی اور عیدگاہ اٹاوہ کی امامت کی ذمہ داریاں بھی ان کے سپرد تھیں۔ بڑے نیک طبع، شریف النفس اور خوش اخلاق بزرگ تھے۔ دوسرے مذاہب کے افراد بھی ان کی بزرگی کے قائل تھے۔ انھیں تمام فقہی مسائل ازبر تھے۔ آخر عمر تک درویشانہ زندگی بسر کی۔ ضلع کچہری اٹاوہ میں پیش کار کے عہدہ پر فائز تھے۔ حکیم وصی علی کو شعر و سخن کا فطری ذوق تھا۔ وصیؔ تخلص کرتے تھے اور علامہ محسن کاکوروی سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ مختلف اصناف میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی ایک مناجات جو طاعون کے زمانہ میں کہی تھی بہت مشہور و مقبول ہوئی۔ ان کا انتقال ۲۶ شعبان ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء کو اٹاوہ میں ہوا اور وہیں بادشاہ تلی کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

قطعۂ تاریخ وفات از دردؔ کاکوروی

جانشین والد ماجد حبیب
صاحب علم و عمل مسکیں طبیب
شیخ الاسلام و امامِ عیدگاہ
مومنین و مسلمیں را دیں پناہ

فاضل و کامل شمائل اتقیا
قدوهٔ علما حبیب اولیا
رفت ازیں عالم چنیں درویش حیف
آہ۔ رحلت کرد آں دلریش حیف
۱۳۵۶ھ
در علالت با تیمم ہر نماز
از اشارت ساختہ با صد نیاز
شد ز فیض مرشداں مقبول حق
بود خاموش و دلش مشغول حق
ہاں بہ ہیں اکنوں پئے ذکر خفی
با حبیب ۔ خلوت روح وصی
۱۳۵۶ھ
الغرض بست و ششم شعبان بود
در شب دوشنبہ با حق رو نمود
بود ایں ضرب دل روح وصی
۱۳۵۶ھ
رفت با حب علیؓ پیش نبیؐ
بے بہا طاؤس عرشی رفت۔ آہ
۱۳۵۶ھ
مرد کامل جنتش آرام گاہ
۱۳۵۶ھ
مصرع تاریخ درد دل نوشت
صوفی اہل اللہ وصی اندر بہشت
۱۳۵۶ھ

ان کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

قلب کی جس دم پڑی آنکھ بروئے نبیؐ
روح وہیں ہو گئی مست بہ بوئے نبیؐ

ذکرِ رسول انام لطف سے کر شادکام
دے وہی کوثر کا جام تازہ سبوئے نبیؐ
کافی ہے بہرِ حیات ہم سے سیہ کار کو
سلسلۂ عاشقاں حلقۂ موئے نبیؐ
جو کوئی اس نعت کو بزمِ نبیؐ میں پڑھے
میری طرف ہو دحیؔ خندہ رُوئے نبیؐ

حضور آئے تو انساں درحقیقت بن گئے انساں
فرشتے کیا خدا خود ہے انھیں کے نام پر قرباں
مجھے بھی ساتھ اپنے لے چلو اے قافلے والو
مدینہ میں فقط ہوگا ہمارے درد کا درماں
ہیں گیسو سورۂ واللیل عارض مصحفِ قرآں
یہ ظاہر ہے کہ ہے والشمس حضرت کا رخِ تاباں
تمنّا ہے مرے آقا تو بس اتنی تمنّا ہے
ترے کوچے میں مثلِ خاک ہوں ہر وقت سرگرداں
حضوری کے لیے ہر وقت میں بے چین رہتا ہوں
مدینہ میرا مقصد ہے مدینہ ہے مرا ایماں
میسّر سرمۂ خاکِ مدینہ ہو دحیؔ ہم کو
یہی ہے آخری حسرت یہی ہے آخری ارماں

رضی علی اخگر

منشی رضی علی اخگر ۹ رمضان المبارک ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء کاکوری میں پیدا ہوئے ان کا تاریخی نام شیخ اکرام حسن تھا ابتدائی اور عربی فارسی کی تعلیم اپنے والد اور بڑے بھائی سے حاصل کی۔ طب کی سند دہلی سے پائی۔ شاہ علی اکبر قلندر سے بیعت ہوئے۔ ریاست رام پور میں ملازم تھے۔ اور خدمت خلق کی خاطر مطب بھی کرتے تھے۔ شعروشاعری کی طرف میلان تھا۔ رام پور کی ادبی فضا اور امیر مینائی کے تعلقات سے بیحد متاثر ہو کر شاعری کرنے لگے۔ شروع میں رضی تخلص تھا اور بعد میں اخگر تخلص اختیار کیا۔ اپنے کلام پر محسن کاکوروی سے اصلاح لیتے تھے اور حضرت امیر مینائی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ اردو فارسی اور عربی میں شعر کہنے پر یکساں قدرت حاصل تھی۔

اخگر صاحب نہایت مخلص اور وضع دار تھے۔ ان کے اخلاق اور قابلیت کی بدولت رام پور کے امرا و رؤسا ان کے بڑے مداح اور قدرداں تھے۔ ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل تھی۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ رام پور میں اس زمانہ میں دو گروہ بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ ایک گروہ احمد علی شوق قدوائی اور دوسرا گروہ احمد علی ابرو محمود خاں کا تھا۔ اخگر صاحب کی دونوں حلقوں میں پذیرائی ہوتی تھی۔ اخگر کی درج ذیل منظومات زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئیں۔

۱۔ مناجات رضی۔ ۲۔ مناجات سرمست۔ ۳۔ باب میکدہ اور ایک تضمین جو عربی زبان میں تھی۔ تضمین رضی العتیق علی مناجات ابی بکر الصدیق رضؓ ان کے علاوہ ایک نظم بلند پروازی رضی کے نام سے شائع ہوئی یہ علامہ محسن کاکوروی کی نعتیہ مثنوی "نظم دل افروز" پر تضمین ہے۔

اخگر کی شمع حیات ۱۲ محرم الحرام ۱۳۴۶ھ مطابق ۳ جولائی ۱۹۲۷ء کو

گل ہوگئی۔ ان کی تدفین رام پور کے شاہ درگاہی کے احاطہ میں ہوئی۔

قطعۂ تاریخ وفات از درد کاکوروی

حضرت انگر رفتنی نامی ز دہر
رفت ناگہہ شاعر شیریں سخن
درد تاریخ وفات او نوشت
از سرِ شور و غم و مرگ وطن

ش + غ + م + د = ۱۳۴۶ھ

نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں:

نعتیہ اشعار

یہ بیکس ہے بندہ تمہارا محمدؐ
خبر لو خبر لو خدارا محمدؐ
دوپارہ قمر ہوگیا ایکدم میں
عجب آپ کا ہے اشارا محمدؐ
کہیں دیکھ پاؤں تو قدموں پہ گر کر
سناؤں وہیں حال سارا محمدؐ
جو روضہ پہ پہونچوں تو جالی پکڑ کر
دکھاؤں دلِ پارہ پارا محمدؐ
وہیں جوش دریائے رحمت میں آیا
جہاں دل سے تم کو پکارا محمدؐ
بلالو مدینہ میں اب تو بلالو!
نہیں ہے یہ فرقت گوارا محمدؐ

اسی شعلۂ رخ کا اخگرؔ رضی ہے
وہی طور کا ہے شرارا محمدؐ

غزلیہ اشعار

جو پاس بیٹھے بھی میرے تو کسمسائے ہوئے
بدن چرائے ہوئے اور کچھ چھپائے ہوئے
نگاہِ ناز سے بے ساختہ نہ دیکھا کر
انہی اداؤں کے ظالم ہیں ہم ستائے ہوئے
ہیں ایک ہم کہ ترستے ہیں انکی صورت کو
ہیں ایک وہ کہ انھیں ہیں گلے لگائے ہوئے
رضیؔ شباب جو کھویا گیا ہے پیری میں
ہم اس کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں سر جھکائے ہوئے

ایسا نہ آج تک کہیں دیکھا سنا علاج
سوزش جگر کی اور بڑھی جب کیا علاج
سرگرمیٔ جنوں میں ہے بادِ صبا علاج
خونِ جگر کے واسطے رنگِ حنا علاج
کیوں کر نہ پائیں اس لبِ جاں بخش سے شفا
عناب لب علاج ہے زلف دوتا علاج
سوز جگر ہے لاکھوں ہیں درماں کیے مگر
جز وصل یار ہم کو نہ کوئی ملا علاج
افسوس اپنی جان سے اخگرؔ گذر گیا
اس کشتۂ فراق کا کیا کیا ہوا علاج

حکیم مولوی سمی علی علوی حکیم مولوی سمی علی علوی نے ۸ر شوال ۱۲۹۲ھ مطابق ۸ر نومبر ۱۸۷۵ء کو عالم آب و گل میں قدم رکھا۔
ان کا تاریخی نام غلام حیدر تھا۔ عربی فارسی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ انگریزی میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور صوبہ جات متحدہ (یوپی) کے محکمۂ صحت میں ملازمت اختیار کرلی۔ علم طب کا ذوق انھیں ورثہ میں ملا تھا اور اس ذوق کی تسکین کے لیے طب کی تعلیم حکیم عبدالحی حسنی مولف "تذکرہ گل رعنا" سے حاصل کی۔ بڑے مخلص، نیک اور شریف النفس نیز پرہیزگار انسان تھے۔ خدمت خلق کے لیے مطب بھی کرتے تھے۔ عربی و فارسی زبان و ادب پر ان کو بہت عبور حاصل تھا۔
ان کا سب سے بڑا کارنامہ نسب نامہ موسوم بہ "نفحات النسیم فی تحقیق احوال عبدالکریم" ہے۔ جو ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس کتاب سے تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مع ترمیم و اضافہ کے ادیب سحر طراز ڈپٹی امیر احمد علوی نے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا۔ مولوی سمی علی علوی ۲۳ر جمادی الاول ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۹۲۳ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔

قطعہ تاریخ وفات از درد کاکوروی

صوفی عصر مولوی صاحب سمی علی
دار فنا سے چلدیے باغ جناں کی راہ لی
لکھتے درود صبح میں۔ آخری رات ذکر و شغل
نعرۂ ہو سے اشک بار، عشق نماز و روزہ بھی
ہاتف غیب نے کہا درد سے سال فوت یہ
از پے لطف سیر گل خلد میں ہیں سمی علی
۱۳۴۱ھ

مولوی اشتیاق علی علوی

مولوی اشتیاق علی علوی ۷ر شوال ۱۲۹۴ھ بروز پنجشنبہ پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام غلام اکبر تھا۔ نہایت نیک، ملنسار اور خلیق تھے۔ درسیات عربی و فارسی نیز طب کی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ انگریزی میں انٹرنس کا امتحان بھی پاس کیا۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی۔ تین روز کے بخار میں مبتلا رہ کر ۱ر جمادی الاول ۱۳۱۹ھ کو ان پر ایسی غشی طاری ہوئی کہ دو بجے دن میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

حکیم مولوی الطاف علی علوی

حکیم مولوی الطاف علی علوی نے ۲۹ر رمضان ۱۲۹۹ھ کو جنم لیا۔ سید ظہیر علی تاریخی نام تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کرنے کے بعد انہوں نے طب کی سند بھی انہیں سے لی۔ تلاش معاش میں حیدر آباد پہونچے اور ملازمت کرلی۔ مطب بھی کرتے تھے۔ اور اپنے حسن سلوک، خلوص اور دیانتداری کی وجہ سے ہر دلعزیز تھے۔ ایک عرصہ تک اورنگ آباد میں خزینہ دار رہے۔ اس کے بعد بیجا پور ضلع اورنگ آباد میں نائب تحصیلدار ہو گئے۔ آخر میں اختلاج قلب کے مرض کا شکار ہو کر ۴ر شوال ۱۳۵۱ھ مطابق ۳۱ر جنوری ۱۹۳۳ء کو حرکت قلب رک جانے سے اورنگ آباد و دولت آباد کے درمیان انتقال کیا۔

قطعۂ تاریخ وفات از درد کاکوروی

درد بھائی ظہیر علے وہ حکیم
فیض جاری تھا جن کا حکمت میں
چار شوال روز سہ شنبہ
ہوئے داخل جوارِ رحمت میں
درد روئے بکاہے ہے تاریخ
نیک سیرت گیا ہے جنت میں

۱۳۵۱ھ

حکیم مولوی بشیر علی علوی

حکیم مولوی بشیر علی علوی ۲۲ شعبان ۱۳۰۱ھ کو پیدا ہوئے۔ غلام مصطفےٰ تاریخی نام تھا۔
ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی منزلیں طے کیں اور محکمۂ ڈاک و تار میں ملازم ہو گئے۔ وہ دوران تعلیم کان پور اپنی ملازمت کی مصروفیات کے باوجود شعر و ادب سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ خدمت خلق کے طور پر کانپور میں مطب بھی کرتے تھے۔ ان کے ذاتی کتب خانہ میں قدیم و جدید شعراء کے دیوان بڑی تعداد میں موجود تھے۔ وہ رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی کے خاص دوستوں میں تھے۔ خود تو باقاعدہ شاعری نہیں کرتے تھے لیکن شعری ذوق وجدان کی حد تک تھا۔
بشیر صاحب اپنے اخلاق و کردار کے لیے قرب و جوار میں بہت مشہور تھے۔ نہایت شریف النفس اور منکسر المزاج انسان تھے۔ رسول خداؐ اور صحابہ کرامؓ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ تصوف سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کی عبادت و ریاضت، سادگی و پاکیزگی اوصاف کی وجہ سے کان پور میں لوگ ان کے گرویدہ تھے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ ان کے چار بیٹے ہیں، چاروں شاعر و ادیب ہیں۔ سرفراز احمد فطرت، احسان احمد احسان، نثار احمد ساقی اور انعام احمد سکیش پاکستان میں مقیم ہیں۔ نثار احمد ساقی کی تالیف "سخنوران کاکوری" تو ان کا ایسا کارنامہ ہے جو انھیں حیات جاوداں بخشے گا۔ یہ کتاب کاکوری کی پانچسو سالہ علمی، ادبی اور شعری تاریخ کو اپنے اوراق میں سمیٹے ہوئے ہے اور تحقیق کرنے والوں کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ افسوس کہ ۲۷ جولائی ۱۹۸۶ء کو حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

حکیم بشیر علی علوی نے ۱۹۵۳ء میں کراچی میں وفات پائی۔

قطعہ تاریخ وفات از درد کاکوروی

گئے دارِ فانی سے سوئے جناں
بشارت کے حامل بشیر علے
زمانے میں مشہور حاذق طبیب
بڑے پاکباز اور بڑے متقی
درودِ نبیؐ لکھتے رہتے مدام
بفضل خدا شغل تھا بس یہی
یہ تاریخ ہے عیسوی سال میں
اثر گیر گلشن بشیر علے
۱۹۵۳ء
کہا درد ہاتف نے ہجری میں سال
گل آرزو اُدخُلی جنتی
۱۳۷۲ھ

حکیم محمد احمد علوی

حکیم محمد احمد علوی ۱۳۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ محمد وفاران کا تاریخی نام تھا۔ ابتدائی تعلیم عربی و فارسی اپنے بڑے بھائی وصی علی وصی سے حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں حفظ قرآن پاک کی بھی سعادت عطا فرمائی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ سے سند فضیلت حاصل کی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے شاگرد رشید تھے۔ طب کی سند تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے پائی۔ شفاءالملک حکیم عبدالعزیز سے بھی استفادہ کیا۔ مین پوری میں مطب کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ میں شفا دے رکھی تھی۔ مین پوری اور قرب و جوار کے لوگ انھیں مسیحا کہتے تھے۔ علامہ نورالحسن نیّر کاکوروی کے مین پوری سے ہٹنے کے بعد حکیم صاحب ہی امام عیدگاہ ہو گئے تھے۔ مفردات سے علاج میں خاص ملکہ تھا۔ ایک کتاب "علاج المفردات" بھی مرتب کی تھی جو مؤلف "سنجنوران کاکوری" کے

ذاتی کتب خانہ واقع ناظم آباد کراچی میں غیر مطبوعہ موجود ہے۔

حکیم محمد احمد صاحب نہایت خوش اخلاق، وضعدار اور نرم گفتار انسان تھے۔ مین پوری اور اس کے اطراف و جوانب میں میلاد کی محفلیں بارہ مہینے ان کے دم سے ہوتی تھیں۔ وہ بڑے خشوع و خضوع سے میلاد پڑھتے تھے۔ ایک میلاد شریف بھی تحریر کیا تھا جو اشاعت سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

شاعری کا مذاق وراثت میں ملا تھا۔ شعر کہنے پر زبردست قدرت رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں سلاست و روانی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انھوں نے نعتیں زیادہ تعداد میں کہی ہیں۔ چونکہ ان کو رسول اکرمؐ سے بے حد عشق تھا اس لیے ان کی نعتوں میں بڑی جاذبیت ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مین پوری سے کانپور آ گئے۔ جہاں طویل علالت کے بعد ۱۹۶۳ء میں انتقال ہو گیا۔ ان کا جسدِ خاکی کاکوری لایا گیا اور تدفین خاندانی قبرستان میں ہوئی۔ میر نذر علی درد کاکوری نے قطعۂ تاریخ کہا ؎

حیف صد حیف کہ حافظ بھائی
دارِ فانی سے گئے سوئے احد
تین رمضان جمعرات کا دن
یہی ساماں بنا نورِ لحد
دردؔ رضواں نے کہا سالِ وفات
چشمۂ فیض محمد احمد
۱۳۸۲ھ

نمونۂ کلام۔

نعت پاک

آرام گہہِ جان فقط ذکرِ نبیؐ ہے
اللہ غنی کیسے شبِ ہجر کٹی ہے

ہر سمت چراغاں ہے ہر اک راہ سجی ہے
مہمان سرِ عرش وہ مکی مدنی ہے

سرکار پلاتے رہیں گر جام مسلسل
کہتا ہی رہوں تشنہ لبی، تشنہ لبی ہے

قائم ہیں دو عالم تو فقط اس کی رضا سے
جو کچھ بھی ہے یہ اس کی ہی بس جلوہ گری ہے

جب نام لیا احمد مختارؐ کا واللہ
بگڑی ہوئی جو بات تھی فوراً وہ بنی ہے

جینے کا سہارا ہے فقط نام محمدؐ
تسکین ملی ہے جو کبھی اس سے ملی ہے

علوی ترے گھر آئے تھے کیا سرورِ عالمؐ
خوشبوئے محمدؐ تری رگ رگ میں بسی ہے

نعت پاک

معراج کا ہے جشن معنبر تمام رات
دلکش ہے بزمِ دین کا منظر تمام رات

پڑھتا رہا جو نعتِ پیمبرؐ تمام رات
جاگا کیا فلک پہ مقدر تمام رات

پڑھتا رہا درود حبیبِ خدا پہ میں
گن گن کے آسمان کے اختر تمام رات

کرتا رہا جو ذکرِ جمالِ رسولِ پاکؐ
چمکا رہا مجھے پہ انور تمام رات

واللیل ذکر گیسوئے پاک رسول سے
ہوتی رہی یہ بزم معطر تمام رات
کثرت درود پڑھنے کی لائی ہے رنگ یہ
بٹتا رہا ہیں بادۂ کوثر تمام رات
اب تو رہے گی بارشِ رحمت تمام دن
یادِ نبی میں آنکھ رہی تر تمام رات
نعت نبیؐ کے جتنے ہیں الفاظ اور حروف
بنتے رہے وہ خلد کے گوہر تمام رات
مہر و کرم نبی کے جو علوی بیاں کیے
ستنا رہا یہ ماہِ منور تمام رات

میر نذر علی درد میر نذر علی درد کاکوروی کا اصل نام محمد مکرم احمد تھا۔ انہوں نے حکیم حبیب علی علوی کے گھر میں بمقام اٹاوہ ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۱ء میں جنم لیا۔ حکیم حبیب علی علوی ان دنوں بسلسلۂ ملازمت اٹاوہ میں مقیم تھے۔ "نفحات النسیم" میں درد کاکوروی کا تاریخی نام "شاداب بخت" لکھا ہے۔ جس سے ۱۳۱۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ وہ دنیائے ادب میں میر نذر علی کے نام سے مشہور ہوئے۔ "میر نذر علی" سے بھی مذکورہ سن ولادت برآمد ہوتا ہے۔ یعنی یہ بھی ان کا تاریخی نام ہے۔ لیکن تعجب ہے مؤلف "نفحات النسیم" نے "میر نذر علی" کے تاریخی نام ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ابتدائی ماحول درد کاکوروی نے خالص علمی اور ادبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ سارا ماحول شعر و ادب کی فضا سے معمور تھا۔ ان کے والد اور چچا محب علی علی نیّر شاگرد غالب اور دادا حکیم مشتاق علی بھی شاعر تھے۔ ان کے والد کے ماموں زاد بھائی

علامہ محسن کاکوروی کی نعت گوئی شہرت کی بلندیوں کو چھو رہی تھی ۔ نورالحسن نیر شاعر کی حیثیت سے افق شاعری پر نمودار ہو چکے تھے ۔ اس ماحول کے پروردہ ہونے کی وجہ سے علم و ادب اور شعر و سخن سے گہرا لگاؤ ہونا فطری امر تھا ۔ ان کا بچپن بڑے خوشگوار ماحول میں گذرا ۔ اس ماحول کا یہ اثر ہوا کہ کم عمری میں شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے ۔

تعلیم درد کاکوروی نے ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم وصی علی وصی سے حاصل کی ۔ اعلا تعلیم کے حصول کے لیے رام پور چلے گئے جہاں ان کے بڑے بھائی رضی علی اخگر بسلسلۂ ملازمت قیام پذیر تھے ۔ مولانا قاری عبدالستار صاحب کانپوری نے خود بخوشی علم تجوید سے سرفراز کیا ۔ کچھ عرصہ کے بعد علامہ محسن کاکوروی کے فرزند مولوی نورالحسن نیر مولف نوراللغات نے انھیں ہردوئی طلب کرلیا ۔ وہاں رہ کر بھی وہ عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرتے رہے ۔ کتب بینی کا بڑا شوق تھا ۔ کئی زبانوں کا مطالعہ کیا اور بہت جلد اپنی علمی استعداد کو مستحکم اور وسیع بنا لیا ۔ اردو اور فارسی دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے ۔ جس کا ثبوت ان کا اردو اور فارسی کلام ہے ۔ ان کے منظوم ترجمے اور عربی و فارسی الفاظ کا شاعری میں بے ساختہ استعمال بھی ان کی قادرالکلامی کے غماز ہیں ۔ حدیث اور فقہ ، منطق اور فلسفہ کا بھی انھیں ماہرانہ علم تھا ۔

جناب عرفان عباسی درد کے بچپن اور ان کے گھر کی علمی و ادبی فضا کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

"درد صاحب نے ایک علمی اور ادبی خانوادے میں آنکھ کھولی تھی ۔ خاندان کا ہر فرد شعر و شاعری اور علم و ادب کا شیدائی تھا ۔ والد بھائی سب شاعر تھے اور خاندان میں بیشتر کا شمار بڑے سخن فہم و صاحبان کمال میں ہوتا تھا ۔ شاعری ان کی گھٹی میں پڑی تھی اور شاید

ان کے کانوں میں شعر کی آواز اذان کی آواز سے پہلے پڑی ہوگی۔ گھر کے
ماحول پر شعر و سخن کی گھٹائیں چھائی تھیں۔ شعر و سخن کی فضاؤں میں
آنکھ کھولی، شعر کے کھلونوں سے کھیلے شاعری کے پالنے میں جھولے،
شعور کی منزل میں داخل ہوئے اور گلشن شعر و شاعری میں محوِ خرام
نظر آنے لگے۔" [1]

عادات و اطوار درد کاکوروی نہایت مخلص اور دردمند انسان تھے۔ ان
کے مزاج میں شرافت، سادگی اور سنجیدگی کوٹ
کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ایک با اخلاق، انسان دوست، نیک خو، خوش اطوار، خوش
گفتار، باوضع، شریف النفس، منکسر المزاج انسان تھے۔ وہ اپنے وطن سے
بے پناہ محبت رکھنے والے، قدیم روایات کے پاسدار، علمی اور تہذیبی اقدار کے
دلدادہ اور خلوص و وفا کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ چھوٹے بڑے، امیر غریب، مرد
عورت، بچے بوڑھے ہر ایک سے نہایت عاجزانہ لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔
غرور و تکبر کی تو انھیں ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ ان کی ذات میں ایسی تمام خوبیاں
جمع ہو گئی تھیں جو کم ہی لوگوں میں یکجا ملتی ہیں۔

درد کو بچپن ہی سے تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ شاعری ان کو وراثت
میں ملی تھی۔ نثر نگاری کا بھی بے حد شوق تھا۔ دوسرے شعراء کا کلام یاد کرتے
اور سناتے تھے۔ مولانا روم کی مثنوی تو بہت والہانہ انداز میں پڑھتے تھے۔ اکثر
و بیشتر قصبہ کے لوگ ان سے مثنوی سننے کا باقاعدہ اہتمام کرتے تھے۔ مثنوی
مولانا روم سے تو انھیں عشق تھا۔ بچپن سے لے کر قیام اورنگ آباد تک
اور اس کے بعد زندگی کے آخری ایام میں بھی وہ مثنوی بڑے لحن سے پڑھتے

---

[1] تذکرہ شعرائے اتر پردیش۔ جلد چہارم۔ از عرفان عباسی صفحہ ۱۴۷۔

تھے۔ قیام اورنگ آباد کے دوران تو ان کے احباب ہفتہ میں ایک دن کسی نہ کسی بزرگ کے مزار پر مثنوی مولانا روم اور درد کا صوفیانہ کلام سننے کے لیے جمع ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ خود لکھتے ہیں:۔

"ہفتہ میں ایک بار کسی بزرگ کے مزار پر یا ان میں سے کسی کے مکان پر "بھٹی" گرم ہوتی تھی۔ یعنی یہ حضرات بطور خاص مثنوی مولانا روم اور اس ناچیز کا صوفیانہ فارسی، اردو کلام فرمائش کرکے ترنم اور لحن سے بذوق وشوق سنتے تھے اور لطف اٹھاتے تھے۔ کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔" [1]

---

[1] جذبات درد۔ از درد کاکوروی صفحہ ۹-۱۰۔

شادی اور اولاد

درؔد کاکوری جب جوان ہوئے تو ان کے والدین کو ان کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ قصبہ کاکوری ہی میں شیخ محمد شفیع (از بنا ٹرشاہ کاشف) کی بڑی بیٹی سے ۱۲؍ نومبر ۱۹۲۴ء مطابق ۵؍ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ بروز دو شنبہ کو درؔد صاحب کی شادی ہوگئی۔ انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی میں بڑے غم اٹھائے۔ درؔد کے یہاں تین بیٹے پیدا ہوئے لیکن تینوں بیٹوں نے صغر سنی میں ہی ان کو داغ مفارقت دیا۔ ان کے بڑے بیٹے معظم احمد جن کا تاریخی نام میر حافظ علی تھا جس سے ۱۳۴۹ھ برآمد ہوتا ہے ۵؍ مارچ ۱۹۳۵ء کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

درؔد کے دوسرے بیٹے جن کا نام محمد علی تھا چند روز شدید بخار میں مبتلا رہ کر ۱۷؍ ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور ان کے چھوٹے بیٹے شوکت علی صرف ڈھائی سال کی عمر میں بمقام اورنگ آباد (دکن) ۸؍ جمادی الاول ۱۳۶۶ھ مطابق اپریل ۱۹۴۵ء میں آغوش اجل میں ابدی نیند سو گئے۔ اس طرح درؔد صاحب کے آنگن کے سارے چراغ گل ہو گئے۔

ان کی دو بیٹیاں ہیں تعظیمہ عرف زبیدہ خاتون جو ۲۵؍ جمادی الآخر ۱۳۴۵ھ مطابق یکم جون ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئیں اور دوسری بیٹی تسلیمہ جن کا تاریخی نام بلقیس زماں خاتون ہے۔ تسلیمہ کی پیدائش ۲۴؍ شعبان ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۷؍ جنوری ۱۹۳۹ء کو ہوئی۔ بڑی بیٹی کی شادی انہوں نے اپنے بھائی

رضی علی اخگر کے بیٹے نقی علی کے ساتھ کردی ۔ یہ شادی ۲۷ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۴ مئی ۱۹۴۲ء اورنگ آباد میں قیام کے دوران کی ۔ ان سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں ۔ یہ سب عزیز آباد کراچی میں مقیم ہیں ۔ درد بھی آخر عمر تک انھیں لوگوں کے ساتھ رہے ۔

محترمہ تعظیمہ کی لڑکی جو بھائیوں سے بڑی ہیں انکی ولادت ۱۹ نومبر ۱۹۴۹ء مطابق ۲۷ محرم ۱۳۶۹ھ کو ہوئی ۔ درد کے نواسے نسیم وصی ۱۰ محرم ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹ ستمبر ۱۹۵۳ء ہیں ، محسن رضا ۲۱ محرم ۱۳۷۵ھ مطابق ۹ ستمبر ۱۹۵۵ء ہیں اور مجاہد حسین ۱۰ محرم ۱۳۷۹ھ مطابق ۷ جولائی ۱۹۵۹ء پیدا ہوئے ۔ ان کی دوسری بیٹی تسلیمہ کی شادی ۲ ربیع الاول ۱۳۷۷ھ مطابق ۲۷ ستمبر ۱۹۵۷ء کو شمیم احمد حیدر آبادی کے ساتھ ہوئی ۔ ان کے بارے میں مزید معلومات حاصل نہ ہو سکی [۱]

شاعری کا آغاز اور تلمذ

درد نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جس میں ہر وقت علم و فضل اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے ۔ شاعری ان کو ورثہ میں ملی تھی ۔ ان کو شاعری کے لیے میدان تیار ملا ۔ طبیعت میں غضب کی موزونیت تھی ۔ چنانچہ انھوں نے باقاعدہ شاعری کا آغاز کر دیا ۔ درد نے ۱۹۲۵ء سے قبل ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا ۔ اسلیے کہ اس سے پہلے کے رسائل میں ان کا کلام شائع ہوا ہے ۔ شروع میں ساغر اور ممتاز تخلص رکھا لیکن بعد میں ایک بزرگ کے ارشاد پر درد تخلص اختیار

---

[۱] یہ تفصیلات نغمات النسیم کی اس جلد سے درج کی گئی ہیں جس میں مشکور علی علوی اور معین احمد علوی نے اپنے قلم سے اضافے کیے ہیں ۔ فرقان علی مخمور

کیا اور اخبارات ورسائل میں اسی نام سے ان کا کلام شائع ہونے لگا۔ تخلص کی تبدیلی کے بارے میں وہ خود رقم طراز ہیں:

"اس ناچیز پر ایک قلندر مہربان ہو گئے' ان کی نظر فیض اثر کام کر گئی۔ میں پہلے ساغر اور ممتاز تخلص کیا کرتا تھا قلندر موصوف کا ارشاد ہوا کہ درد اپنا تخلص رکھو۔ نظم و نثر کسی رسالہ میں بھیج دیا کرو۔ کمترین نے تعمیل حکم کی۔ پھر کیا تھا مختلف مقامات سے مضامین کی طلبی شروع ہو گئی۔ اس طرح حضرت قلندر نے درد واثر کی شیرینی سے سرفراز فرمادیا۔ حضرت عطار نے خوب فرمایا ہے ؎

قدسیاں را عشق ہست و درد نیست
درد را جز آدمی در خورد نیست " [1]

درد کاکوروی کا کلام اور مضامین ہندوستان کے معتبر اور معیاری رسائل میں جگہ پانے لگے بنؔ ۱۹۲۰ء سے تقسیم ہند تک جو بھی رسالہ آپ کی نظر سے گزرے گا اس میں درد کی غزلیں، نظمیں، قطعات اور رباعیات اور مختلف موضوعات پر مضامین نظر آئیں گے۔ نیرنگ خیال، عالمگیر، غالب، پیمانہ، آستانہ، مولوی، الناظر، قندیل، ساقی نگار، اردو اور ہندوستانی غرض غرض یہ کہ اس دور کے تمام نمائندہ ادبی رسائل میں ان کی تخلیقات و نگارشات اشاعت سے ہمکنار ہونے لگیں۔

درد نے رام پور میں رہ کر شاعری کا آغاز کیا تھا یہاں ان کے بڑے بھائی رضی علی اخگر بھی مقیم تھے۔ شروع میں ان سے استفادہ کیا بعد میں باقاعدہ

---

[1] جذبات درد از درد کاکوروی صہ ۶

شریف الدین شریف کاکوروی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ شریف کاکوروی اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعرگوئی پر مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان کو صنائع بدائع اور فن تاریخ گوئی پر کافی عبور تھا۔ ان کے کلام میں تصوف، تغزل اور رنگینی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ زبان کے رموز و نکات سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا قلمی دیوان کتب خانۂ انوریہ کاکوری میں موجود ہے۔ نثر میں "ہمارے اخلاق" کے عنوان سے ایک رسالہ طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ ایک رسالہ حضرت علی مرتضیٰؓ کے مناقب میں لکھ رہے تھے جو تمام نہ ہو سکا۔ شریف صاحب کے چند اشعار پیش خدمت ہیں جو ان کی زباندانی اور قدرتِ کلام کے آئینہ دار ہیں ؎

جلوۂ سلطانِ خوباں دل میں ہے
ماہِ کامل اوج کی منزل میں ہے
غیر کا کیا دخل جب تو دل میں ہے
لطف خلوت کا ہمیں محفل میں ہے
ڈھونڈھتی پھرتی ہے مرگِ ناگہاں
جان مخفی خنجر قاتل میں ہے
دیکھیے کس کس کے جاگے ہیں نصیب
ایک مجمع کوچۂ قاتل میں ہے
کش مکش میں میکشوں کے پڑ گئی
دختِ رز بھی آج کس مشکل میں ہے
غم نہیں تاریکیٔ دل سے شریف
سنتے ہیں لیلیٰ اسی محمل میں ہے

رفت خزاں از چمن آمدہ دورِ صبا
یاسمن و درد را واشدہ بندِ قبا
نخل برآورد برگ، برگ برآورد گل
گل چو خیابان خلد، خلد چہ نزہت فزا
آتشِ گل در چمن آتشِ طورِ کلیم
بلبلِ ارنی نواز سوخت ازیں شعلہا
بادہ پرستی حرام یک بہ ایامِ گل
زاہدِ صد سالہ را توبہ شکستن روا
بادہ کشاں چار سو مست زمینا نہ ات
از من تشنہ دہاں جرعۂ مے نارو ا

ملازمت درد صاحب کو ہردوئی میں علامہ محسن کاکوروی کے صاحبزادہ نور الحسن نیر کاکوروی مؤلف نور اللغات نے بغرض تعلیم بلا لیا تھا۔ ان کا قیام بھی انھیں کے ساتھ تھا۔ اسی درمیان ان کے بڑے بھائی رضی علی اخگر نے انھیں رام پور بلا لیا۔ جو اس زمانہ میں بسلسلۂ ملازمت رامپور میں مقیم تھے۔ اس سلسلہ میں درد صاحب خود رقمطراز ہیں:۔

"کچھ عرصہ بعد علامہ محسن کے فرزند مولوی نور الحسن نیر (مؤلف نور اللغات) نے ضلع ہردوئی میں بلا لیا۔ وہاں بھی عربی وغیرہ کی تعلیم پاتا رہا کچھ دن کے بعد برادرِ مکرم مولوی رضی علی اخگر کی طلبی پر رامپور پہونچا۔"[۱]

رام پور علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ شعر و شاعری کے لیے فضا بہت سازگار

---

[۱] جذباتِ درد۔ از درد کاکوروی ص ۵۔

تھی۔ درد یہاں اپنی جولانی طبع دکھا رہے تھے ان کی شاعری عوام میں مقبول ہو رہی تھی۔ رام پور میں ان کی ملاقات وہاں کے معزز اشخاص سے ہوئی ان میں بعض شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ رام پور علم و ادب کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا شعر و شاعری کا ماحول تھا۔ سید اولاد حسین بلگرامی، ساحر سہسوانی، عبدالحمید میرٹھی شوق قدوائی اور شریف کاکوروی وغیرہ قادر الکلام شعرا یہاں موجود تھے۔ درد نے بہت جلد وہاں کے ادبی حلقوں میں اپنی جگہ بنالی۔ ان کو لوگ بڑی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ وہاں کے مشاعروں میں درد بڑی دلچسپی سے اور بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ قیام رامپور کے دوران علمی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"بمقام ریاست رام پور مشاعروں میں شرکت کا اتفاق ہوتا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ شاعری چولا بدل رہی تھی۔ حضرت حالی کی مقدمہ شعر و شاعری کی بڑی دھوم تھی۔ استاد کامل حضرت شریف کاکوروی نے اعتدالی نقطۂ نظر سے ایک مضمون لکھا تھا اور اس کی تائید میں ایک غزل بھی لکھی تھی۔ رام پور کے رسالہ 'نیرنگ' میں مضمون اور غزل دونوں چیزیں شائع ہو چکی ہیں[1]۔"

درد کاکوروی کو ان کے بڑے بھائی مولوی حکیم ظہیر علی نے ملازمت کی غرض سے اورنگ آباد بلایا۔ اس سلسلہ میں وہ خود لکھتے ہیں:

"اتفاق سے مجھے دکن کی آب و ہوا نے کھینچا تو برادر مکرم مولوی حکیم ظہیر علی نے بغرض ملازمت رام پور سے اورنگ آباد بلالیا۔"[2]

جب روزی روٹی کی فکر دامن گیر ہوئی تو درد نے رام پور کی وہ فضا

---

[1] جذبات درد ص ۶   [2] جذبات درد ص ۸   از درد کاکوروی

جہاں انھیں ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملا۔ اس فضا کو چھوڑ کر اورنگ آباد جانا پڑا۔ اورنگ آباد میں درد صاحب نے ملازمت کرلی۔ انھوں نے کب سے کب تک اور کس محکمہ میں ملازمت کی اور کس عہدہ پر فائز تھے یہ تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔ سخنوران کاکوری میں صرف اتنا درج ہے:

"وہ ۱۹۲۷ء میں رام پور سے اورنگ آباد (دکن) چلے گئے اور وہاں محکمہ امور مذہبی سے متعلق ہوگئے۔" [1]

مختلف شہروں میں قیام

درد صاحب کو اپنی زندگی میں ہندوستان کے کئی شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔

شروع میں وہ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ہردوئی گئے جہاں انھوں نے علامہ محسن کاکوروی کے صاحبزادہ نورالحسن نیّر (مؤلف نوراللغات) کے پاس قیام کیا۔ ان کی صحبت سے انھوں نے بڑا کسب فیض کیا۔ اس کے بعد اپنے بڑے بھائی رضی علی اصغر کے بلانے پر رام پور چلے گئے۔ رام پور شعروادب کا گہوارہ تھا۔ یہاں ہر وقت شعروشاعری کا چرچا رہتا تھا۔ استادانِ شعروفن وہاں موجود تھے۔ درد کے استاد شریف کاکوروی بھی ان دنوں رام پور میں ہی قیام پذیر تھے۔ وہ رام پور کے مشاعروں اور ادبی نشستوں میں برابر بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتے تھے۔

جس زمانہ میں درد صاحب رام پور میں مقیم تھے۔ وہاں شاعروں کی دو الگ الگ پارٹیاں تھیں۔ ایک طرف شوق قدوائی تو دوسری طرف محمود خاں محمود (شاگرد نواب داغ دہلوی) نے اپنے اپنے شاگردوں کو معرکہ آرائی کے لیے تیار

---

[1] سخنوران کاکوروی از نثار احمد علوی ص ۳۸۰۔

کر رکھا تھا۔ اس معرکہ آرائی نے چار بیتوں کے شاعروں کی بنیاد رکھی۔ چار بیتوں کے مشاعروں سے متاثر ہو کر خود درد نے بھی چار بیتیں لکھی ہیں۔ رام پور میں ایک نعت گو شاعر امن خاں صاحب تھے جو ہر سال اپنے گھر پر رمضان کے مہینہ میں اعلیٰ پیمانہ پر نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام کرتے تھے اور مشاعرے کے بعد افطار بھی کراتے تھے۔

ایک بار فانی بدایونی رام پور آئے۔ ان کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ درد نے بھی اس مشاعرہ میں اپنا کلام پیش کیا۔ ایک بار راز نہ ہو، باز نہ ہو اس قافیہ اور ردیف میں مشاعرہ ہوا۔ درد نے بھی اس زمین میں غزل کہہ کر سنائی اور جب وہ اس شعر پر پہونچے ؎

گر کے بیہوش کہیں عاشق جانباز نہ ہو
لیلیٰ حسن کہیں پردہ برانداز نہ ہو

تو فانی بدایونی نے بڑی داد و تحسین سے نوازا۔

رام پور میں شوق قدوائی کے بھائی اکبر بھی بہت خوش فکر شاعر تھے۔ شوق صاحب اور درد کے بھائی رضی علی اخگر میں بڑے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ اخگر سے ملنے کے لیے اکثر ان کے گھر پر آیا کرتے تھے۔ بیشتر علمی اور ادبی موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہ لوگ فنی نزاکتوں سے بخوبی واقف تھے۔ اردو اور فارسی شاعری کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ یہاں رہ کر درد صاحب نے اپنی شاعری کو جلا بخشی۔ ان استادان فن کی صحبتوں سے وہ برابر فیضیاب ہوتے رہے۔

درد صاحب نے رام پور کے علمی اور ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ ان کا کلام ہندوستان کے معیاری رسائل میں شائع ہونے لگا تھا۔ نیرنگ خیال، عالم گیر، نگار، الناظر، ہمایوں، آستانہ، مولوی،

قندیل، ساقی، اردو، اور ہندوستانی میں ان کے مضامین نثر و نظم بڑی خوبصورتی سے شائع ہوتے تھے۔ اسی درمیان ان کے بڑے بھائی حکیم ظہیر علی[۱] (اصل نام الطاف علی) نے بغرض ملازمت اورنگ آباد بلالیا۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ اورنگ آباد کی آب و ہوا میں بسر ہوا۔ وہ اورنگ آباد میں ۱۹۵۴ء تک رہے۔ حکیم ظہیر علی حاذق ہونے کے علاوہ نہایت خوش اخلاق اور ملنسار انسان تھے۔ اس لیے تمام اورنگ آباد ان کا گرویدہ تھا۔ مقامی شعراء کو جب یہ معلوم ہوا کہ درد حکیم صاحب کے چھوٹے بھائی ہیں اور شاعری کا بہترین مذاق رکھتے ہیں تو وہاں کے شعراء میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ عوام نے مشاعروں میں شرکت کی دعوت دی اور درد اپنا کلام وہاں کے مشاعروں اور ادبی نشستوں میں بڑے ذوق و شوق سے سنانے لگے۔ درد صاحب اورنگ آباد میں اپنے قیام اور وہاں کے شعراء و ادباء کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اتفاق سے مجھے دکن کی آب و ہوا نے کھینچا اور برادرِ مکرم حکیم مولوی ظہیر علی صاحب نے بغرض ملازمت رام پور سے اورنگ آباد بلالیا۔ اس زمانہ میں یہاں حضرت جلیلؔ (استاد نظام) کا بڑا شہرہ تھا۔ اورنگ آباد کے ایک معزز وکیل جناب میر ریاست علی عادلؔ جاگیردار جلیل صاحب کے شاگرد موجود تھے۔ ان کے شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ مرزا ممتاز علی مفتونؔ، مرزا ولایت علی صاحب ولایت، جناب مولوی عبدالخالق صاحب گراؔمی، جناب نعمت علی خاں نعمتؔ، جناب حبیب الرحمٰن صاحب حبیبؔ، جناب رشید احمد صاحب، خورشید صاحب خاورؔ (برادرِ حضرت عادلؔ)

---

[۱] حکیم الطاف علی کا تاریخی نام سید ظہیر علی تھا۔

جناب کاشف صاحب، جناب ولی محمد خاں صاحب ولی۔ ان
میں حضرت مفتوں اکثر مشاعرے کیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ
برائے کہنے والوں میں جناب احمد صاحب اورنگ آبادی اور جناب
احمد زماں صاحب سیفی بھی مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔
جناب حافظ ساجد علی صاحب عباسی کاکوروی یہاں اورنگ آباد
میں اپنے علم اور اپنی قابلیت کی وجہ سے ممتاز وکلاء میں شمار
کیے جاتے تھے۔ یہ اچھے مقرر ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ اس
زمانہ میں ان کا طوطی بول رہا تھا۔ اس لیے اکثر جلسوں اور کبھی
کبھی مشاعروں کے بھی یہی صدر ہوتے تھے۔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان
میں ان کا ایک مطبوعہ ناول "جفا و فا" دیکھنے کے قابل ہے۔
اس کے علاوہ رباعیوں کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔" [1]

قیام اورنگ آباد کی سرگرمیوں اور اپنے احباب کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے
ہیں:

یہاں اورنگ آباد کے چند خاص احباب کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ مثلاً
مولوی صوفی خواجہ حسن صاحب، مولوی احمد حسین خاں صاحب بی اے
مولوی صدرالدین صاحب، مولوی خواجہ محمد صاحب، غازی معین الدین
صاحب وکیل۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کی وجہ سے ہفتہ میں ایک بار
کسی بزرگ کے مزار پر یا ان میں سے کسی کے مکان پر "بھٹی"
ضرور گرم ہوتی تھی۔ یعنی یہ حضرات بطور خاص مثنوی مولانا روم
اور اس ناچیز کا صوفیانہ فارسی اور اردو کلام فرمائش کر کے

---

[1] جذبات درد ص ۹-۸ از درد کاکوروی

ترنم اور لحن سے بذوق وشوق اکثر سنتے اور لطف اٹھاتے تھے کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔"[1]

یہ وہ زمانہ تھا جب مولوی عبدالحق صاحب اورنگ آباد میں مقیم تھے اور اردو لغت کی تدوین کی فکر دامن گیر تھی۔ مولوی صاحب نے اپنی مدد کے لیے مولانا محوی کو بلا بھیجا اور وہ آگئے۔ اس زمانہ میں اورنگ آباد میں ایک سے ایک ادیب اور شاعر موجود تھے اور یہ لوگ سخن فہمی کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ مولانا محوی، انیس احمد انیس (فرزند جمیل) جناب صدیق الزماں وفا، تقی حیدر انوری، ولی حسن اثر، رضی الحسن رضی، مولوی منظور احمد، مولوی سید احمد ندوی، وہاج الدین شمیم، طیب صاحب، سکندر علی وجد، اعجاز علوی کاکوروی وغیرہ نے وہاں کی فضاؤں میں اپنے کلام سے نئی روح پھونک رکھی تھی۔ ان لوگوں کے اجتماع نے اورنگ آباد میں مشاعروں کا شاندار ماحول پیدا کیا۔ بڑی دلچسپی اور شان وشوکت سے مشاعرے ہونے لگے۔ مولانا محوی کی وجہ سے لوگوں میں اتنا ذوق پیدا ہوا کہ ریاست کے دوسرے علاقوں سے بھی لوگ مشاعروں میں شرکت کے لیے آنے لگے۔ ان لوگوں نے شاعروں کی ایک انجمن قائم کی جس کے سکریٹری درد صاحب مقرر ہوئے۔ اس سلسلہ میں درد لکھتے ہیں:

"آخر بزم شعراء قائم ہوئی اس کے صدر رضی الحسن رضی اور یہ ناچیز سکریٹری قرار پایا۔ ایک رسالہ "حسن خیال" بھی جاری کیا۔ ماہانہ مشاعرے کی غزلیں اور کچھ حصہ نثر کا بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ سب مولانا محوی کی وجہ سے ہوا۔ کیونکہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے وہ ایک ہنگامہ پسند شاعر ہیں جیسا کہ ان کے ایک قطعہ

---

[1] جذبات درد صـ۱۰۹ از درد کاکوروی۔

سے ظاہر ہے ؎

بزم سخن میں ایک نئی روح پھونک دی
دو دن جہاں یہ حضرت محوی ٹھہر گئے

اس ردیف و قافیہ میں اورنگ آباد ہی میں مشاعرہ ہوا تھا۔ مولانا محوی نے ایک شعر میں "بکھر گئے" کا قافیہ باندھا تھا۔ سب نے داد دی جب میں نے یہ شعر پڑھا ؎

بن بن کے اشک آنکھوں سے نکلے جو لخت دل
شیرازۂ حیات کے موتی بکھر گئے

تو محوی اور منظور صاحب نے کہا کہ درد صاحب یہ قافیہ تو آپ کا حصہ ہو گیا۔" ؎[1]

ہر مہینے پابندی کے ساتھ بڑے پیمانہ پر مشاعرے ہوتے رہے۔ اورنگ آباد میں دہلی کے ایک یادگار مشاعرہ ۱۹۲۶ء کی اورنگ آباد کالج میں نقل کی گئی۔ درد نے اس تمثیلی مشاعرہ میں عارف کا کردار ادا کیا تھا۔ رسالہ اردو جلد ہفتم میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ مولانا محمد سلیم عبداللہ لکھتے ہیں:۔

"۱۹۲۶ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے شاہکار" دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" جب اورنگ آباد میں انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام تمثیلی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔ ممثلین میں انھوں (درد) نے عارف کا کردار پیش کیا تھا۔" ؎[2]

کچھ دنوں کے بعد مولوی عبدالحق حیدرآباد اور محوی صاحب مدراس چلے

؎[1] جذبات درد۔ از درد کاکوروی۔ ص ۱۲-۱۱

؎[2] دیباچہ' درد کا درماں۔ از درد کاکوروی

گئے، تو شاعروں کا یہ مجمع منتشر ہو گیا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد آغا سروش اورنگ آباد کالج میں آ گئے۔ آغا سروش نے دوبارہ سرگرمی پیدا کی۔ وہ کبھی خود اپنے مکان پر مشاعرہ کرتے اور کبھی دوسرے دوستوں کو اپنے یہاں مشاعرہ کرنے پر مجبور کرتے۔ چنانچہ اورنگ آباد میں مشاعرے پھر سے زندہ ہو گئے۔ جناب عبداللہ نیرؔ اور جناب عادلؔ اپنے مکان پر اکثر مشاعرے منعقد کرتے۔ اسی زمانے میں کوکب حیدر آبادی بھی اورنگ آباد کالج میں آ گئے۔ انہوں نے مشاعروں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اس طرح دوبارہ مشاعروں میں لوگوں کی دلچسپی بڑھی درؔد اپنے دوست عبداللہ نیرؔ کے مکان پر ہوئے مشاعرے کی روداد یوں بیان کرتے ہیں۔

"ایک مرتبہ عبداللہ نیرؔ کے مکان پر مشاعرہ ہوا۔ کہاں تک ہے یہاں تک ہے، ردیف و قافیہ تھا۔ کترین کی غزل بہت پسند کی گئی۔ اس مشاعرہ میں حضرت مینا یار جنگ میناؔ اور حضرت کوکب بھی تھے۔ غزل کی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اسی وقت آغا شر وش نے یہ شعر موزوں کیا اور کوکب صاحب کی طرف مخاطب ہو کر کہا: ؎

تخیل عرش پر وسعت نظر کی آسماں تک ہے

ہمارے درؔد کی پرواز دیکھو تو کہاں تک ہے" [1]

اورنگ آباد میں ۱۹۴۱ء میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا۔ اس اسٹیشن سے درؔد صاحب کے مضامین اور کلام بھی نشر ہونے لگے۔ ۱۹۴۲ء میں جناب محمد صدیق نشرگاہ کے مہتمم ہو کر آئے۔ انہوں نے اورنگ آباد اسٹیشن سے

---

[1] جذباتِ درؔد ص۱۲۱۔ از درد کاکوروی۔

اسلامیات کے نشریہ کا نہایت مفید سلسلہ شروع کیا۔ ہفتہ میں ایک بار پیام الہٰی، ارشاداتِ رسولؐ، تاریخ اسلام اور مثنوی مولانا روم نشر ہوتی تھی۔ درد کاکوروی اس نشرگاہ سے وابستگی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"پیام الہٰی کا جناب مولانا صابر صاحب سے، ارشاداتِ رسولؐ کا جناب نعمان صاحب سے، تاریخ اسلام کا سید احمد ندوی سے اور مثنوی مولانا روم کی شرح کا تعلق اس ناچیز سے تھا۔" [1]

وہ مثنوی مولانا روم بڑے لحن سے اور جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ آواز میں بلا کا درد تھا۔ سننے والے پر براہ راست اثر ہوتا تھا۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جناب محمد صدیق صاحب کا تبادلہ ہو جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اورنگ آباد ریلوے اسٹیشن میں اکثر شعراء باہر سے مدعو کیے جاتے تھے۔ یہاں درد کی ملاقات ماہر القادری، حسرت موہانی اور مجاز سے ہوئی۔ ایک مرتبہ مجاز نے اورنگ آباد میں درد کے بارے میں کسی سے کہا کہ درد صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں اور جب میں شاعری کی ابتدائی منزل میں تھا تو درد صاحب کا کلام رسالوں میں دیکھتا اور پڑھتا تھا۔ درد صاحب اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

"حضرت مجاز سے لکھنؤ کے مشاعرے میں ملاقات ہو چکی تھی۔ انہوں نے یہاں ایک صاحب سے بیان کیا کہ درد صاحب پرانے کہنے والوں میں ہیں۔ جب ہم شاعری کی ابتدائی منزل میں تھے اس وقت ہم نے رسالوں میں ان کا کلام دیکھا اور پڑھا ہے۔" [2]

---

[1] جذبات درد۔ از درد کاکوروی ص ۱۶۔

[2] " " " ص ۱۷۔

حیدر آباد کے نواب ضیا یار جنگ فارسی کے خوش فکر اور خوش گفتار شاعر تھے۔ وہ جب بھی حیدر آباد سے اورنگ آباد آتے تو شعراء کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ وہ شعراء کو خصوصی طور پر فارسی میں شعر کہنے کی ترغیب دیتے تھے۔ اس طرح شعراء کو فارسی میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان کے یہاں یادگار مشاعرے ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ مشاعرے میں حضرت سروشؔ ضیا یار جنگ کی مدح میں کچھ اشعار کہہ کر لائے۔ اسی زمین میں دردؔ صاحب نے بھی غزل کہی وہ اس واقعہ کا یوں ذکر کرتے ہیں:-

"۱۲ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹۲۵ء کو رابعہ دورانی کے مقبرہ میں مفتی ضیا یار جنگ کی طرف سے غیر طرحی مشاعرہ ہوا۔ آغا محمد تقی شیرازی اورنگ آباد کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ یہ حضرت ضیاء کے پاس فارسی ذوق کی وجہ سے آیا جایا کرتے تھے اور اہل زبان ہونے کی وجہ سے خود جناب ضیاء ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ اتفاق سے یہ بھی اس مشاعرہ میں موجود تھے۔ جناب سروشؔ نواب صاحب کی مدح میں کچھ فارسی اشعار کہہ کر لائے تھے وہ انہوں نے سنائے جو سخن، ختن قافیہ میں تھے۔ جب سروشؔ اشعار سنا چکے تھے تو میں نے عرض کیا کہ کمترین نے بھی کچھ اشعار لکھے ہیں۔ نواب ضیا یار جنگ نے کہا سنائیے، تب میں نے یہ اشعار سنائے۔ ؎

جمال شاہد معنی است آب و تاب سخن
ضیائے جلوۂ حسن رخش نقاب سخن
بہ بیں کہ گرد فضائے سکوت جملہ ضیاء
بہ بام قلب بر آمد چوں آفتاب سخن

ضیائے آئینۂ دل کمال خود داری است
زحسن و عشق علوم است المتاب سخن
زحسن علم ضیا نقطہا چوں نجم زدند
زدرس عشق شدہ سینہ اش کتاب سخن
زبان حافظ شیراز و رنگ صائب بیں
کشیدہ است مگر خوب تر شراب سخن
ہزار شکر کہ یاران میکدہ مست اند
بہ بوئے بادۂ گلرنگ مشک ناب سخن
برنگ صائب و حافظ ضیا جمال آورد
بہ بیں بہ بحر کمالش دُرِ خوش آب سخن
بہ صد تجلی مرأۃ علم کرد ضیاء
جگر کباب سخن خون دل شراب سخن
زفیض مولوی معنوی بوقت سحر
نصیب درد دلم شد کلید باب سخن

جناب عیش کے والد مولوی سید عظمت اللہ صاحب مرحوم نے فرمایا ایک ہی خیال کو جناب سروش اور درد نے نظم کیا ہے مگر ان کا انداز بیان ہی کچھ اور ہے۔ بہرحال حضرت ضیاء، آغا تقی شیرازی، غرض تمام شعراء اور سخن سنج حضرات نے بہت داد دی۔،، [1]

آغا سروش کے تبادلے کے بعد مشاعرے پھر سرد پڑ گئے۔ اور اب مشاعرو ں

---

[1] جذبات درد۔ از درد کاکوروی ص ۱۹-۱۸۔

میں دوبارہ گرمی پیدا ہونے کی امید نہ رہی لیکن جنید صاحب (حضرت جلیل کے پوتے) اور مولوی حافظ نصیر احمد (فرزند امیر احمد علوی) کا خدا بھلا کرے ان لوگوں نے کافی دلچسپی لی اور یعقوب صاحب کے مکان پر مشاعرے شروع ہو گئے۔

ان مشاعروں کی یہ خصوصیت تھی کہ مصرع طرح کے بجائے قافیہ دے دیا جاتا تھا۔ اور شاعر کو یہ آزادی تھی کہ وہ جس ردیف، بحر یا وزن میں چاہے غزل کہے غزل کی زمین خود تیار کرے۔ مولوی شوکت صاحب اور جناب قیصر صاحب کی وجہ سے مشاعروں میں خاص لطف ہو جاتا تھا۔ انہی دنوں صدیق صاحب جائسی بھی اورنگ آباد کالج آ گئے تو مشاعروں کی تازگی میں اضافہ ہو گیا۔

ایک مرتبہ حافظ نصیر احمد اور جنید صاحب نے جگر مراد آبادی کو اورنگ آباد بلایا۔ وہ آئے۔ کالج میں مشاعرہ ہوا۔ قدیر لکھنوی بھی ان کے ساتھ تھے۔ ضیاء یار جنگ بھی یہاں موجود تھے۔ ان کے یہاں بھی مشاعرہ ہوا۔ اور رئیس الشعراء جگر مراد آبادی کے کلام سے سب لوگ محظوظ ہوئے۔ درد نے جگر کی غزل گوئی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا:

> "حقیقت یہ ہے کہ مغرب زدہ طبقہ نے غزل کو ختم ہی کر دیا تھا لیکن غزل نے جو دوبارہ زندگی پائی حضرت جگر ہی کے سر اس کا سہرا ہے۔"[1]

درد کاکوروی کو ایک بار آب و دانہ بمبئی لے گیا جہاں انھوں نے کچھ دنوں قیام کیا اور ان کے دوست نے ان کے کلام کے انتخاب کا مختصر سا مجموعہ شائع کر دیا جس کا نام "دردِ جگر" تھا۔

---

[1] جذبات درد۔ از درد کاکوروی۔

تقسیم ہند نے ہندوستان کی صورت ہی بدل دی ۔ ہندوستان میں افرا تفری کا ماحول پیدا ہوا ۔ فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے۔ ہر شخص ذہنی انتشار کا شکار تھا۔ بہت سے لوگ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے ۔ کاکوری سے بڑی تعداد میں لوگ پاکستان چلے گئے ۔ درد صاحب نے بھی ہندوستان سے ہجرت کا ارادہ کرلیا اور سقوطِ حیدر آباد کے بعد پاکستان (لاہور) چلے گئے۔ لاہور میں ان کے بھتیجے اور داماد نقی علی علوی مقیم تھے ۔ درد صاحب یہاں اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہنے لگے ۔

وہ لاہور میں ہمہ وقت ادبی مشغلوں میں مصروف رہتے تھے ۔ یہاں کی ادبی محفلوں اور شعری نشستوں میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے ۔ یہاں رہ کر انہوں نے سارا وقت تصنیف و تالیف میں صرف کیا۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی دوسرا کام نہیں تھا ۔ درد نے اس زمانے میں اپنے مضامین اور غزلیں نظمیں وغیرہ اخبارات و رسائل میں کثرت سے شائع کرائے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک باقی نہ رہا اور دو سال لاہور میں قیام کے بعد کراچی منتقل ہو گئے ۔

درد کاکوروی نے لاہور کو خیرباد کہنے کے بعد اپنی ساری زندگی کراچی میں بسر کی۔ یہاں وہ تا حیات صرف شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے ۔ کراچی میں بھی وہ اپنے داماد اور بیٹی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ یہاں کے مشاعروں میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔

کراچی میں مولانا ضیاء القادری، ملا واحد اور بہزاد لکھنوی سے انکے بہت گہرے تعلقات تھے۔ یہ حضرات درد کی شاعرانہ صلاحیتوں اور ادبی سرگرمیوں کی بڑی قدر کرتے تھے ۔ یہاں رہ کر انہوں نے اپنے مکان پر کتب خانہ بھی کھولا۔ ان کی زیادہ تر کتابیں ان کے کتب خانہ " دار التصنیف "

عزیز آباد کراچی سے شائع ہوئی ہیں۔ یہ ادارہ انہوں نے خود قائم کیا تھا۔ درد نے کراچی میں دو ادبی تنظیموں کی تشکیل بھی کی اور متعدد دوسری ادبی انجمنوں سے بھی وابستہ رہے۔ ان تنظیموں کے نام 'میخانہ ادب' اور 'بزم محسن' تھے۔ ہر ماہ ان انجمنوں کے اہتمام میں طرحی اور غیر طرحی نشستیں ہوتی تھیں ان میں کاکوری کے شعراء خصوصاً شریک ہوتے تھے۔

درد صاحب کو ۱۹۶۳ء میں ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ جس میں ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

"میں تو جب سے گرا ہوں معذور ہو گیا ہوں، یعنی لنگڑا کر چلتا ہوں۔ جب تک کوئی ساتھ نہ دے بس پر چڑھنا اترنا دشوار ہے۔" [۱]

انھوں نے قیام کراچی کے دوران ادبی حلقوں میں اپنا ایک ممتاز اور منفرد مقام بنا لیا تھا۔ وہاں کے لوگ نہ صرف ان کے کارناموں سے بلکہ ان کے اخلاق و عادات سے بھی بے حد متاثر تھے۔ درد صاحب پاکستان اردو اکیڈمی کے ممبر بھی رہے۔ راقم السطور نے درد کا ایک خط دیکھا جو پاکستان اردو اکیڈمی کے لیٹر پیڈ پر ہے۔ اس لیٹر پیڈ پر پاکستان اردو اکیڈمی کے صدر سید رفیق حسین بار ایٹ لاء کے علاوہ دیگر عہدیداران اور دیگر ممبران کے نام درج ہیں۔ ممبروں میں درد کا نام بھی شامل ہے۔

درد کاکوروی جہاں بھی رہے وہاں کی ادبی محفلوں، شعری نشستوں، اور مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ کچھ ایسے مشاعروں میں انہوں نے شرکت کی ہے جو یادگار رہیں گے۔ قیام اورنگ آباد کے دوران وہ مختلف شہروں

---

[۱] خط بنام طاہر محسن علوی مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۶۳ء۔

کے مشاعروں میں اپنا کلام پیش کرنے جاتے تھے۔ چونکہ قدرت نے انھیں ترنّم کی دولت بھی عطا کی تھی اس لیے سامعین بڑے شوق سے ان کا کلام سنتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں پونہ کے ایک مشاعرہ میں ان کو ایک تمغہ بھی ملا تھا۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان ان کی بہت سی غزلوں کے ریکارڈ بھی تیار کیے گئے۔ وہ رقم طراز ہیں :

"ہماری مختلف غزلوں کے ریکارڈ بھرے گئے۔ جن کے ابتدائی مصرع جات یہ ہیں:-

۱۔ کاگ شیشوں کے اڑے جاتے ہیں اتنا جوش ہے
۲۔ وہ کب درد دل کی دوا جانتا ہے
۳۔ نیناں ملا کے کہاں جاتے ہو یار
۴۔ جو آج ہم سے محبت جتائی جاتی ہے
۵۔ آج تم سے کیا کہوں میں کیا بلا کا درد ہے
۶۔ محمد وہ عالی ہے دربار تیرا۔
۷۔ آج غم کی آگ سے دل کباب ہوگیا۔
۸۔ یوں حالت دل آپ سے گو کہہ نہیں سکتے۔
۹۔ تیرِ نظر سے زخمی ہے یہ دل جگہ جگہ
۱۰۔ مرا دل نہ ہو کیوں فدائے محمدؐ
۱۱۔ یہ سب روپ میرے میں، بہروپیا ہوں
۱۲۔ ہم تو ساقی سے آنکھیں لڑائے جائیں گے۔" [۱]

ایک بار الٰہ آباد کے قاضی خورشید احمد صاحب نے ایک شاندار مشاعرے

---

[۱] جذباتِ درد۔ درد کاکوروی ص ۲۵۔

کا اہتمام کیا۔ قاضی خورشید استاد شاعر تھے۔ ان کے کئی شاگرد وہاں موجود تھے۔ اس مشاعرے کی صدارت کے فرائض درد صاحب نے انجام دیے۔ ۱۹۴۱ء کے ایک نمائشی مشاعرے میں مین پوری بلائے گئے۔ اس مشاعرے میں درد صاحب نے جگر مرادآبادی اور کشتہ قادری وغیرہ سے ملاقات کی۔ تقریباً تین سال مین پوری کی نمائش کے مشاعرے میں شریک ہوئے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ جہاں بھی گئے وہاں اپنے اخلاق و کردار سے احباب کا ایک حلقہ بنالیا۔

درد کے تلامذہ

درد صاحب بیک وقت شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کی بدولت بہت جلد استادانہ مقام حاصل کرلیا تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے پر عبور تھا۔ وہ علم عروض اور بلاغت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ علمی اور فنی نکتوں پر بڑی اچھی نظر رکھتے تھے۔ قدرت نے انھیں زودگوئی کی صفت بھی عطا کی تھی۔ ان کے کلام میں آ رہی آمد تھی۔ ان کی فنکارانہ اور استادانہ صلاحیت سے کسب فیض کرنے کے لیے ان سے متعدد شعرا نے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ درد صاحب اپنے شاگردوں کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"اورنگ آباد کے مشاعروں میں شرکت کی بنا پر ریاست حیدرآباد اور علاقہ انگریزی کے اکثر شعرا مثلاً حضرت شاہد صدیقی، اختر حیدرآبادی، نظر حیدرآبادی، قدیر ایلولوی، عاشق کسلادی، شفیق ایلوی، جب کبھی اورنگ آباد آتے ضرور ملتے۔ اکثر لوگ شاگرد بھی ہوئے چند حضرات کے نام یہ ہیں۔ سید شاہ قمرالدین صاحب مونگیری، محمد حسین صاحب، محسن، عبدالغنی غنی، کلام نوروی، یاد پونوی، اختر الزماں، ناصر اورنگ آبادی،

صغیر احمد بنگلوری، حکیم صاحب گلچیں کرہانی، موہن لال صاحب جگر،
حبیب محمد صاحب تجر، ساقی کاکوروی، زنطیر جالنوی، ظہیر فتحپوری،
ولی اللہ صاحب ضیائی، امین اللہ امین، بصیر اللہ بصیر، ؎۱
مذکورہ شاگردوں کے علاوہ درد کے بھتیجے احسان احمد احسان اور
نصیر احمد علوی بھی ان کے شاگرد تھے۔ نہ جانے کیوں انہوں نے اپنے
شاگردوں کی فہرست میں ان کے نام شامل نہیں کیے۔ جب کہ سخنوران
کاکوری میں احسان کاکوروی کو درد کا شاگرد بتایا گیا ہے۔ منشی اعجاز علی
کی کتاب "یادِ وطن" میں نصیر احمد علوی کا کہا ہوا قطعہ تاریخ طباعت شائع
ہوا ہے۔ ان کے نام کے ساتھ شاگرد درد کاکوروی لکھا ہے۔ احسان صاحب
پاکستان میں مقیم ہیں۔ درد کے دیگر شاگرد اب حیات ہیں یا نہیں، ان
میں ذوق شاعری باقی رہا یا ختم ہوگیا، ان کی ادبی خدمات کیا تھیں اور انہوں نے
اردو زبان و ادب کے فروغ میں کیا کام انجام دیا۔ اس سلسلہ میں مزید معلومات
فراہم نہ ہوسکیں۔ صرف احسان کاکوروی اور نثار احمد علوی کے بارے میں
معلومات فراہم ہوسکی ہیں۔

ساقی کاکوروی

ساقی کاکوروی کا اصل نام نثار احمد علوی تھا۔ وہ درد
کے بھائی حکیم بشیر احمد علوی کے صاحبزادے تھے۔
وہ بیک وقت حکیم، طبیب، ادیب، شاعر، صحافی اور مورخ تھے۔ اعلیٰ تعلیم
حلیم مسلم کالج کانپور میں حاصل کی۔ اور طب کی سند علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے
لی۔ تصنیف و تالیف کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ کانپور میں کچھ دنوں تک قومی
اخبار میں نیوز ایڈیٹر کے فرائض بھی انجام دیے۔ مشہور عرب سرجن ابوالقاسم

؎۱ جذبات درد۔ از درد کاکوروی صـ ۳۶۔

الزہراوی کی کتاب " التصریف " کے جراحت سے متعلق جز کو اردو میں ترجمہ کیا۔ اور "جراحت زہراوی" کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب طبی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔

وہ ۱۹۴۹ء میں پاکستان چلے گئے۔ ۱۹۷۰ء تک 'اخبار الطب' کے نائب مدیر رہے۔ افسوس کہ ۲۷ جولائی ۱۹۸۷ء کو وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ساقیؔ صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ "سخنورانِ کاکوروی" ہے جس نے انھیں حیاتِ جاوداں عطا کر دی۔ یہ کاکوری کی کئی سو سالہ علمی، ادبی اور شعری تاریخ ہے۔ اس کتاب میں قصبہ کے سیکڑوں ادیبوں، شاعروں، صوفیوں اور بزرگوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔

ساقیؔ صاحب نہایت سنجیدہ شاعر تھے۔ غزل کا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ اپنے جذبات کو بڑے سلیقے سے شعر کا پیکر عطا کیا۔ وہ اپنی شاعری میں بڑی سادہ اور سلیس زبان کا استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے ایک مثنوی 'ذکرِ غم' بھی لکھی ہے جو دراصل سرزمین کاکوری کا مرثیہ ہے۔ اس مثنوی میں ان کی وطن سے محبت اور فن دونوں عروج پر نظر آتے ہیں۔ اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ جن میں دنیا کی بے ثباتی کا عبرتناک منظر پیش کیا ہے۔ اور وقت نے ہم سے کیسی کیسی عظیم اور قد آور شخصیتوں کو چھین لیا ہے۔

کاظم[1] نے وہ راگ مست گائے
بے چین کو چین جس سے آئے
اس طرح شہ تراب[2] چمکے
جیسے کوئی آفتاب چمکے

---

[1] شاہ کاظم قلندر۔ [2] شاہ تراب علی قلندر۔

ساحر[1] کی غزل پھر ایسی چمکی
ہر شخص سے داد خاص لے لی
اشعار وہ ذوق[2] نے سنائے
جو محض علم و فن پہ چھائے
اللہ رے نطق[3] کی روانی
بھرتا تھا ہر ایک شخص پانی
اب تک نہ کسی نے ایسی پائی
محسن[4] کو جو خدا نے دی وہ شاہی
نادر[5] نے وہ طرزِ نو سکھایا
قرطاس پہ نقشِ نو جمایا
نیر[6] نے زبان کو سنوارا
الفاظ کے حسن کو ابھارا
اعجاز[7] نے شعر کیا سنائے
فرقت میں وطن کے گیت گائے
کچھ ایسی ہوا چلی وطن میں
جو کچھ تھا جل گیا چمن میں
ہر شاخِ چمن جھکی ہوئی ہے
ہر پھول کی بو اُڑی ہوئی ہے

۱؎ غلام مینا ساحر۔ ۲؎ محی الدین ذوق ۳؎ مقصود احمد نطق
۴؎ علامہ محسن کاکوروی۔ ۵؎ نادر علی خاں نادر۔
۶؎ نورالحسن نیر۔ ۷؎ اعجاز علوی کاکوروی۔

تاریک ہے اب فضائے گلشن
گل ہو گئے سب چراغ روشن
چہروں سے نقاب الٹ گئی ہے
قسمت تھی بنی پلٹ گئی ہے

دیگر نمونۂ کلام :

الٰہی بادِ حوادث سے یہ رہیں محفوظ
لہو سے ہم نے جلائے ہیں جو وطن میں چراغ
ہمارا عزم ہمارا ہے حوصلہ ساقیؔ
جلائے بیٹھے ہیں اس دورِ پر محن میں چراغ

اک زمانہ ہوا وطن چھوڑے
آج بھی اشکبار ہیں آنکھیں

تیری اک اک ادا تیرا اک اک قدم
یاد کرتے رہے عمر بھر راستے

شہر میں اب بھی ہے چرچا ساقیؔ مرحوم کا
ہر در و دیوار پر لکھا ہے دیوانے کا نام

احسان کاکوروی

احسان احمد احسان کاکوروی بھی ان (درد) کے شاگرد ہی نہیں بھتیجے بھی ہیں۔ وہ خوش فکر شاعر ہیں۔ انھیں کافی دنوں تک لکھنؤ میں قیام کرنے کا موقع ملا اور یہ وہاں کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں بڑی پابندی سے شرکت کرتے تھے۔ انہوں نے لکھنوی ماحول، تہذیب و ادب سے اثرات قبول کیے۔ درد کاکوروی سے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل کیا۔ نہایت شریف، خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں۔ آج کل نیشنل بنک آف پاکستان سے وابستہ ہیں۔ کراچی میں احسان جانے پہچانے شاعر ہیں۔ غزل ان کی محبوب صنف ہے۔ دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔

پاکستان میں احسان سے کاکوروی شعرا کا نام زندہ ہے۔ ان کی غزلیں اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے بھی ان کا کلام نشر ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں خلوص، دلکشی اور رنگینی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کی شاعری میں حساسیت، دردمندی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کا انداز بیان صاف اور سادہ ہے۔ زبان سلیس اور عام فہم ہوتی ہے۔ نمونۂ کلام پیشِ خدمت ہے:-

جنونِ عشق کی تشہیر رک سکے کیسے
میں چپ رہوں بھی تو تصویر بول اٹھتی ہے

مذاق اہل محبت پہ کس لیے الزام
ترا خیال بھی کچھ حوصلہ شکن ہے ابھی

کوئی کسی کے دل کو دُکھا کر
دہر میں کب خوشحال ہوا ہے

اس کا گماں احساں کسے تھا
اب کے جو اس سال ہوا ہے

سمجھ سکے گا وہاں کون عشق کی منزل
جہاں نقطۂ مرادِ دیوانہ پن نگاہ میں ہے

ہم غمِ گردشِ حالات کی رفتار کے ساتھ
کبھی میخانہ کبھی جام بدل دیتے ہیں
ہم ہیں وہ رند کہ اک گردشِ ساغر کے طفیل
چہرۂ گردشِ ایام بدل دیتے ہیں

دوستوں کے گریباں مت دیکھیے
پہلے دامن کو اپنے رفو کیجیے
سارے چہروں پہ تنقید فرما چکے
آئینہ اب ذرا روبرو کیجیے
مسکرانے لگیں پھول اشعار کے
نرم لہجے میں یوں گفتگو کیجیے

درد کی وفات

درد کاکوردی نے اپنی زندگی کی آخری سانس بھی اردو شعروادب کے لیے وقف کر دی تھی۔

وہ جب تک حیات رہے اردو کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی نعتیہ شاعری حُبِ نبی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چونکہ وہ خود صوفی مزاج کے مالک تھے اسلیے ان کا سارا کلام تصوف کی روشنی میں جھلکتا ہے۔ درد صاحب کو اللہ تعالےٰ نے موت بھی بہت آسان دی۔ اگرچہ ان کے گلے میں گھینگھا ہوگیا تھا۔ بعض لوگ اسے کینسر تصور کرتے تھے لیکن درد صاحب کی موت ایسی حالت میں ہوئی کہ بڑے بڑے صاحب ایمان، متقی اور پرہیزگار بھی رشک کریں۔

درد نے ۲۷ رجون ۱۹۷۲ء کو اپنے تمام کاموں سے فراغت حاصل کی۔ اور عصر کی نماز کے وقت سجدہ کی حالت میں اس دارِ فانی کو خیر باد کہا۔ میخانۂ ادب کی محفلیں اجڑ گئیں، بزم محسن ویران ہوگئی۔ ان کے انتقال کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی اور ہزاروں کی تعداد میں دوست، احباب، عزیز و اقارب، ادیب و شاعر ان کی تدفین میں شرکت کے لیے جمع ہوگئے۔ درد صاحب کو عزیز آباد کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ درد کی وفات پر مختلف شعراء نے قطعات تاریخ وفات کہے۔ چند پیش ہیں:

قطعہ تاریخ از نثار احمد ساقی

ہوا درد صاحب کا دنیا سے کوچ
جواب ان کا پانا یہ ممکن نہیں
درود اور سلام ان کے لب پر رہا
دمِ آخریں تھے وہ حق کے قریں
چلے ہیں انھیں باغ رضواں ملا
کہ وہ باغِ محسن کے تھے خوشہ چیں

نثاراں کی تاریخ کی فکر تھی
کسی نے کہا کیوں ہو اندوہگیں
وہ ہر وقت کرتے تھے ذکرِ نبیؐ
ملاان کو باغِ بہشت بریں۔ ؎
سنہ ۱۹۷۲ء

قطعات تاریخ از وحیدہ نسیم (پاکستان)

نمازِ مکرم بڑی دل نشیں | بنی موت جس کی حیات آفریں
جھکائی تھی سجدہ میں ایسے جبیں | اٹھا سر تو پہنچا خدا کے قریں
جو رضواں نے ہاتف سے پوچھا پتہ | کہا ہنس کے باغِ بہشت بریں
۱۹۷۲ء

معرفت سے بھرا تھا جام ترا
کون جانے تھا کیا مقام ترا
ایک سجدہ تھا زندگی کا حصول
کیا قعود اور کیا قیام ترا
لب پہ سُبحانَ رَبیّ الاعلیٰ
بن گیا آخری پیام ترا
کہا تاریخ نے خدا کے حضور
درد اٹھا ہے لے کے نام ترا
۱۳۹۲ھ

؎ سخنورانِ کاکوری ص ۲۸۳ از نثار احمد علوی ساقی۔

قطعۂ تاریخ از شاہ کوکب القادری

جاں بحق شد چو میر نذر علی
کرد کوکب سنِ وفات ارقام
بود جذبات درد تصنیفش
میکدۂ معنی صوفیانہ کلام
سیرتِ قادری دعا شورا
در ادب بر زبانِ خاص و عام
با دو حرف اولیں ز اسم جلیل ۳۳
درد کاکوروی بہشت مقام

۳۳ + ۱۳۵۹ = ۱۳۹۲ھ

باب سوم

درد کاکوروی بحیثیت غزل گو

(الف) درد کاکوروی کی غزلوں میں لکھنوی غزل گوئی کے اثرات

(ب) غزلوں میں تصوف کے مضامین

(ج) درد کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ

غزل اردو کی سب سے محبوب اور سب سے معتوب صنف سخن ہے۔ غزل کی مقبولیت و محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری تہذیب کی روح غزل میں اور غزل کی روح ہماری تہذیب میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ غزل فن ہی نہیں فسوں بھی ہے۔ شاعری ہی نہیں تہذیب بھی ہے۔ وہ تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کی تصدیق کرتی ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی نگاہ میں غزل ہماری شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ایک جگہ صنف غزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے اسے بڑی کافر صنف سخن کہا ہے یہ خیال اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ صنف غزل کی بنیادی خصوصیات اس میں یکجا کر دی گئی ہیں، غزل نے ہر دور میں دلوں کو براہ راست متاثر کیا ہے۔ عوام و خواص، امیر و غریب، مرد عورت، جوان بوڑھے سب کے دلوں کو مسحور کیا ہے۔ صوفیوں کی محفلوں میں ہنگامے برپا کئے ہیں۔ رندوں اور قلندروں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔ شیخ و برہمن سے چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ اس نے ہر قسم کے موضوعات و خیالات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ حسن و عشق، گل و بلبل، شمع و پروانہ، جام و پیمانہ، ساقی و میخانہ کے ساتھ ہی اخلاقی، اصلاحی، سماجی، سیاسی اور صوفیانہ مضامین کے توسط سے زاہدوں اور پاک بازوں کے دلوں میں مسند نشین ہونے کے ساتھ سماج اور معاشرے کی عکاسی کا کام بھی کیا ہے۔ غرض یہ کہ ہر فرد غزل سے متاثر ہوا ہے۔

غزل جس قدر مقبول و محبوب ہوئی اسی قدر نقادوں کے عتاب کا شکار بھی ہوئی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنفِ ادب قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ غزل کسی جمالیاتی تاثر کو پیدا نہیں کرتی۔ عظمت اللہ خاں جیسے نئی پود کا بھرم رکھنے والوں نے غزل کی گردن زدنی کا فتویٰ جاری کر دیا۔ جوش ملیح آبادی بھی غزل کے سخت مخالف تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ غزل شاعری کے بنیادی مقاصد کی تکمیل نہیں کرتی ایسی صنف کو ختم کر دینا چاہیئے۔ جوش نے غزل گوئی کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں انھوں نے مذکورہ خیالات کا برملا اظہار کیا ہے۔ اپنے وقت میں حالؔی کو بھی غزل بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی تھی اور انھیں اس بے وقت کی راگنی کو گانا قطعی پسند نہیں تھا اس لئے وہ غزل کی مخالفت کرتے تھے تمام تر مخالفتوں کے باوجود غزل کو شاعری کی بڑی اہم صنف سمجھتے تھے اور اس کی ہمہ گیری، آفاقیت اور جذباتی اثر اندازی کا انھیں احساس تھا۔ اسی لئے وہ "شعر" کے اس ناپاک دفتر کو عفونت میں سنڈاس سے بدتر سمجھنے کے بعد بھی اس میں معنوی اصلاح کے خواہاں تھے۔ غزل کا یہ کمال ہے کہ غزل کا جادو مخالفینِ غزل کے سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔

غزل کی اہمیت، افادیت، اور محبوبیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی رقم طراز ہیں۔

> غزل صرف عشق و محبت ہی تک محدود نہیں ہے اس میں ان موضوعات کے علاوہ بہت کچھ ہے۔ اس میں ان موضوعات کے ساتھ ساتھ زندگی کے متنوع پہلوؤں کا احساس اور

---

۱ غزل کا فن مشمولہ اردو زبان اور ادب ــ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صفحہ ۴۴

اس کی ترجمانی بھی موجود ہے۔ فلسفیانہ گہرائیاں بھی ہیں سماجی اور معاشرتی احساس بھی ہے گویا اس کے موضوعات زندگی ہی کی طرح وسیع، ہمہ گیر اور متنوع ہیں۔ صنف غزل کی عظمت کا راز تو اس میں ہے کہ وہ ان تمام پہلوؤں کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال کر اور ایک ایسے رنگ میں رنگ کر پیش کرتی ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے یہ رنگ وہ ہے جو "غم دنیا" کو بھی "غم معشوق" بنا دیتا ہے۔؎۱

درد کی غزلوں میں لکھنوی غزل گوئی کے اثرات

دکن اور دہلی میں غزل کے ارتقا کی تکمیل لکھنؤ میں غزل گو شاعروں کی مرہونِ منت ہے اگرچہ اس زمانے میں دبستانِ لکھنؤ کے وجود پر شک و شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمدن و تہذیب کے ایک شہری مرکز کی حیثیت سے لکھنؤ کی جو انفرادیت ہے اس کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ یہاں اردو نثر نگاری اور شاعری دونوں کے بڑے کارناموں کو ان کی انفرادی خصوصیات کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ناسخ اور ان کے شاگردوں سے لے کر بیسوی صدی میں عزیز لکھنوی، آرزو لکھنوی اور مولانا علی نقی صفی لکھنوی اور ان کے شاگردوں تک فنکاروں کی ایک مسلسل زنجیر ہے جس نے زبان اور بیان کی تراش خراش اور اس کے استعمال میں جدت، ندرت، اور تازہ کاری پیدا کرنے کی جدوجہد کی ہے یہی لکھنؤ اور لکھنوی غزل گوئی کا امتیاز ہے اور اسی کو دبستانِ لکھنؤ

؎۱ غزل اور مطالعۂ غزل ـــــ عبادت بریلوی ـــ

کہا جاسکتا ہے۔ لکھنوی اہلِ زبان کا لسانی رویہ ایسے دور میں وجود میں آیا جب اردو کا ارتقاء ہو چکا تھا اور ایک جداگانہ زبان کی حیثیت سے اس کے وجود پر کوئی شک نہیں کیا جاسکتا تھا لکھنؤ کے اہل زبان نے ایک تاریخی مرحلے میں ماضی کے تمام ادبی سرمائے کا جائزہ لے کر اس میں سے ایسی بہتر روایات کو قبول کیا جو اردو زبان کے مزاج سے ہم آہنگ تھیں۔ انھوں نے عظیم ادبی روایات کے اس بڑے حصّہ کو بڑی ہمت سے رد کیا جو اردو کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھا، لکھنؤ میں اہلِ زبان نے اردو کو شیرینی، لطافت اور خود اعتمادی عطا کی۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ میں غزل گوئی کا ایک امتیازی رنگ پیدا ہو گیا تھا جو زبان کی تراش خراش پر غیر معمولی توجہ دینے کا نتیجہ تھا یہی دبستانِ لکھنؤ تھا جس کے اثرات پورے ہندوستان پر پڑے اور وہ اردو کا ایک بڑا ادبی مرکز تسلیم کیا جانے لگا۔

شمالی ہند میں اور خاص طور سے اودھ کے علاقوں میں تاریخی اہمیت کے حامل قصبات نے لکھنؤ کے اس اثر کو قبول کیا ان قصبات میں شعر و سخن، صحافت و لغت نگاری، طنز و مزاح کا چرچا کوئی نئی بات نہ تھا کیونکہ صدیوں سے اودھ کے یہ قصبات علم و عرفان کا مرکز تھے۔ اور یہاں مدرسہ و خانقاہ کی فیض رسانی میں کوئی فرق نہ تھا۔ بڑے بڑے عالم ان قصبات میں پیدا ہوتے رہے اور صدیوں تک انھوں نے اپنے گھروں میں بیٹھ کر درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ قصبات میں خانقاہوں کا کردار بھی بڑا اہم رہا ہے خانقاہیں درس و تدریس کے مرکز کا بھی کام دیتی تھیں اور یہاں صوفیائے کرام کے زیر سایہ شعر و سخن کی بھی آبیاری ہوتی تھی۔ سماع کی محفلوں کا سلسلہ عوام کے شعری ذوق کی تربیت بھی کرتا تھا صدیوں تک قصبات میں علمی زبان عربی اور تہذیبی زبان فارسی رہی لیکن

اہلِ قصبات نے اپنی زمین سے اپنا ناطہ کبھی نہیں توڑا۔ انھوں نے ملا داؤد، ملک محمد جائسی اور قاسم شاہ دریاآبادی جیسے باکمال اودھی شاعر بھی پیدا کئے اور شاہ محمد کاظم قلندر کاکوروی، برکت اللہ پیمی اور شاہ تراب علی قلندر کاکوروی جیسے شاعروں کو بھی جنم دیا۔ اودھی اور برج کو شاعری کی زبان کی حیثیت سے استعمال کرنے کا یہ سلسلہ قصبات میں اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ کھڑی بولی کا دور دورہ نہیں ہوا تھا کھڑی بولی میں ریختہ کے نام سے جو ابتدائی شاعری کی گئی ہے اس کا ایک بہت مشہور نمونہ وہ غزل ہے جو کاکوری کے شیخ کمال الدین سعدی سے منسوب ہے سعدی یہ چشتی مسلک کے مینائی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد حضرت رکن اللہ صدیقی حضرت شاہ مینا کے مرید جانشین شیخ سعد خیرآبادی سے وابستہ تھے اور اسی لئے انھوں نے اپنے فرزند کے نام میں سعدی بہ طور نسبت شامل کیا تھا۔ مخدوم شیخ سعد خیرآبادی خود بھی فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ سعدی سے منسوب اس مشہور زمانہ غزل کے حسب ذیل اشعار مختلف تذکروں میں سے پائے جاتے ہیں ؎

تشنہ چوں دیدم بر رخش گفتم کہ ریہ کیا دیت ہے
گفتہ کہ درائے باورے اس شہر کی یہ ریت ہے

اے مرد ماں شہر شما کتنی بر مائی یہ دیت ہے (کذا)
ہے ہے نمی پرسد کسے یہ دیسیا ما ریت نہے

ہمنا تمہن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے

دو نین کے گھر میں پھروں رو دنسے بخوں دل کو بھروں
پیش سگِ کو یت دھروں پیاسا نہ جائے بیت ہے

سعدی بگفتہ ریختہ در ریختہ دُر ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

کھڑی بولی کے عروج نے رفتہ رفتہ اردو کی جداگانہ زبان کی شکل اختیار کرلی تو اس کا اثر اودھ کے قصبات پر بھی پڑا لیکن سب سے زیادہ اثر اس وقت پڑا جب لکھنؤ اردو کے ایک مستند مرکز کی حیثیت سے تاریخ کے صفحات پر نمودار ہوا۔ لکھنؤ کی تہذیب و تمدن اور زبان کو تمام قصبات میں بھی ایک مثالی نمونے کی حیثیت سے قبول کیا گیا اور وہاں بھی شعر و سخن کی وہی زبان مستند قرار پائی جو اہل لکھنؤ بولتے اور استعمال کرتے تھے۔

جب ۱۸۹۱ء میں درد کاکوروی کی ولادت ہوئی تو لکھنؤ کی غزل گوئی اپنے معراج کمال پر پہنچ چکی تھی اور اس کا بھرپور اثر پورے شمالی ہند پر تھا۔ لکھنؤ کی زبان مستند ترین زبان بن چکی تھی شمالی ہند اور خاص طور پر اودھ میں شعر و سخن کا ماحول اہل لکھنؤ کے زیر سایہ تھا۔ درد صاحب نے کاکوری کے علمی اور ادبی ماحول میں آنکھ کھولی تھی ان کے والد حکیم حبیب علی علوی، چچا حکیم محب علی نیر شاگرد مرزا غالب اور دادا حکیم مشتاق علی بھی شاعر تھے۔ گویا شاعری انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ کاکوری میں ہر طرف شعر و سخن کا چرچا تھا اور آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ درد نے ماحول کا اثر پوری طرح قبول کیا اور بہت کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ یہ مشقِ سخن آگے چل کر ان کے کمالِ فن تک پہنچی۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں وہ مقامی نشستوں اور مشاعروں میں ایک شاعر کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے اور دوسری دہائی میں ان کا کلام ملک کے معتبر ادبی رسائل اور اخباروں میں اشاعت سے ہم کنار ہونے لگا تھا۔ لکھنؤ میں غزل گوئی کا یہ دور ایک نئی تبدیلی کا دور تھا۔ صفی لکھنوی نے "دائرہ ادبیہ" کے نام سے

ایک تنظیم قائم کر کے اصلاح زبان و بیان کی ایک نئی تحریک شروع کر دی تھی اور لکھنؤ میں شاعروں کی وہ نئی نسل سامنے آنے لگی تھی جو دبستانِ لکھنؤ کی بعض روایتوں کو منفی اور ناپسندیدہ قرار دے کر ان سے اپنا دامن چھڑا رہی تھی۔

درد کاکوروی نے بھی فطری طور پر شاعروں کی اس نئی نسل سے اپنا ناطہ جوڑا ان کی غزل گوئی میں اسی لئے لکھنؤ کی بے عیب اور شستہ زبان پوری طرح جلوہ گر ہے۔ لیکن لکھنوی غزل گوئی کی وہ معاملہ بندی اور زبان کا وہ دور از کار استعمال نہیں ہے جو شاعری میں ابتذال پیدا کرتا ہے اور سوز و گداز سے سراسر محروم ہے۔ درد کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ عربی اور فارسی کے عالم ایک صوفی اور مذہبی مزاج کے فن کار تھے۔ انھوں نے اپنے اس مزاج کا اظہار غزل گوئی سے زیادہ دوسری اصناف سخن میں کیا ہے لیکن ان کی غزل پر بھی یہی مزاج حاوی ہے۔ درد کی غزل گوئی زبان و بیان کی صفائی کے ساتھ ساتھ معنویت بھی رکھتی ہے۔ اس پر تصوف کے اثرات غالب ہیں۔ ان کے عشق کا سارا تصور ایسا ہے کہ وہ مجازی عشق نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ یہ وہ عشق حقیقی ہے جو صدیوں سے فارسی شاعری میں ایک بڑے رجحان کے طور پر چلا آرہا تھا۔ اردو میں بھی اس کی طاقتور لہر ہمیشہ رواں دواں رہی۔ درد کے یہاں تمام روایتوں کا احترام ملتا ہے جس میں نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے عشق الٰہی اور وحدت الوجود جیسے مضامین کو بھی لکھنؤ کی رواں اور سلیس زبان میں ادا کیا۔ ان کے پاس آمد ہی آمد ہے اور یہ ان کی غزل گوئی کا بہترین وصف ہے۔ اس معاملے میں وہ استادانِ لکھنؤ کے نقش قدم پر چلتے ہیں ان کی ایک غزل ع "لیلائے محبت ایک ہی ہے دیوانے بدلتے رہتے ہیں" میں ان کی زبان اور ان کے ذہن دونوں کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے ۔۔

توحید کا ساقی ایک ہی ہے میخانے بدلتے رہتے ہیں
جب ہوتی ہے وحدت کی کثرت پیمانے بدلتے رہتے ہیں
ہے شمع حقیقت ایک مگر پروانے بدلتے رہتے ہیں
لیلائے محبت ایک ہی ہے دیوانے بدلتے رہتے ہیں
آغاز تمنا کی سرخی قسمت کی ہے زرّیں پیشانی
انجام محبت کی خاطر افسانے بدلتے رہتے ہیں
وحشت سے جہاں آباد ہوا ہر ذرہ دشت تنہائی
یوں رقص میں کہتا قیس چلا ویرانے بدلتے رہتے ہیں
یا عشق بدلتا رہتا ہے عشاق کی حالت دنیا میں
یا عشق کی صورت عالم میں دیوانے بدلتے رہتے ہیں
مستانہ ادائیں ان کی ہیں یا ہر رات نئی ہر روز نئی
ساقی کی نشیلی آنکھوں کے پیمانے بدلتے رہتے ہیں
کیفیت جذب اہلِ دل کب ایک طرح پر رہتی ہے
وحشت میں دو عالم کی صورت دیوانے بدلتے رہتے ہیں
یا قیس بدلتا رہتا ہے ویرانوں کی حالت منزل میں
یا قیس کی حالت منزل میں ویرانے بدلتے رہتے ہیں
ہے ان کی معطر ہر محفل ہے ان کی منور ہر منزل
ہو درد کی جاں یا درد کا دل کاشانے بدلتے رہتے ہیں

انہوں نے ایک دوسری غزل میں تصوف کے جو مضامین نظم کئے ہیں اس سے ان کے صوفیانہ مزاج کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے اس خیال کے ثبوت میں درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں ۔

جب شمعِ محبت لے کر خود رونقِ محفل آجائے
پھر عشق کی منزل سہل ہے جب حسن کا خود دل آجائے
روشن مہِ کامل منزل میں بے پردہ ہے لیلیٰ محمل میں
کیوں نور نہ برسے محفل میں جب رنگ پہ محفل آجائے
اس بحرِ جہاں کی گہرائی بیشک ہے مجھے تسلیم مگر
تیراک[1] کوئی کامل ہو اگر ہر موج پہ ساحل آجائے
تو کھینچ مجھے لے جاتا ہے میں پاکے تجھے کھو جاتا ہوں
مجذوب ترا ہو جاتا ہوں جب جذب کی منزل آجائے
رہ رہ کے نہ ہو کیوں دردِ جگر جب سوز بڑھا دے شمعِ سحر
پروانۂ الفت خود لے کر پروانۂ محفل آجائے
اے درد کوئی اس سے پوچھے چھپنے کی ضرورت ہی کیا ہے
بے مثل اگر ہے حسن میں وہ بے پردہ مقابل آجائے

لکھنؤ کی سادہ اور پرکار شیریں زبان میں درد نے اپنی غزل کو معرفت اور حقیقت کے اعلیٰ تصورات سے مزین کیا ہے اور کہیں کہیں مجاز کے پرلطف شعر بھی کہے ہیں اور حسن و عشق کی حکایت بھی بیان کی ہے لیکن ہر غزل میں لکھنؤ کی تراشیدہ زبان جلوہ گر ہے مثال کے طور پر ان کی درج ذیل غزلیں پیش ہیں ؎

جو ذکرِ فصلِ بہاراں کیا کیا نہ کیا

---

[1] زندہ اشیاء کے لئے پیراک استعمال ہوتا ہے اور مردہ کے لئے تیراک اس لئے پیراک ہونا چاہیئے۔ انگریزی میں بھی پیرنے اور تیرنے کیلئے Swiming اور Float مروج ہے۔ مخمور کاکوروی

تو خارِ نسیم کو گلستاں کیا کیا نہ کیا
کہاں ہوا ہے ابھی تار تارِ دامنِ گل
تو ہم نے چاکِ گریباں کیا کیا نہ کیا
نقوشِ صفحۂ دل پر ابھی کہاں ابھرے
تو رنگ اور نمایاں کیا کیا نہ کیا
جراحتیں تو ہیں ممنونِ دیدۂ پُر آب
دل و جگر کو نگہباں کیا کیا نہ کیا
صبا کے دوش پہ خوشبو کا کارواں ہے ابھی
تو ہم نے عیش کا ساماں کیا کیا نہ کیا
کہاں نگاہ تمنا سنبھل سکی اب تک
جہانِ عیش کو ویراں کیا کیا نہ کیا
جلا چکا ہوں جو رنج و خوشی کی لذت کو
حیات و موت نے احساں کیا کیا نہ کیا
ابھی تو قلب میں آلائشیں ہیں حسرت کی
کسی نے درد کا درماں کیا کیا نہ کیا

اسے کوئی یہاں لایا تو ہوتا — کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا
مجھے تم کہہ کے ٹھکرایا تو ہوتا — کبھی تربت پہ تو آیا تو ہوتا
ہر اک غمزے پہ تو دل مانگتا ہے — کبھی یہ کہہ کے شرمایا تو ہوتا
مری حالت ذرا دیکھی تو ہوتی — دلِ مضطر کو بہلایا تو ہوتا
میں دیتا یا نہ دیتا جان اے درد — انھوں نے مجھ سے فرمایا تو ہوتا

تجلی جلوۂ نورِ سحر کی — فقط تصویر ہے چاکِ جگر کی
یہ بیتابی مرے دردِ جگر کی — کرامت ہے ترے حسنِ نظر کی
دو عالم کی جو تھی تاریک بستی — تمہارے حسن نے ہی جلوہ گر کی
ہے الفت میں کبھی کام آ ہی جاتا — شرر دل کا خلش دردِ جگر کی
یہ آنکھیں تر رہیں اور قلب محزوں — تمنا ہے یہی دردِ جگر کی
نہیں تابِ جمالِ یار ہرگز — کہے دیتی ہے بیتابی نظر کی
جو دل ہے ہم کنارِ حسن و مستی — نہ پوچھو وسعتیں کیف و نظر کی
سراپا کیف کی تصویر ہے ایک — مکمل خامشی اس بے خبر کی

مرا دل لے گئی اے دردؔ آخر
فدائے حسن رنگینی سحر کی

خود اپنے علم میں لایا گیا ہوں — کہ باغِ سبز دکھلایا گیا ہوں
حسیں دنیا میں کیوں لایا گیا ہوں — کہاں جھگڑوں میں الجھایا گیا ہوں
یہ کیفیت ہے اس کی جستجو کی — جہاں کھویا وہیں پایا گیا ہوں
عناصر کے کھلونے دے کے ہمدم — میں اس دنیا میں بہلایا گیا ہوں
رہا ہوں تب تخیل میں کسی کے — ہزاروں بار جب آیا گیا ہوں
فلک ہے یا جبینِ حسنِ فطرت — کہاں قسمت سے چمکایا گیا ہوں
دکھائے دیکھئے کیا گردشِ چشم — ابھی تو دور میں لایا گیا ہوں
بہشتِ کیف پرور ہے یہی آنکھ — میں بہکا کب ہوں بہکایا گیا ہوں

اسی سے دردؔ پایا نام آخر
کہ بیدردی سے تڑپایا گیا ہوں

تری قسم ہے جہاں دل بنا دیا تو نے
تصورات میں کامل بنا دیا تو نے

فلاسفہ بھی نہ جس کا بتا سکے مطلب
مجھے وہ معنیٔ مشکل بنا دیا تو نے

جو حسن و عشق کے طوفان دل سے ٹکرائے
تجلیات کا ساحل بنا دیا تو نے

وہ بے نیاز ہیں اہل نیاز جن کو کیا
ہیں اہل دل جنہیں بے دل بنا دیا تو نے

جو ذرے عشق کے اور حسن کے بچے ان کو
کہیں یہ درد کہیں دل بنا دیا تو نے

دیا جو دردؔ تو اس کے لئے خلش بخشی
خلش کو عشق کا حاصل بنا دیا تو نے

(ب) غزلوں میں تصوف کے مضامین

اپنی تعلیم و تربیت اور ماحول کے اعتبار سے دردؔ کاکوروی کو تصوف سے واقفیت اور لگاؤ دونوں ہونا چاہیئے تھے لیکن وہ واقعی صوفی ہیں وہ کاکوری میں قلندریہ سلسلے کی مرکزی خانقاہ سے باقاعدہ وابستہ تھے ان کا خاندان بھی اسی خانوادہ میں بیعت تھا۔ خانقاہِ کاظمیہ کئی سلاسل کا فیض جاریہ ہے یہ قادری سلسلے کا بھی ایک مرکز ہے تصوف اور عرفان کے تاریخی، علمی اور نظریاتی پہلوؤں پر خانقاہِ کاظمیہ کے باکمال بزرگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ دردؔ کاکوروی بھی تصوف اور عرفان کے بنیادی نظریات اور مباحث سے پوری طرح واقف تھے ان کو صوفیانہ اصطلاحات کا علمی پس منظر پوری طرح معلوم تھا تصوف کے نظریات اور اہم مباحث پر انھوں نے خود بھی کئی کتابیں سپردِ قلم کی ہیں جن میں "حقائق تصوف" قابل ذکر ہے اس میں انھوں نے اپنے مسلک کی ترجمانی کی ہے اور شیخ الاکبر محی الدین ابن عربی کے مسلکِ وحدت الوجود کا دفاع کرتے ہوئے توحیدِ وجودی کا پورا نظریہ بیان کیا ہے۔ عربی فارسی میں تصوف کی

بنیادی کتابوں کا پورا سرمایہ ان کی نظر میں تھا اس لئے ان کی صوفیانہ شاعری میں قال سے زیادہ حال کا رنگ ہے انھوں نے تصوف کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے جو ان کی نظموں غزلوں رباعیات اور قطعات کی شکل میں بکھرا ہوا ہے لیکن غزل میں ان کا یہ رنگ ہر رنگ پر غالب ہے. غزلوں میں ان کے عشق اور حسن کا تصور مجاز کے پردے میں حقیقت کا بیان ہے اور ان کی غزل گوئی کا غالب رنگ یہی صوفیانہ رجحان ہے.

اپنی غزلوں میں انھوں نے تصوف کے بنیادی نظریات کی وضاحت کرنے والے بہت سے شعر کہے ہیں یا پھر معرفت اور سلوک کے مضامین کو شعر کا پیکر عطا کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی غزل گوئی میں فکر و خیال کی گہرائی آگئی ہے.

صوفیانہ شاعری میں ایک بنیادی مضمون وحدت الوجود کا ہمیشہ اپنا جلوہ دکھاتا ہے کوئی صوفی شاعر وجودی فلسفے یا نظریے کو نظر انداز نہیں کرتا یہ اس کے بنیادی جذبے سے تعلق رکھنے والا اصول یا ضابطہ ہے جو اس کے شعور میں ہمیشہ روشنی پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اور ساری دنیا کو ایک ہی وجود کے مختلف مرتبے سمجھتا ہے اور شاعری میں وحدت الوجود کا ایسا اظہار عام طور پر ملتا ہے اور ان شاعروں نے بھی وحدت الوجود کے مضامین نظم کیے ہیں جن کا درحقیقت تصوف سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس پر یہی پھبتی صادق آتی ہے کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" لیکن درد کا کوروی تو خانقاہی دنیا سے تعلق رکھنے والے فرد ہیں ان کی الوجود کائنات کی سب سے بڑی سچائی کی شکل میں نظر آتا ہے بڑی کیفیت سے انھوں نے وحدت الوجود کی ترجمانی کی ہے ؎

کوئی مجھ میں چھپا ہے میں نہیں ہوں
وہی یہ کہہ رہا ہے میں نہیں ہوں

میں حق کا بھید ہوں وہ بھید میرا
یہ غیروں نے کہا ہے میں نہیں ہوں
زبانِ حال سے کہتی ہے خوشبو
خدا مجھ میں بسا ہے میں نہیں ہوں
وہی فعال ہے دونوں جہاں میں
وہی کن کہہ رہا ہے میں نہیں ہوں
عطا کی بو لینے کی جس نے طاقت
وہی خود بولتا ہے میں نہیں ہوں
وہی مطلق ہے جو آزادیوں سے
مقید خود ہوا ہے میں نہیں ہوں
مری ہستی ظہورِ خیر و شر میں
بہانہ یار کا ہے میں نہیں ہوں

درد کاکوروی نے اپنی غزلوں میں اسی فلسفہ کی عکاسی کی ہے ان کے پاس حسن و عشق کا جو تصور ہے وہ ان دونوں کو مجاز قرار دیتا ہے وہ اپنی شاعری سے درحقیقت تصوف کے تصورات کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن غزل کے پیرائے میں ان کی یہ تبلیغ خشک اور بے مزہ بالکل نہیں ہے بلکہ اس میں پوری طرح شعریت موجود ہے ؎

نہ منتہا کی خبر ہے نہ مبتدا معلوم
خود اپنے آپ سے واقف نہیں تو کیا معلوم
کہاں سے قافلے آئے سرائے فانی میں
یہاں یہ کب سے ہے یہ سلسلہ خدا معلوم

بقا اگرچہ ملے گی ہمیں فنا ہو کر
مگر فنا کی حقیقت نہ ہے بقا معلوم

ان کی شاعری میں تصوف ایسا گھل مل گیا ہے کہ ان کے بیشتر اشعار تصوف کے تصورات و نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں ان کی کوئی اور تعبیر نہیں ہو سکتی ۔

یہ حیرت ہے میں کون ہوں اور کیا ہوں
نہ میں ابتدا ہوں نہ میں انتہا ہوں
میں آخر ہوں کس کی محبت کا کشتہ
کہ جل جل کے بس آگ میں جی رہا ہوں
نہ میں لفظ ہوں اور نہ مضمون ، نہ معنی
نہ مطلب ہوں اپنا نہ میں مدعا ہوں
ہوں فانی تو پھر شور ہستی یہ کیوں ہے
جو باقی ہوں تو کس لئے پھر فنا ہوں

بیسویں صدی میں شاید ہی کسی شاعر نے اپنی شاعری اور خاص کر غزل گوئی کو تصوف کے ایسے اظہار کا ذریعہ بنایا ہو جس طرح دردؔ نے اپنی شاعری اور غزل گوئی کو بنایا ہے ان کے یہاں غزل کے عام مضامین بہت کم ہیں اور جب انھوں نے روایتی شعر کہے ہیں تب بھی ان کا زاویۂ نظر ایک صوفی کا رہا ہے ۔ اپنی غزل گوئی بلکہ پوری شاعری کے سلسلہ میں دردؔ کاکوروی نے اپنے نظریئے کو خود اپنے ایک مضمون " ہم اور ہماری شاعری " میں آج سے تقریباً ساٹھ برس پہلے قلم بند کیا یہ مضمون کاکوری اخبار سنہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا ہے اس وقت نئی شاعری کی روایت مغرب کے

زیر اثر اردو میں رائج ہو کر مقبول ہو چکی تھی اسی کے ساتھ ساتھ غزل گوئی کی تمام کلاسیکل روایتوں کے علم بردار غزل کی جانب سے کبھی مدافعانہ اور کبھی جارحانہ جنگ لڑ رہے تھے۔ درد نے اس وقت بڑا متوازن راستہ اختیار کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ عاشقانہ رنگ میں شاعری نہ کیجئے لیکن مدعا یہ ہے کہ اس میں بھی کوئی مفید بات پیدا کیجئے نئی روح پھونکئے ایسے مضامین لکھئے جو پایۂ تہذیب سے گرے نہ ہوں کچھ کہئے مذاقِ سلیم کے مطابق کہئے خلاصہ یہ کہ نہ اس دائرے کو اس قدر تنگ کیجئے کہ تہذیب کی چار دیواری ہمارے جذبات کے لئے قید خانہ بن جائے اور نہ اس قدر وسیع کہ کوئی معیار ہی قائم نہ رہ سکے" [۱]

اسی لئے ان کی غزل گوئی میں حسن وعشق کا رنگ بھی ہے لیکن ایسی تمام علامتوں کو انہوں نے مجاز سے پاک کر کے حقیقت کی سمت موڑ دیا ہے۔ درد کاکوروی کے زمانے میں لکھنؤ میں شاعری کا ایک رجحان غالب پسندی کی شکل میں موجود تھا۔ لکھنؤ میں یہ رنگ جلال اور اسیر کے زمانے سے رائج چلا آرہا تھا۔ صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی اور عزیز لکھنوی نے اس کو برقرار رکھا۔ لکھنؤ کے اساتذۂ سخن ایک ہی سانس میں اپنے آپ کو میر اور غالب کا پیرو کہنا پسند کرتے تھے درد کاکوروی اردو غزل کی کلاسیکل روایت کا اعادہ کرنے پر زور دیتے ہوئے اپنے مذکورہ مضمون میں رقمطراز ہیں۔

---

۱ کاکوری اخبار ۱۵ر جولائی ۱۹۳۱ء

"جدید مذاق کی طرف توجہ دلانے سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ غزل "صرف فارسی کی موزوں ترکیبوں کا نام رکھ لیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ مفید اور نادر بات پیدا کرنے میں ہم کو کسی رنگ کا پابند نہ ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ عام لوگ فارسی ترکیب نہ سمجھنے کی وجہ سے میر کا رنگ اور خاص لوگ اپنی لامحدود قابلیتوں کے باعث غالب کا رنگ پسند کرتے ہیں لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم عام طبقے کا خیال ہی نہ کریں اور جو کچھ کہیں وہ صرف غالب ہی کے رنگ میں کہیں:

انصاف تو یہ چاہتا ہے کہ ہم خاص و عام دونوں طبقے کی دلچسپی کا سامان مہیا کریں جس سے شاعر کی قابلیت اور قادر الکلام ہونے کا ثبوت بھی مل سکے۔ امیر اور داغ کے رنگ میں کہتے وقت ہم کو اس بات کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے کہ ہمارا کلام پایۂ تہذیب سے گرا ہوا نہ ہو بوسہ و کمر کی تعریف سے ہمارے مضامین بالکل پاک ہوں زبان کا عمدہ نمونہ ہو سکے اس میں کوئی مفید بات بھی ہو غالب کے رنگ میں کہتے وقت ہم کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ فارسی ترکیب کے الفاظ باہم کوئی مناسبت بھی رکھتے ہوں تاکہ شعر مہمل نہ ہو جائے[۱]

درد کاکوروی نے غزل کی زبان میں یہی درمیانی راہ اختیار کی ہے۔ وہ زبان و بیان کی سادگی اور سلاست کا پورا خیال رکھتے ہیں مگر جب انھوں نے

---

[۱] کاکوری اخبار ۱۵ جولائی ۱۹۳۱ء

تصوف کے فلسفہ، تصورات، نظریات اور اسرار و رموز کی نقاب کشائی کی ہے تو ان کی زبان فطری طور سے غزل میں بھی بدلی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کی بنیادی وجہ سلوک و معرفت کی مخصوص اصطلاحوں کا استعمال ہے۔ ایک ہی غزل میں زبان کا یہ رنگ بھی ہے ؎

کیوں نہ بیمار محبت کی دوا پردے میں ہو
جب کہ حسن و عشق کا یوں سامنا پردے میں ہو
گو بظاہر ہو جفا لیکن وفا پردے میں ہو
آشکارا درد ہو لیکن دوا پردے میں ہو

یہ غزل گوئی کا عام رنگ ہے لیکن اسی غزل میں یہ شعر بھی ملتے ہیں ؎

جامۂ ہستی کا پردہ اس لئے حق نے دیا
گو بظاہر ہو فنا لیکن بقا پردے میں ہو
ظاہری آنکھوں سے حق اس واسطے روپوش ہے
امتحاں حق الیقیں کا جا بجا پردے میں ہو

اسی غزل کا مقطع سادہ اور سلیس عرفانی شعر ہے ؎

پوچھنا ہی کیا ہے ایسے ماہ رو کا دردؔ جو
ذرے ذرے سے عیاں ہو پھر چھپا پردے میں ہو

ظہور حق کی جلوہ گری صوفیوں کو کائنات کے ذرے ذرے میں نظر آتی ہے لیکن وہ اس کو ایسا پوشیدہ اور پنہاں بھی دیکھتے ہیں کہ ان کے دل و دماغ میں اضطراب پیدا ہوتا رہتا ہے اور آخر وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ حق کا ظہور تو ہر جگہ ہے لیکن ظہورِ کامل کا مشاہدہ عرفانی آنکھوں کی بساط سے باہر ہے۔ دردؔ نے اس مقطع میں جو کچھ کہا ہے وہ بے ساختہ ان کے ہم عصر

لیکن ان سے بزرگ شاعر علامہ آسی غازی پوری کا یہ مشہور شعر یاد دلاتا ہے ؎

بے حجابی یہ کہ ہر ذرے میں جلوہ آشکار
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

مدتوں پہلے سودا نے بھی اس عرفانی کیفیت کا اظہار اپنے ایک شعر میں کیا تھا ؎

بے نمود اور نمودار کہیں دیکھا ہے
اس قدر سادہ و پرکار کہیں دیکھا ہے

درد کاکوروی بھی اس روحانی کشمکش کا برابر تذکرہ کرتے ہیں اور پوری شاعرانہ لطافت کے ساتھ ؎

ہو کے کہتا ہے بے نقاب وہ یار
کہ وہ ہے یارِ بے نقاب کہاں
سب کو در پردہ اپنی ہی ہے تلاش
چھوٹ سکتا ہے پھر حجاب کہاں
درد تو نور آفتاب ہے جب
یہ نہ کہہ پھر ہے آفتاب کہاں

ان کی غزلوں میں زبان سادہ اور صاف ستھری ہے لیکن چوں کہ ان کی فکر ہمیشہ ایک صوفی کی فکر اور ان کا خیال ہمیشہ ایک صوفی کے خیال کا جامہ پہن کر رونما ہوتا ہے اس لئے ان کی غزل کی تہہ داری اور معنویت کو اس وقت تک نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے جب تک قاری تصوف کے بنیادی افکار سے آشنا نہ ہو اور صوفیانہ شاعری ہی نہیں بلکہ خالص تصوف کی مخصوص اصطلاحوں کو استعمال کیا یا پھر خالص صوفیانہ تصور

ان کے پاس شعر کا لباس پہن کر آتے ہیں اپنی فکر و نظر کی اسی شدت کی وجہ سے درد کی عارفانہ شاعری نے کہیں کہیں غزل مسلسل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایسی غزلوں میں ایک اندرونی وحدت ہوتی ہے اور ان کو پڑھ کر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے ایک ایسی ہی غزل مسلسل اپنے بیان کی تائید میں پیش کرتا ہوں جس میں جذبہ اور خیال کی مکمل وحدت ہے ؎

روح کہتی ہے ترے حکم کی آواز ہوں میں
قلب کہتا ہے کہ واللہ ترا ساز ہوں میں
فاش الفت نے کیا جس نے وہی راز ہوں میں
الغرض کن جسے کہتے ہیں وہ آواز ہوں میں
رونما ہو مری ہستی کی حقیقت کیسا ہے
ہاں کرشموں سے ترے پردہ برانداز ہوں میں
پھر اسی طرح ستارے مجھے پیغام الست
دم بدم تیرے لئے گوش بر آواز ہوں میں
کثرت سوز سے ہے مائل مرکز تر ہنر
ساز وحدت کی وہ نکلی ہوئی آواز ہوں میں
شاہ موسیقی نے ہے شہر بدر جس کو کیا
درحقیقت اسی مظلوم کی آواز ہوں میں
درد حق پردۂ ہستی سے صدا دیتا ہے
جس طرح تو ہے مرا راز ترا راز ہوں میں

خود ان کو بھی اس صوفیانہ رنگ کا پورا احساس ہے اور وہ اس رنگ پر نازاں بھی ہیں اپنے ایک مقطع میں خواجہ میر درد کے صوفیانہ رنگ کا اعتراف کیا ہے ؎

داد دیں کیوں کر نہ تجھ کو آج اربابِ سخن
رنگ ہے تیری غزل میں دردؔ خواجہ میر کا

ان کے اس تخلص کو اختیار کرنے کا واقعہ بھی ان کی افتادِ طبع کی خبر دیتا ہے پہلے وہ ممتازؔ اور ساغرؔ تخلص کرتے تھے خواجہ میر دردؔ کے اسم گرامی سے اور ان کے تخلص سے ہم آہنگی کا سبب یہ ہوا کہ قلندریہ سلسلہ کے ایک بزرگ ان پر مہربان ہو گئے اور انھوں نے یہ ارشاد فرمایا کہ دردؔ تخلص اختیار کرو۔ ابتدا سے ان کی شاعری عارفانہ شاعری بن گئی تھی غزل گوئی کے میدان میں بھی دراصل انھوں نے عاشقانہ شاعری نہیں کی ہے بلکہ عارفانہ شاعری کے پاکیزہ نمونے پیش کئے ہیں ان کی عارفانہ شاعری برائے شعر گفتن نہیں ہے بلکہ حیات و کائنات کے بارے میں ان تصورات کا اظہار ہے جو ان کے پاس صرف عقیدہ ہی نہیں ایمان و یقین کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں وہ جو کچھ دیکھتے ہیں ایک عارفِ کامل کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ راہ حقیقت کے ایک ایسے سالک کا بیان ہوتا ہے جو اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے ؎

جو کوئی آیا ہوا خانہ خراب
پی کے نکلا ہو کے مستانہ خراب

یہ دعا مستوں سے ہے ساقی رہے
تو سلامت تیرا میخانہ خراب

یہ نگاہِ مست جس نے دیکھ لی
ہو گیا مخمور مستانہ، خراب

تجھ پہ شیدا کچھ اکیلا میں نہیں
اک جہاں ہے تیرا دیوانہ خراب

درد کیا جس نے بھی دیکھا یار کو
ہو گیا مجنون و دیوانہ خراب

اردو غزل میں تصوف کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عام طور پر غزل گو شاعروں نے کثرت میں وحدت کے شاعرانہ مضمون کو طرح طرح کے پیرایوں میں ادا کیا ہے ان کے پاس تصوف کے نظریات اور تصورات کا کوئی گہرا شعور نہیں ملتا درد کا کوروی اس سلسلہ میں ممتاز و منفرد ہیں کہ وہ خود میدان تصوف کے شہ سوار ہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف شاعری کی زبان ہی میں نہیں کہتے بلکہ تصوف کی زبان میں کہتے ہیں اور اس زبان کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو غزل کی زبان میں کبھی شامل نہیں رہے ہیں لیکن درد کے یہاں ان الفاظ کا شعوری استعمال غزل میں ہوا ہے۔ ایک لفظ تجلّی کو لے لیجئے جو غزل میں بہت استعمال ہوا ہے لیکن اسے ایک شاعرانہ تصور سے زیادہ اہمیت نہ ملی جب کہ درد نے اس لفظ تجلّی کو اس کے پورے صوفیانہ پس منظر میں استعمال کیا ہے۔

بے پردہ یہ کہتی ہے حقائق کی تجلّی
کونین کی تخلیق کو باطل نہ سمجھنا

اس شعر میں انھوں نے تجلّی کو اس کے اُس مفہوم میں استعمال کیا ہے جو وحدت الوجود مسلک میں تجلّی کا ہے یعنی یہ تجلّی جو کونین میں بے پردہ نظر آتی ہے وہ زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے کہ کونین کی ساری تخلیق بے مقصد نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس میں حقیقت کا جلوہ دکھائی دے عام طور پر غزل کے کسی شعر میں تجلّی کا لفظ تو شاعر نظم کر سکتا ہے لیکن اس کو حقائق کی تجلّی کی حیثیت سے پیش کرنا صرف درد جیسے حقیقی صوفی شاعر سے

ممکن ہے وہ اسی بنیادی تصور کو اپنی غزل میں بار بار دہراتے ہیں ؂

اک چیز نہیں عابد و معبود میں حائل

ہاں منزل مقصود کو منزل نہ سمجھنا

وہ یہ سبق بھی دیتے ہیں کہ حسن و عشق سب خالص مجاز ہیں اور حقیقت ان دونوں سے ماورا ہے۔ حسن و عشق کی کشمکش سے بھی چھٹکارا ضروری ہے کیوں کہ یہ ایک طرح کی قید ہے ؂

عشق کی کائنات کیا حسن کا التفات کیا

دونوں سے بے نیاز ہو قید مقام سے گذر

ان کو حسن کا جمالیاتی شعور ہے لیکن وہ حسن کو ایک علامت سمجھتے ہیں کوئی جداگانہ حقیقت نہیں ؂

تصور یہ کسی کے حسن کا ہے یا مرے دل میں

کسی نے کر دیا ہے جلوہ گر مہر درخشاں کو

وہ اس حسن بے مثال کا کوئی ایک ہی روپ نہیں دیکھتے کیوں کہ یہ حسن ازلی ہے جو ہزار پہلو رکھتا ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہے ؂

تیرا جلال ہے الگ، تیرا جمال ہے الگ

ملتی نہیں تری ادا جلوۂ مہر و ماہ سے

درد کاکوروی کی نگاہ میں انسان صرف اک تماشائی نہیں ہے بلکہ وہ خود اس تماشے کا ایک حصہ ہے جو حسن ازل کے جلوؤں سے ہو رہا ہے ؂

کس کے جمال کا ہے یہ افسانہ آدمی

کس کے خیال کا ہے پری خانہ آدمی

انسان کی اپنی ذات کے اندر یہ پری خانہ درد کاکوروی کے نزدیک اس لئے

سجا ہوا ہے ؏

ہے جلوۂ شہود کا پیمانہ آدمی

وہ عشق کی سرمستی کو انسانی وجود میں شامل سمجھتے ہیں اور یہ بھی حسنِ ازلی کا ایک کرشمہ ہے انھوں نے قرۃ العین طاہرہ کی ایک مشہور فارسی غزل کے رنگ میں ایک غزلِ مسلسل کہی ہے ؎

ہجر میں اپنے نوحہ گر کس نے کیا ہے؟ یار نے
کوچہ بکوچہ در بدر کس نے کیا ہے؟ یار نے
کس نے دیا ہے یار نے حسن میں جذب اسقدر
عشق میں اتنا شور و شر کس نے دیا ہے؟ یار نے
کس نے دیا ہے یار نے سوز و گداز و دردِ دل
جلوؤں سے دل کو جلوہ گر کس نے کیا ہے یار نے

درد نے قرۃ العین طاہرہ کی ستانہ وار غزل سے متاثر ہو کر فارسی زبان میں بھی اسی طرز کی ایک غزل کہی ہے جس کا مفصل جائزہ مقالے کے آئندہ باب میں پیش کیا جائے گا اسی رنگ کا اردو میں ایک شعر ان کی قادر الکلامی کا بہترین نمونہ ہے ؎

پی کے شرابِ معرفت پھرتے ہیں مست ہو کے ہم
خانہ بہ خانہ در بہ در دشت بہ دشت کو بہ کو

تصوف ایک مکمل فکری نظام ہے اور درد کا گوروی اس فکری نظام سے مکمل طور پر واقف اس کے عالم اور عارف ہیں اسی لئے ان کی غزلوں میں معرفت کی یہ شراب جھلکتی ہے وہ جس کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں وہ صرف شاعری نہیں ہے بلکہ ان کے شعور کا اظہار ہے وہ تصوف کے شعوری ترجمانی کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی خود آگہی میں نہ کسی دوسرے کو شک ہو سکتا ہے اور نہ کبھی شک و شبہ

کی کوئی پرچھائیں ان کی آگہی اور یقین پر پڑتی ہے اپنے وجود کی معرفت میں ان کو اپنے وجود کی رفعت و بلندی کا پورا احساس ہے اور وہ اس پہ نازاں ہیں بہت کیف و مستی کے عالم میں درد نے فرمایا ہے ؎

خود آیا سیر کو خود ہی تماشا بن کے جاتا ہوں
وہ آئینہ ہوں اپنا آپ جلوہ بن کے جاتا ہوں

مری دنیا کا ہر ذرہ ہے دشتِ طور کا یہ داں
کسی کی بے حجابی کا میں جلوہ بن کے جاتا ہوں

ملائے بحر جس قطرے کو ہو جائے سمندر وہ
بحمد اللہ وہ قطرہ ہوں دریا بن کے جاتا ہوں

درد کاکوروی نے اپنی غزل گوئی میں شعوری طور پر اس عارفانہ انداز کو اختیار کیا تھا اس کے لئے یہ روایتی تصوف کا شاعرانہ اظہار نہیں ہے بلکہ اس میں عارفانہ شاعری کی پوری روح موجود ہے اردو میں ایسی مقصدی غزل گوئی کی مثالیں شاذ و نادر نظر آتی ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ میر درد اور شاہ نیاز احمد بریلوی اپنے وقت کے بہت بڑے صوفی بزرگ اور مرشد تھے ان دونوں بزرگ شاعروں نے بھی اپنی شاعری میں تصوف کی ترجمانی کی ہے اور اصغر گونڈوی نے آخری زمانۂ حیات میں غزل کی روایت سے عارفانہ پہلو کو اپنی غزلوں میں سمیٹا تھا لیکن درد کاکوروی کا میدان سب سے الگ ہے انھوں نے غزل ہی نہیں پوری شاعری میں مرکزی خیال وحدت الوجود مسلک کے بموجب وہی رکھا جو ایک باعمل صوفی شاعر رکھ سکتا ہے یہی ان کی انفرادیت ہے کہ وہ وجودی مسلک کے ترجمان ہیں اور ان کی شاعری سے صرف یہی ایک خوشبو پھوٹتی ہے جس نے ... دبستانِ لکھنو

میں انھیں ایک نمایاں مقام ملنا چاہیئے اس لئے کہ اس دور میں جب کہ صناعی، آورد اور لفظی بازی گری کا بازار گرم تھا انھوں نے اپنے لئے اس سے الگ راہ تلاش کی اور فکر وفن سے اردو غزل کے دامن کو وسیع و وقیع بنانے کی کوشش کی۔

(ج) درد کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ

درد کاکوروی کی غزل گوئی بیسویں صدی کے دو تہائی حصہ کو محیط ہے اس مدت میں اردو غزل پر اچھے اور برے وقت دونوں ہی پڑے وہ ادبی حلقوں میں مقبول بھی ہوئی اور ناقدوں کی بارگاہ میں معتوب بھی ہوئی بڑی شدت سے غزل کی افادیت کا انکار کیا گیا اس کی موت کا اعلان ہوا اسی کے برعکس اردو غزل نے ایک نئی کروٹ بدل کر اپنی سخت جانی کا ثبوت دیا اور کسی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل موت کے کنارے تک پہنچ گئی تھی لیکن وہ بال بال بچ گئی اس نے نئی زندگی کا جامہ پہن لیا مگر درد کاکوروی کی غزل گوئی پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ وہ غزل کی جس روایت سے وابستہ نظر آتے ہیں وہ خود اتنی پر قوت و توانا تھی کہ تمام آندھیوں میں چراغ بن کر جلتی رہی وہ عروج و زوال سے اس لئے متاثر نہیں ہوئے کہ وہ ابتداء سے لکھنؤ میں غزل کی نئی تحریک سے وابستہ تھے جو بغاوت یا انحراف کی جگہ ایسی تبدیلی کی علمبردار تھی جو ماضی سے اپنا رشتہ جوڑے رکھے حال کے تقاضوں کو پورا کرے اور مستقبل کے لئے بہت کچھ چھوڑ جائے۔

درد کاکوروی نے اپنے نظریۂ عشق کی وضاحت اپنی غزل گوئی کے دور شباب میں کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا تھا کہ بہت زیادہ قدامت پسندی کا رویہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے ان کو زمانے کے تقاضوں سے

ہونے والی اس تبدیلی کی اہمیت اور طاقت کا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں انھوں نے بڑی صفائی اور بے باکی سے اعتراف کر لیا تھا کہ ہوا کا رخ بدل گیا ہے، اور تبدیلی کے اس عمل کو قبول کرنا ہی بہتر ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے لکھا تھا کہ:

> موجودہ تحریک بہت زوروں پر ہے اب یہ کسی طرح رکنے کی نہیں اس کے علاوہ عربی کی ایک مثل ہے "در ما والدھر کیف دار" یعنی زمانہ جس طرف پھرے اسی طرف پھر جاؤ زمانہ بدل گیا زمانہ کا مذاق بدل گیا اس لئے ہم کو بھی جدید رنگ سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ ہم کو غزلوں کے ساتھ نیچرل نظمیں بھی لکھنا چاہیئے جہاں تک ہو نئی تلاش نئی بندش، نئے مناظر، نئے خیالات نظم کریں تاکہ ہم بھی میدان ترقی میں کسی سے پیچھے نہ رہیں مگر اس کا خیال رہے جو کچھ کہیں اس میں واقعیت ہو، نرا مبالغہ ہی نہ ہو بلکہ اس میں سچے جذبات ہوں نظموں کی طرف توجہ دلانے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ غزل کہنا موقوف کر دی جائے۔ نہیں غزل ضرور کہی جائے لیکن بے معنی فارسی جملوں کی موزوں ترکیب کا نام غزل نہ ہو۔ روزمرہ کی پابندی کی جائے اگر فارسی ترکیب سے کام لیا جائے تو الفاظ اور ترکیبیں غیر مانوس نہ ہوں۔ غزل کو ہوا و ہوس اور صرف عاشقانہ مضامین کے لئے محدود نہ کر دیا جائے بلکہ اس کو ہر قسم کے مہذب اور دلچسپ مضامین سے زینت دی جائے۔" [۱]

درد کاکوروی نے اپنے اسی شعری نظریے کی روشنی میں تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی

---

[۱] ہم اور ہماری شاعری مشمولہ کاکوری اخبار ۱۵ر جولائی ۱۹۳۱ء

کی ہے وہ نظم کے میدان میں بھی رہے ہے رباعیات وقطعات بھی کہے اور دوسرے شعراء کے کلام پر نہایت موثر اور کامیاب تضمینیں بھی کہیں۔ ان کی غزل گوئی ہمیشہ ان کے صاف ستھرے ذوق کی غمازہی انھوں نے غزل کو ہوا وہوس کے مضامین سے پاک رکھنے اور غزل کو صرف عاشقانہ مضامین تک محدود نہ کرنے پر جس طرح زور دیا تھا اسی طرح اس پر عمل بھی کیا ان کی غزل گوئی میں وسعت اور ہمہ گیری ہے یہ ان کی غزل گوئی کا امتیازی پہلو ہے ان کے عہد شباب میں لکھنؤ کا انداز سخن بھی تبدیلی کے اسی عمل سے گذر رہا تھا۔ صفیؔ لکھنوی اور نوجوان عمر کے شاعروں نے زبان و بیان کی اصلاح کی سرگرم تحریک کو عام کر دیا تھا۔ دردؔ کا کوری اپنے ان ہم عصر لکھنوی شاعروں سے مکمل طور پر ہم آہنگ تھے جو اصلاح زبان و بیان کی اس تحریک میں بلاشبہ ادب برائے زندگی کا کوئی تصور شامل نہیں تھا اور یہ ادب برائے ادب کے نظریئے سے زیادہ قریب تھی خود دردؔ نے بھی اس دور میں اسی پہلو پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا کہ جن مضامین کو متقدمین باندھ چکے ہیں اگر وہ باندھے جائیں تو کم سے کم ان کا انداز بیان جدید ہو تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا جائے مگر اس قدر نہیں کہ شعر چیستاں بن جائے۔

دردؔ کی غزل گوئی میں ان کے اس نظریئے کی پوری پابندی نظر آتی ہے اور یہی ان کا امتیازی وصف ہے ان کی غزل گوئی کا پچاس سالہ دور وہ ہے جس میں غزل بڑی بڑی تبدیلیوں کا شکار ہوئی ہے۔ ترقی پسندی اور پھر جدیدیت نے غزل کی علامتوں کے پورے نظام میں تبدیلیاں کیں لیکن دردؔ کے یہاں غزل کی کلاسیکل علامتوں کا نظام ہمیشہ برقرار رہا۔

ان کے یہاں غزل کا تصور ایک انفرادی پہلو ضرور رکھتا ہے انھوں نے

اپنی زیادہ تر غزلوں پر عنوانات قائم کئے ہیں جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان غزلوں میں مرکزیت ایک ہی خیال ایک ہی جذبہ یا ایک ہی احساس کو حاصل ہے بڑی حد تک انھوں نے غزل مسلسل کی تکنیک اپنائی ہے اس لئے ان غزلوں میں نظم نگاری کی جھلک بھی نظر آتی ہے اس کے باوجود یہ نظمیں نہیں ہیں بلکہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے غزلیں ہی ہیں جن میں تمام اشعار ردیف وقافئے کی زنجیر میں ایک دوسرے مربوط ہیں کسی حد تک ان غزلوں میں ان کے پاس غزل کی کلاسیکی روایات کے احترام کے ساتھ ساتھ ایسے خیالات وجذبات کا اظہار بھی ہوا جن کے لئے ان کو جدید شاعری کی زبان استعمال کرنا پڑی ہے درد کاکوروی کی غزلوں میں ایسے الفاظ کی فراوانی بھی ہے جو عام طور پر غزل گوئی میں استعمال نہیں ہوتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہے کہ انھوں شاعری سے زندگی کی بنیادی حقیقتوں کے اظہار کا بھی کام لیا ہے ان کی ایک غزل کا عنوان ہے "عشق کی بنیاد محکم ہے" اس مرکزی خیال کو ادا کرنے کے لئے انھوں نے غزل میں غیر روایتی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے ؎

الم اب زندگی مختصر کا جزو اعظم ہے
جدھر دیکھو ادھر ساری فضائے امن برہم ہے
نہ پوچھو انقلاب زندگی کا ماجرا ہم سے
تڑپ کر سانس لینا ہی سرود بزم عالم ہے

ان اشعار میں جزو اعظم اور انقلاب زندگی جیسی ترکیبیں نظر آتی ہیں جو روایتی غزل کی زبان سے میل نہیں کھاتیں لیکن اسی غزل میں یہ اشعار بھی ہیں ؎

عجب کیفیت دل ہے مسرت صورت غم ہے
تعیش گاہِ ہستی کیا سراپا بزم ماتم ہے

بکھر جائے کہیں شیرازۂ جمعیتِ دل پھر
مبارک عشق حسن زندگی کی زلف برہم ہے
فغانِ صبح دم سے گریۂ شام غربت تھا
حریفِ شعلہ وشبنم تماشا گاہِ عالم ہے
ہمارے عشقِ محکم سے کسی کا حسن کہتا ہے
"یہ فتنہ آدمی کی خانہ بربادی کو کیا کم ہے"

دردؔ کاکوروی اردو شاعری کے پورے مزاج شناس ہیں اس لئے ان کی غزلوں میں بڑی رنگا رنگی ہے ایک اور غزل میں پرانے رنگ کے یہ شعر اپنی آب وتاب دکھا رہے ہیں ۔

کاگ شیشوں کے اڑے جاتے ہیں ایسا جوش ہے
ہاں نگاہ مست ساقی کچھ تجھے بھی ہوش ہے
یہ تری بے خود نگاہیں یہ نشیلی انکھڑیاں
دل ابھی پیمانۂ لبریز سے مدہوش ہے
کیا کہوں ساقی کہاں ساغر کہاں ہے جب مجھے
خود نہیں اپنی خبر ساقی کا کس کو ہوش ہے
جھوم اٹھوں کیوں نہ متوالی نگاہیں دیکھ کر
میں شرابی دل شراب عشق سے مدہوش ہے

اسی غزل میں لکھنوی رنگ کی عکاسی کرتا ہوا یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

ہائے کیا حسرت کدہ ہے تیرے عاشق کا مزار
شمع پہلے جل رہی تھی وہ بھی اب خاموش ہے

مقطع میں بھی استادان سخن کا تتبع کیا ہے ۔

کیوں نہ درد اپنی سیہ کاری کے قرباں جاؤں میں
چھائی ہیں کالی گھٹائیں رحمتوں کا جوش ہے

ان کی ایک اور غزل کیا کیا نہ کیا کے عنوان سے زبان اور بیان کے کئی پہلو اجاگر کرتی ہے۔

جو ذکر فصل بہاراں کیا کیا نہ کیا
تو خار غم کو گلستاں کیا کیا نہ کیا

کہاں ہوا ہے ابھی تار تار دامن گل
تو ہم نے چاک گریباں کیا کیا نہ کیا

صبا کے دوش پہ خوشبو کا کارواں ہے ابھی
تو ہم نے عیش کا ساماں کیا کیا نہ کیا

جو سامنے ہے اسی کی خوشی نہیں ظاہر
تو شکوۂ غم پنہاں کیا کیا نہ کیا

کہیں کہیں ان کی زبان غزل کی ترشی ہوئی زبان ہے جو تعقید لفظی سے بالکل پاک اور رواں دواں ہے اسی کے ساتھ ساتھ تعقید معنوی بھی ان اشعار میں بالکل نہیں ہے۔ لکھنوی غزل گوئی کا پورا کمال ان میں جھلکتا ہے ؎

یہ سچ ہے عشق میں کامل بنا دیا تو نے
مگر فسانۂ محفل بنا دیا تو نے

وہ بے نیاز ہیں اہل نیاز حسن کو کیا
ہیں اہل دل جنہیں بے دل بنا دیا تو نے

وہ کب درد دل کی دوا جانتا ہے
جفا کے سوا اور کیا جانتا ہے

وہ درد آشنا ہے دوا جانتا ہے
مگر ظلم کرنا روا جانتا ہے
وہ گو بے وفا ہے مگر شکر یہ ہے
ہمیں تو وہ بت با وفا جانتا ہے
بتوں کے ہوا عشق میں مبتلا جو
محبت کا بس وہ مزہ جانتا ہے
مزہ اس کے جلوہ کا جو ہم نے پایا
یہ دل جانتا ہے خدا جانتا ہے
دیا جس نے اے درد یہ درد ہم کو
وہی دردِ دل کی دوا جانتا ہے

غزل گوئی میں درد کا رنگ سادہ گوئی کا مظہر بھی ہے اور جب انھوں نے کسی بڑے خیال کو شعری پیکر عطا کیا ہے تو ان کی زبان کا رنگ بدل کر کچھ اور ہو گیا ہے یہ خصوصیت اس مقام پر بہت نمایاں ہے جہاں انھوں نے عارفانہ مضامین نظم کئے ہیں ان اشعار میں فارسی ترکیبیں بھی ہیں اور ایسے الفاظ بھی جن کا مجازی پہلو کچھ اور ہے اور درد کا گوروی نے ان کو مجاز کے پردہ میں حقیقت کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے ان کی ایسی شاعری پر نظم نگاری کا وہ اثر غالب ہے جو بیسویں صدی میں غزل کی پرانی دنیا میں نئی روشنی بن کر پھیل رہا تھا ایک ہی غزل میں قدیم و جدید رنگ کے اثرات بھی ملتے ہیں اور عشق مجازی اور عشق حقیقی کی جانب اشارے بھی ملتے ہیں اس کی بہترین مثال ان کی وہ غزل ہے جس کا عنوان خود انھوں نے "بھرا میخانہ خالی ہے" تجویز کیا ہے ؎

سنا جس روز سے مجنوں گیا ویرانہ خالی ہے
مگر دیوانگی سے کیا کوئی دیوانہ خالی ہے

نگاہِ مست کہتی ہے بھرا میخانہ خالی ہے
فضا معمور ہے لیکن ابھی پیمانہ خالی ہے
بھرا ہے غم کثرت سے دل دیوانہ خالی ہے
نہیں بڑھتی ہے کیوں وحشت اگر ویرانہ خالی ہے
ہے ساقی میکدہ میں اور پھر میخانہ خالی ہے
ہوئے ہیں عہد و پیماں بھی مگر پیمانہ خالی ہے

بظاہر یہ سب عام تغزل کے جذبات ہیں اور ان میں غزل کی عام زبان ہے اور غزل کی عام علامتوں کا استعمال کیا گیا ہے لیکن اسی غزل میں اچانک ان کا رخ مڑتا ہے اور وہ زبان و بیان کے اعتبار سے تصوف و عرفان کی زبان میں بات کرنے لگتے ہیں ؎

بصارت جلوہ گاہِ حسن کا پردہ سہی لیکن
کہاں اپنی ادا سے جلوہ جانانہ خالی ہے
نظر نے لاکھوں آئینہ بنائے پھر بھی یہ دیکھا
ہر اک تشبیہ سے تنزیہہ کا میخانہ خالی ہے
جمالِ عینیت سے ذرہ ذرہ درد مملو ہے
کمالِ غیریت سے جلوۂ جانانہ خالی ہے
بھلا پہنچے گی کیا آواز میری اس کے کوچہ تک
کھٹک سے درد زنجیرِ دلِ دیوانہ خالی ہے

ان کی غزل گوئی میں زبان کی صفائی بھی ہے اور تصوف کی خالص علمی اصطلاحوں کا استعمال بھی ہے کہیں کہیں انھوں نے علمی زبان کو شاعری کی شکل عطا کردی ہے ایک غزل میں انھوں نے وجود حقیقی کے مقابلہ میں انسان کے فانی وجود کے

احساس و اعتراف کی ترجمانی کی ہے اور تصوف کے بنیادی فلسفہ کو شعری جامہ پہنایا ہے ؎

تقدیر سے پیغام فنا میرے لئے ہے
اور شورشِ اسرار بقا تیرے لئے ہے

یعنی انسان کے فانی وجود کے لئے فنا کو مقدر کر دیا گیا ہے لیکن وجود حقیقی کی ہر حال میں بقا ہے اور اس کے کمال بقا ہی سے دو عالم میں ہنگامہ برپا ہے ؎

صد رنگ تعین کی ردا میرے لئے ہے
انوار کی نیرنگ فضا تیرے لئے ہے

یعنی میرے لئے ہر سمت میں تعینات کے پردے میں عالم کی کثرت ہے لیکن وجود حقیقی کے لئے جو نیرنگی ہے اس میں صرف انوار الٰہی ہیں اور وہاں تعینات کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

تکمیل مقاماتِ فنا میرے لئے ہے
دیوانہ لیلائے بقا تیرے لئے ہے

تصوف کے راستے میں اپنے آپ کو فنا کرنے کے بعد تکمیل کی منزلِ مقصود آجاتی اور اس مرحلہ کو سر کرکے فانی بقا کی کیفیت تک پہنچ جاتا ہے اور سالک اسی کے لئے دیوانہ رہتا ہے ؎

بے نور عناصر کی ضیا میرے لئے ہے
روشن یہ حقیقت کا دیا تیرے لئے ہے
میں کون ہوں اور دہر میں کیا میرے لئے ہے
کونین میں سب جلوہ نما تیرے لئے ہے

یہ عرفان کی آخری منزل ہے جس کو وحدت الوجود کہتے ہیں خورشید کا کوردی اسی نشۂ وحدت

سے سرشار تھے ان کی غزل میں مجازی غزل گوئی کے ساتھ ساتھ توحید وجودی اور اس کے مسائل کا بیان بار بار ملتا ہے۔ بیسویں صدی میں یہ ایک انفرادی رنگ ہے شاید صرف اصغر گونڈوی ایسے شاعر ہیں جنہوں نے توحید وجودی کے رنگ کو اپنایا تھا اور اس کامیابی کے ساتھ اپنایا تھا کہ وہ مقبول بھی ہوا لیکن ان کے یہاں مجاز حقیقت پر غالب نظر آتا ہے اور ان کی زبان فارسی آمیز ہے۔ تصوف کی خاص اصطلاحوں کا استعمال بھی اصغر گونڈوی کے یہاں نہیں ملتا۔ درد کاکوروی نے لکھنؤ کے رنگ کی پوری نمائندگی کی ہے ایک طرف ان کے یہاں شائستہ مجازی غزل گوئی کے نمونے ہیں تو دوسری طرف انھوں نے خالص عارفانہ شاعری کی ہے جس کی لفظیات روایتی غزل گوئی میں نظر نہیں آتی ہیں درد کاکوروی نے اپنی شاعری میں جس بنیادی جذبہ کی ترجمانی کی ہے وہ عارفانہ شاعری کی جان ہے یہ ان کا غیر معمولی امتیاز ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی میں ایسی شاعری کی جس کا سرچشمہ رواں دواں تھا لیکن اس پر توجہ کسی کی نہیں تھی۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی غزل گوئی سرتاسر نظریات کا بیان اور ان کے فلسفہ کی وضاحت تک محدود ہے حسن و جمال کا احساس ان کی غزلوں میں بدرجہ اتم موجود ہے اس لئے ان کی غزل میں محبوب مجازی سے والہانہ تعلق کی کیفیت کا اظہار بھی ہے۔

تم ہو تو شام شام ہے تم ہو تو ہے سحر سحر
کہنے کو یوں تو دہر میں شام بھی ہے سحر بھی ہے

کوئی پوچھے کہ تیغِ ناز مجھ سے کیوں کشیدہ ہے
وہ قاتل بن کے آئے ہیں میں کشتہ بن کے جاتا ہوں

دل جگر بے چین ہیں مہماں نوازی کے لئے
وہ نگاہِ ناز پھر نشتر بنے اور ٹوٹ جائے

سراپا گل بدن تو اور میں گل چین گلشن ہوں
وہ گلشن گلشن عارض، وہ عارض عارض تاباں
تو خسرو ملک جاں کا ہے وہ خسرو خسرو خوباں
ترا قد ایک فتنہ ہے وہ فتنہ فتنۂ دوراں
دہن تیرا ہے اک غنچہ وہ غنچہ غنچۂ خنداں
نگاہِ سرمگیں خنجر وہ خنجر خنجر برّاں

کائنات میں حسن وجمال کا مشاہدہ دردؔ کاکوروی نے بڑی خوبی سے کیا ہے لیکن یہی مشاہدہ ان کو ایک صوفی شاعر بنا دیتا ہے وہ اپنے شعروں میں عینیت اور غیریت جیسی اصطلاحوں کا استعمال کرتے ہیں تنزیہہ اور تشبیہ کا ذکر کرتے ہیں ان کی غزلوں کا بڑا حصہ بھی تصوف کے اسی نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتا ہے کہ کائنات میں حسن وجمال کے جتنے بھی مظاہر ہیں ان کا مشاہدہ صرف ایک حقیقت کی طرف لے جاتا ہے یہ حقیقت چونکہ بے شکل وصورت ہے اس لئے یہ نہ دیکھی جا سکتی ہے نہ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے لیکن ذرہ ذرہ میں اسی کا حسن وکمال جلوہ گر ہے اور انسان بس اسی حسن وکمال کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ دردؔ کاکوروی کی غزل گوئی مشاہدات کے اسی عمل کی ترجمانی کرتی ہے وہ بنیادی طور پر تصوف کے ترجمان ہیں اور غزل گوئی میں بھی وہ اسی کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کا یہ رنگ ان کی غزلوں کے دوسرے پہلوؤں پر غالب نظر آتا ہے۔

بابِ چہارم

دردؔ کاکوروی کی نظم گوئی
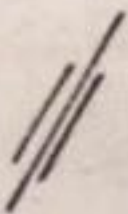
(الف) دردؔ کی نظموں کے موضوعات

(ب) نعتیہ نظموں کا جائزہ

(ج) تاریخی اور مذہبی نظمیں

(د) دردؔ کی نظموں کی مجموعی خصوصیات

دردؔ کاکوروی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور اسی لئے غزل گوئی کے پہلو بہ پہلو وہ ایک نظم گو شاعر بھی ہیں۔ اردو میں نظم نگاری کی روایت انیسویں صدی میں رونما ہوئی اور بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں یہ پوری طرح پائیدار اور قابل قبول صنف سخن بن چکی تھی۔ دردؔ کاکوروی کے شعور کی بالیدگی کا زمانہ بیسویں صدی کا ابتدائی دور تھا۔ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ کاکوری کے نادر علی خاں نادرؔ کاکوروی سے پوری طرح متاثر ہوئے ہوں گے جنہوں نے مغربی شاعری کے بے حد فنکارانہ منظوم ترجموں کے ذریعہ اردو شاعری میں بنیادی انقلاب پیدا کرنے میں غیر معمولی کردار ادا کیا تھا۔

یوں تو ہر کلام موزوں کو نظم کہا جاتا ہے لیکن ادبی اصطلاح میں نظم سے مراد شاعری کی وہ اصناف اور اسالیب ہیں جن میں کسی خاص موضوع پر ربط و تسلسل کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے غزل کے علاوہ اردو شاعری کی تمام نمائندہ اصناف مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی وغیرہ سبھی نظم کے زمرہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ موضوع سے قطع نظر ہیئت یعنی مصرعوں اور بندوں کے اعتبار سے دور قدیم میں نظم کے کچھ مخصوص اسالیب کا رواج رہا ہے۔ مثال کے طور پر مثلث، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ نظم کا دائرہ بہت وسیع ہے اس میں کسی مخصوص موضوع یا ہیئت کی پابندی نہیں ہے نظم کی تعریف بیان کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین رقم طراز ہیں:

> "جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے اشعار کا ایک مجموعہ جس میں ایک مرکزی خیال ہو اور ارتقائے خیال کی وجہ سے تسلسل کا احساس ہو۔ اس کے لئے کسی مخصوص موضوع کی قید

نہیں ہے۔ نہ اس کی ہیئت ہی معین ہے"۔ ؎۱

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی اہمیت سیاسی اعتبار سے کچھ بھی ہو لیکن نتائج کے لحاظ سے یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا۔ اس نے زندگی میں حرکت پیدا کردی۔ زمانے نے کروٹ بدلی ملک میں نئے حالات اور نئے مسائل نے جنم لیا۔ انسانی ذہن کے سمندر میں طغیانی آئی۔ انداز فکر تبدیل ہوا۔ نئے تصورات و خیالات اور رجحانات پیدا ہوئے۔ سیاسی، تعلیمی اور تہذیبی میدان میں نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

نیا طریقہ تعلیم رائج ہوا۔ مغربی علوم کے اثرات سے فکرونظر میں تبدیلی آئی۔ ان بدلتے ہوئے حالات نے ادب، موسیقی، تعمیر، نقاشی اور مصوری پر گہرا اثر ڈالا۔ شعراء نے ان اثرات کو قبول کرتے ہوئے اپنا لب ولہجہ تبدیل کیا مافوق الفطرت اور مبالغہ آمیز مضامین ترک کر کے حقیقت اور اصلیت پر شاعری کی بنیاد رکھی گئی۔ تصنع اور تکلف کو بالائے طاق رکھ کر نظمیں کہی جانے لگیں۔ یہی زمانہ جدید اردو شاعری کا زمانہ تھا جس کے بانی مولانا محمد حسین آزاد تھے۔ آزاد کا فنی اور تنقیدی شعور بہت بیدار تھا۔ انھوں نے وقت کے تقاضے کو محسوس کیا اور روایتی شاعری سے احتراز کرنے لگے۔ انھیں کے زمانے میں اردو میں باقاعدہ نظم نگاری کا آغاز ہوا۔ اگرچہ آزاد سے پہلے نظیر اکبرآبادی کی نظموں کے نمونے موجود تھے۔ ایک زمانے تک نظیر کی شاعری پر فحش، مبتذل اور سوقیانہ ہونے کا الزام رہا۔ لیکن وقت نے ثابت کیا کہ نظیر عوامی شاعر تھے۔ مجنوں گورکھپوری تو نظیر اکبرآبادی کو پہلا نظم نگار

؎۱ اردو شاعری کا تاریخی اور فنی ارتقاء: از سید احتشام حسین رضوی: نگار اصناف سخن نمبر ۱۹۵۷ء ص ۱۲۹

شاعر قرار دیتے ہیں:

"اگر قصائد اور مثنویات کو نظم میں شمار نہ کیا جائے اور نظم کی اصطلاح کو جدید معنوں میں استعمال کیا جائے تو نظیر اردو کے پہلے نظم نگار ہیں"[1]

اردو نظم کو پروان چڑھانے میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جدید اردو نظم کے آغاز و ارتقا میں انجمن پنجاب نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس انجمن نے ادب و شاعری میں اصلاح کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ایسے مشاعروں کی بنیاد پڑی جن میں مصرع طرح کے بجائے نظموں کے موضوعات اور عنوانات کا تعین کیا جاتا تھا یہ مشاعرے جدید شاعری کی ترویج و اشاعت میں بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوئے انجمن کے جلسوں میں نہ صرف شعرا نے مختلف موضوعات پر نظمیں پیش کیں بلکہ اخبارات و رسائل میں ان کی اشاعت بھی ہونے لگی۔

حامد حسن قادری کی تحقیق کے مطابق جدید اردو شاعری کا پہلا مناظمہ مئی ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کی عمارت میں منعقد ہوا تھا دوسرا مناظمہ مئی ۱۸۷۸ء میں ہوا تھا جس میں مولانا الطاف حسین حالی نے برکھا رت پڑھی تھی۔ ۳۰ جون ۱۸۷۸ء کو تیسرا اور چوتھا مناظمہ ۳ اگست ۱۸۷۸ء پانچواں ۳ ستمبر ۱۸۷۸ء اور چھٹا ۱۴ نومبر ۱۸۷۸ء کو منعقد ہوا تھا[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اردو میں نظم نگاری کی شعوری تحریک کی پہلی مثال ہے

---

[1] اردو شاعری میں واقعیت اور جامعیت کا ظہور: از مجنوں گورکھپوری: مشمولہ نقوش و افکار ص ۲۳۷

[2] اصناف ادب اردو: قمر رئیس - خلیق انجم

لیکن اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ نظم نگاری کو چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اردو شاعری میں ایک صنف سخن کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا تھا اور اس تحریک کے اثرات لاہور سے نکل کر پورے ملک میں پھیل گئے تھے۔ لکھنؤ پر بھی اس کا پورا اثر ہوا تھا اور کاکوری میں تو اس تحریک کے ایک قد آور علمبردار نادر کاکوروی نے جنم لیا۔

یہی وجہ ہے کہ دردؔ کاکوروی کی شاعری میں نظم نگاری ابتدا ہی سے ایک اہم عنصر ہے۔ وہ خالص غزل گو نہیں ہیں بلکہ مکمل شاعر ہیں، قدیم طرز کی شاعری میں جہاں ان کے پاس تضمین، رباعیات، قطعات یا حمد و نعت اور سلام کے فن پارے ملتے ہیں وہاں ایسی نظموں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے جن کو نیچرل شاعری اور رومانی شاعری کی مثال کہا جاسکتا ہے۔ دردؔ کاکوروی کی نظم گوئی میں بہت رنگارنگی اور تنوع ہے۔ وہ شاعری کے جدید ترین رجحانات سے گریزاں کبھی نہیں ہوئے یہاں تک کہ انھوں نے آزاد نظم کے تجربے بھی کئے۔ ان کی ایک ایسی نظم "ادھورا نغمہ" ہے جس میں ترقی پسند شاعری کے تاثر کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی رومانی طرز فکر بھی موجود ہے:

شب کا گہرا یہ سکوت اور جھجھکتی ہوئی لے
اے دل درد طلب تجھ کو ہوا کچھ بھی نہیں
چاہتا تو ہے کہ
مل جائے مجھے دولت نور
یہ طلوع سحر اور نغموں کی دھن مست شباب
جگمگانے لگے نغمے یہ تجلی یہ گلاب
ہے سحر ہونے کو اور رقص میں ہے رنگ بہار:

شعلۂ مہر کی زر کار فضاؤں کا نکھار
یہ نگاروں کا ہجوم
اور بہاروں کا ہجوم
آنکھ اس شوخ کی اک کیف کا پیمانہ ہے
آرزوؤں کا تمناؤں کا میخانہ ہے

لیکن آزاد نظم ان کا میدان نہیں ہے۔ انھوں نے نظم نگاری میں جو رنگ پیدا کیا ہے وہ پابند نظموں کی تکنیک کے ماہرانہ استعمال سے کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر جمالیات کے شاعر ہیں اور یہ جمالیات ایک صوفی شاعر کی جمالیات ہے نیاز فتح پوری نے ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"درد ایک صوفی منش شاعر ہیں اور اسی لئے ان میں کافی سوز و گداز اور ترنم پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری صرف آرٹ کی شاعری نہیں ہے بلکہ جذبات و تاثر کی شاعری ہے۔ ان کی غزلیں نظمیں اور رباعیات سب ان کے ستھرے ذوق اور قدرتِ سخن گوئی کی آئینہ دار ہیں" [۱]

اسی جمالیاتی رجحان کا اظہار ان کی پوری نظم گوئی میں موجود ہے۔ کوئی نظم ایسی نہیں ہے جس میں حسن شناسی کا اظہار نہ ہوا ہو۔ اپنی نظم "حسن" میں انھوں نے حسن و جمال کو نورِ ازل کی کرشمہ سازی قرار دیا ہے ؎

خود نمائی کا ہوا جب جذبہ مصروفِ ظہور
حسن کی تخلیق پر مائل ہوا جس وقت نور

---

[۱] نگار: اپریل ۱۹۵۵ء ص ۵۵

نور کی نظروں سے دیکھا اس نے ہر ہر چیز کو
تا کہ ہر شے میں جمالِ یار کی تصویر ہو
ہے ازل سے دہر میں یہ پرتوِ انوارِ حق
یا کتابِ زندگی کا ایک رنگیں سر ورق
حسن اک رنگیں حقیقت ہے مگر شکلِ مجاز
فطرت اپنے ذوق میں خود ہو گئی فطرت نواز

انھوں نے حسن کو حسنِ ازل کی عشوہ سازی کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت میں عشق کے جذبے کی بنیاد بھی سمجھا ہے۔ اسی لئے وہ ان کو محض مجاز نظر آتا ہے وہ اس کے پردے میں کچھ اور ہی دیکھتے ہیں اپنی نظم " ہنگامۂ کونین" میں انھوں نے یہی بات کہی ہے ؏

یہ کس کی تجلی ہے کہ جنبش میں نظر ہے
لپٹا ہوا کس نور سے دامانِ سحر ہے
ہے ایک ہی جلوہ جو ادھر اور اُدھر ہے
آئینہ ہے اور سامنے اک آئینہ گر ہے
کیا تابشِ انوار ہے کیا نورِ تجلی
ہر ذرۂ داریں بنا لعل و گہر ہے

ان کا یہ صوفیانہ جمالیات کا رنگ ان کی نظم گوئی کو بیک وقت جدید و قدیم بناتا ہے اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر سید وقار عظیم نے ان کے مجموعۂ کلام " میکدہ معنی" میں شامل مقدمے میں لکھا ہے:

" میکدۂ معنی میں ایک طرف ایسی نظمیں ہیں جن کی اساس سرتاسر حکیمانہ ہے اور ان نظموں کو پڑھ کر قاری شاعر کے متعلق یہ نتیجہ

نکلتا ہے کہ اس نے ابدی حقائق اور دنیا کے عرفان سے اپنا رشتہ جوڑا ہے اور دوسری طرف اس مجموعہ میں بکثرت ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن کا موضوع مادی دنیا کے مشاہدات ہیں لیکن دنیائے عرفان سے تعلق رکھنے والا یہ حکیم شاعر چونکہ حسن فطرت کا شیدائی بھی ہے اس لئے اس کو اپنے گرد و پیش جہاں کوئی منظر دکھائی دیتا ہے اور کوئی دلنشیں آواز سنائی دیتی ہے تو وہ اسے اپنی شاعری کا موضوع بنالیتا ہے چنانچہ اس مجموعہ میں کتاب، پھول اور کلیاں، ساون جمنا کے کنارے، بانسری بجائے جا، پپیہا، برسات اور پپیہا، سحر اور لالۂ و گل جیسی نظمیں بھی شامل ہیں، جنہیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ حسین مناظر شاعر کی طرح ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور یہ دل نشیں آوازیں اس کی طرح خود اپنے کانوں سے سنی ہیں۔ اور ان کے تاثر کو اپنے دل میں جاگزیں کیا ہے۔ کتاب پر جو نظم ہے وہ ایسی ہے کہ نہ صرف درسی کتب بلکہ کتب خانوں میں بھی آویزاں ہونا چاہیئے۔ [۱]

درد کاکوروی نے اپنی نظم "کتاب" میں بڑی مرصع شعری زبان اختیار کی ہے اور اسی کیساتھ اس میں فکر اور حکمت کی آمیزش ہے درد نے انسانی زندگی میں "کتاب" کی اہمیت و افادیت اس طرح بیان کی ہے:

اے عروس علم اے میری رفیق زندگی
اے بیاض صبح حکمت آفتاب عقل و نور

---

[۱] میکدہ معنی: از درد کاکوروی صہ ۵۔۴

ہے تو ہی ہر علم کا نادر مرقع اے کتاب
در حقیقت ہے تجھی سے زینت عقل و شعور
کون سی ہے وہ فضیلت جو تجھے حاصل نہیں
حامل قرآن و توریت اور انجیل و زبور
مخزن تفسیر و تاریخ و حدیث و علم و فقہ
معدن علم و کلام و ہیئت طب در صدور
ہیں ترے اوراق برگ گلستان علم و فضل
آسمان علم پر ہیں کہکشاں تیری سطور
دائرے ہیں پھول نقطے ہیں زر گل نکتہ رس
تیری خوشبو سے مہک اٹھا ہے عالم دور دور
در حقیقت علم در آغوش ہے تیرا وجود
تو مدرس ہے مگر خاموش باعقل و شعور

آگے چل کر درد نے کتاب کے اوصاف بیان کئے ہیں کتاب کی بدولت ہمیں علم و حکمت کی دولت نصیب ہوتی ہے کتاب ایک ایسے سورج کی مانند ہے جس کی روشنی سے دور دور تک لوگ فیض یاب ہوتے ہیں کتاب ہی سے انسان میں عیب و ہنر کا شعور پیدا ہوتا ہے۔

مل گئی تیری بدولت علم کی دولت ہمیں
ہو گیا تیری بدولت روح کو حاصل سرور
تیری ہستی اس جہاں میں ہے وہ علمی آفتاب
تجھ سے لیتے ہیں سبق سب صاحب عقل و شعور
تو کہاں ہے بند ہے کوزے میں دریا علم کا
درد کی یہ نظم ہے اس کا جواب جوئے نور

ان کی ایک اور معرکۃ الآرا نظم "وقت" ہے جس میں انھوں نے زمانے کی تبدیلی کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ تصوف میں ابن الوقتی کا ایک خاص مفہوم ہے اور یہ موقع پرستی سے بالکل علاحدہ تصور ہے۔ صوفیوں کے نزدیک ابن الوقتی اپنے زمانے سے ہم آہنگی کا نام ہے۔ درد نے اپنی اس نظم میں اسی پہلو پر زور دیا ہے کہ انسان کی زندگی میں وقت کی بڑی اہمیت ہے جس نے وقت کو نہ پہچانا وقت کی قدر نہ کی وہ کبھی کامیابی کی منزل سے ہمکنار نہ ہو سکا۔

وقت کہتا ہے میں اپنے وقت کی آواز ہوں
وقت جس پر ہے پڑا اس دکھ بھرے کا ساز ہوں
میں ہوں کیا کیا چیز اس کا تجربہ تم کو نہیں
ساتھ دو گے جب مرا معلوم ہو گا تب کہیں
وقت کا گر ساتھ دو گے پھر تو بن جائیں گے کام
ورنہ ہو جائیں گے سب ناکام منصوبے تمام
قدر کی تم نے نہ میری تو سمجھ لو میں چلا
وقت ہوں میں آ نہیں سکتا دوبارہ جب گیا
وقت کی نبضوں پہ جس کا ہاتھ ہو اے بے خبر
ہم سمجھتے ہیں اسی کو اہل دل اہل نظر

درد صاحب نے مکالماتی نظمیں بھی کہی ہیں۔ وہ متعدد نظموں میں ایک کامیاب مکالمہ نگار کی حیثیت سے رونما ہوتے ہیں۔ "رات اور دن"، "عید میں حسن اور نغمے کی بحث" میں ان کی مکالمہ نگاری قابل تحسین ہے۔ رات نے دن سے کہا کہ مجھ کو تجھ پر فوقیت حاصل ہے۔ کہ میں ساری دنیا کے انسانوں کے رنج و غم بھلا کر اور ان کو ہر فکر سے آزاد کر کے ان تھکے ماندوں کو چین کی نیند سلا دیتی ہوں

میری ہی بدولت آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے نظر آتے ہیں۔ میری خوشگوار چاندنی سے لوگوں کو تسکین ملتی ہے اللہ نے مجھے یہ فخر بھی بخشا ہے کہ رات ہی میں محبوب خدا معراج پر گئے تھے۔ شبِ قدر نے میرے وقار میں مزید اضافہ کیا ہے۔ اس رات میں فرشتے نازل ہوتے ہیں۔

رات نے دن سے سرِ شام کہا یہ اک بار
کچھ تو بتلا تجھے کیا مجھ پہ ہے فوقیت یار
میں تو عالم کے غم و رنج بھلا دیتی ہوں
چین سے سب تھکے ماندوں کو سلا دیتی ہوں
جگمگاتے ہوئے تاروں کی وہ تاروں بھری رات
ایسی دلچسپ کہ ہیں جانتے سارے حضرات
خوشگوار اور خنک چاندنی ہوتی ہے مری
جس کی ٹھنڈک سے ہر اک دل کو ہے تسکیں ہوتی
فخر یہ کہتی ہوں اللہ نے بخشا ہے یہ تاج
رات ہی میں ہوئی محبوبِ خدا کو معراج
پھر شبِ قدر سے خالق نے دیا ہے وہ وقار
ہے بڑی شان مری دن کے مہینے ہوں ہزار

رات کی یہ گفتگو سن کر دن کو جوش آگیا اور رات سے مخاطب ہو کر بولا کہ تو ان باتوں پہ مغرور نہ ہو تجھ میں کوئی خوبی موجود نہیں ہے اگر چاند اور ستارے تیرا ساتھ نہ دیں تو تیری مجال ہی کیا ہے جو مجھ سے آنکھ ملا سکے اور یہ تیرے چاند ستارے بھی دن ہی کے مرہونِ منت ہیں ان چاند اور ستاروں میں جو روشنی نظر آتی ہے یہ میرے سورج ہی کی بدولت ہے۔ میرا سورج نہ ہو تو تیرے

ستارے اور چاند بالکل بے حقیقت معلوم ہوں گے۔

یہ کہا دن نے کہ خاموش! نہ ہو تو مغرور
ہیں جو مغرور رہی ہوتے ہیں آخر رنجور
تو نہ ظاہر ہو اگر تاروں کی افشاں چن کر
ہو اگر چاند کا ٹیکہ نہ ترے ماتھے پر
پھر یقیناً تو وہی کالی کلوٹی ہے رات
پھر تو کر ہی نہیں سکتی ہے مرے سامنے بات
اب رہا چاند یہ تاروں یہ جو اتراتی ہے
چاند تاروں کی حقیقت بھی کھلی جاتی ہے
چاند میں تیرے بھلا آئی کہاں سے یہ ضیاد
میرے سورج کو دعا دے جو ہے چمکا دیتا
پھر نہ کیسے مرے سورج کا فلک پر ہو دماغ
ہوتے ہیں گل مرے آگے ترے تاروں کے چراغ
کون ہے جو مرے سورج کے مقابل آئے
کچھ ترے چاند کو دعویٰ ہے تو منہ دکھلائے

آگے چل کر "دن" رات پر اپنی برتری ظاہر کرتے ہوئے رات میں پیدا ہونے والی برائیوں کا اس طرح پردہ فاش کرتا ہے ؎

نور خالق کا ہوں میں اور سیہ رو تو ہے
وہ بھیانک ہے کہ شیطاں کا جادو تو ہے
رات ہی میں تو پڑا کرتا ہے اکثر ڈاکا
موقع شیطان کو مل جاتا ہے بہکانے کا

رات ہی میں تو ہوا کرتی ہے اکثر چوری
رات ہی میں تو ہوا کرتی ہے بدکاری بھی
بول اب اپنی حقیقت تجھے معلوم ہوئی
کر بیاں اور اگر کوئی ہے دعویٰ باقی

پھر رات نے دن پر اپنی فوقیت ظاہر کی ہے رات کی ان باتوں کا جواب دن ان الفاظ میں دیتا ہے ؎

تجھ کو مذہب کی حمایت پہ اگر ہے کچھ ناز
سن میں اس کا بھی کئے دیتا ہوں افشا سب راز
یہ بجا کس لے ہے شب قدر اگر تیرے لئے
تیس روزے رمضان کے ہیں مگر میرے لئے
اجر ہر روزہ کا بیشک ہے جناب باری
جب خدا مل گیا کیا چیز رہی پھر باقی
روزہ حج دن میں ہے اور فرض نمازیں ساری
تین میرے لئے اور دو ہیں ترے حصہ کی
جمعہ عیدین سے ہے دن کو فضیلت حاصل
دن ہی کو ختم بھی ہوگی یہ جہاں کی محفل
تو ہی انصاف سے کہہ تیری قسم ہے تجھ کو
کس کا رتبہ ہے بڑا اب یہ بتادے مجھ کو

یہ تکرار جاری ہی تھی کہ قدرت نے دن اور رات کو گلے ملا دیا۔

درد کی دوسری بہترین مکالماتی نظم "عید میں حسن اور نغمہ کی بحث" ہے شاعر کہتا ہے کہ میں عید کے دن شام کے وقت نہر کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہ دیکھا

کہ دو نورانی پتلے آپس میں بحث کر رہے ہیں، یہ پتلے حسن اور نغمہ ہیں، حسن اپنے
دلائل پیش کرتا ہے ۔

حسن کہتا ہے کہ یوسف کی صباحت ہوں میں
شک نہیں اس میں کہ قرآن شاہد ہے اس کا
میری ہی ذات سے ہے دہر میں ہر شے رنگیں
میرے ہی نور سے پرنور ہے ذرہ ذرہ
میرے ہی حسن کے ممنون ہیں شیریں، فرہاد
میرے ہی جلوے سے بے خود ہوئے حضرت موسیٰ
کون دنیا میں ہے سرمایۂ صد حسن و جمال
کون شے حسن مجسم ہے بھلا میرے سوا
میں تو "اللہ جمیل" سے ہوں مقبول نبی
تو ہے مردود شریعت میں گذر کب ہے ترا
میں جو ہر شے سے نمایاں ہوں تو ہے اس میں یہ راز
کہ یہ ہستی ہے مری مرکز انوار خدا

حسن کی ان باتوں سے نغمہ پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے، نغمہ اس کے جواب میں
یوں گویا ہوتا ہے کہ مجھ کو کسی چیز پہ غرور و تکبر نہیں ہے اور یہ کہنا سراسر غلط
اور بے بنیاد ہے کہ میں مردود شریعت ہوں کیوں کہ رسول اکرمؐ نے خود
بھی گانا سنا ہے ۔

سیدی حضرت صدیقؓ ہیں اس کے شاہد
خود نبی سرور عالم نے سنا ہے نغمہ
یہ بھی ہے حکم نبی لحن سے قرآن پڑھو
کیا فضیلت تجھے حاصل ہے کوئی ایسی بتا

آگے چل کر درد نے نغمہ کی زبان سے یہ باتیں کہلائی ہیں ۔

کیسے ہی رنج میں انسان ہو بیٹھا کوئی
رنج سارا نہ بھلا دوں تو بھلا بات ہی کیا
کوکب شاعری کا بخت مجھ سے چمکا
میرے باعث ہوئے مشہور جہاں میں شعراء
جامی و حافظ و خسرو ہیں مرے خوشہ چیں
اور رومی نے تو ہیں میرے بہائے دریا
میں نہ ہوتا تو کبھی دل نہ بہلتا کوئی
تو نہ ہوتا تو نہ جاتا سوئے صحرا کوئی

دنیا میں ہر جاندار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ زندگی امن اور سکون کے ماحول میں بسر ہو۔ امن ایک عالمی ضرورت ہے اور اس ایٹمی دور میں تو اس کی ضرورت نے اور شدت اختیار کرلی ہے۔ درد اپنی نظم "امن اور انسانیت" میں امن اور انسانیت کی تعریف ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

امن اور انسانیت یہ ہے کہ بربادی نہ ہو
امن اور انسانیت یہ ہے فسوں کاری نہ ہو
امن اور انسانیت یہ ہے نہ برسیں بجلیاں
ہے یہی انسانیت چھائے نہ گیسوں کا دھواں
امن اور انسانیت یہ ہے [illegible]
امن اور انسانیت یہ ہے کہ غم ہوں دور سب
امن اور انسانیت یہ ہے کہ خوں ریزی نہ ہو
فتنہ انگیزی نہ ہو اور ظلم انگیزی نہ ہو

امن اور انسانیت یہ ہے شفا ہو زہر میں
ظلم کے ہاتھوں نہ ہو مظلوم انساں دہر میں
امن یہ ہے پارہ پارہ ہو نہ انساں کا لباس
امن یہ ہے مستقل ہو ہر محبت کی اساس
امن یہ ہے ہو نہ آزادی جفا کی چھاؤں میں
امن یہ ہے ہو نہ زنجیر غلامی پاؤں میں
خون ناحق تیغ قاتل سے نہ ہرگز ہو رواں
ہے یہ مطلب کوئی بھی انسان نہ ہو محو فغاں

اور آگے چل کر درد صاحب اپنی اس نظم میں ان خواہشات کا اظہار کرتے ہیں ؎

ہو ہر اک دل کی وفا داری وقار سلطنت
ہر طرح ہو امن پر در اعتبار سلطنت
جلوہ گر ہو پوری قوت سے حمایت کا نظام
حفظ عصمت کے لئے سنگیں پناہیں ہوں تمام
شام کی کالی بلائیں صبح سے ہو جائیں دور
ہر طرف بس جگمگائے امن کے سورج کا نور
درد قومی سے رہے دنیا میں تابندہ حیات
امن اور انسانیت سے ہو درخشندہ حیات

سائنس ہمارے دور میں بڑی اہمیت کی حامل ہے اس کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انسان نے سائنس کے میدان میں بڑی ترقی کرلی ہے اور اس کے قدم خلاء میں پہنچ چکے ہیں یہ سائنس ہمارے لئے نعمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ اگر سائنس نے ایسی مشینیں ایجاد کی ہیں جن سے بہنوں کا

کام گھنٹوں میں لیا جا سکتا ہے تو اس نے بے روزگاروں کی تعداد میں بھی نمایاں اضافہ کیا ہے۔ درد صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو اس بات کو تسلیم کیا کہ یہ سائنس کا زریں عہد ہے۔ اس سے اگر انسانیت کے فروغ کا کام لیا جائے تو یہ مخلوق خدا کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔ درد صاحب سائنس کے مضر اثرات کا بیان اپنی نظم "سائنس کی رفتار" کے ان اشعار میں کرتے ہیں۔

یہ مشینوں کے دھوئیں اور اس پہ ایٹم بم کی گیس
ایسی زہریلی کہ جو کردے خوشی کو غم کی گیس
ان دھوؤں سے اور ان زہریلی گیسوں سے تمام
بس نئی بیماریوں کا بیش رہتا ہے نظام
کار، موٹر، بس، ہوائی ہوتے ہیں جتنے جہاز
سب کی آوازیں سکون و چین سے رکھتی ہیں باز
گرچہ اس سائنس کا خورشید روشن نام ہے
پھر بھی یہ انسان کی تخلیق ہیں ناکام ہے
کم نگاہی اس قدر سائنس کے ذروں میں ہے
اپنی ایجادوں سے خود سائنس بھی خستہ حال ہے

درد کاکوروی نے نظم نگاری کے میدان میں خالص رومانی شاعری نہیں کی ہے۔ بلکہ انھوں نے ایسی نظموں میں حکمت و دانش کے سبق بھی پڑھنے والوں کو مہیا کئے ہیں۔ اپنی نظم "سحر" میں انھوں نے سحر کی آمد آمد کا بہترین منظر یوں پیش کیا ہے ؎

معشوقۂ جہاں کی آتی ہے اب سواری
اٹھ اور ادب سے اس کو اس رتن دے سلامی

باد سحر بھی اس دم کیا رنگ لا رہی ہے
عالم کے ہر چمن کو دولہا بنا رہی ہے
خوش ہو کے بال اپنے سنبل بھگو رہا ہے
غنچوں کا منھ ننھا بھی شبنم سے دھو رہا ہے
فطرت کی اس ادا میں کچھ سرخیاں نہاں ہیں
گویا سحر کی فضا میں لالے کی بجلیاں ہیں

اس نظم میں سحر کی بڑی خوبصورت تصویریں ہیں لیکن اس کا اصل پیغام سحر خیزی ہے ؎

غفلت کی نیند میں تو کب تک پڑا رہے گا
جاگے پرندے سارے ہشیار تو بھی ہو جا

اودھ اور لکھنؤ کی یادیں ہمیشہ ان کے دل و دماغ میں تروتازہ رہیں۔ اپنی نظم "شام اودھ" میں انھوں نے ایک ایسی ہی یاد کا ذکر کیا ہے۔ حضرت گنج کی شام بنارسی باغ کی شام۔ امین آباد کی شام، گومتی کی شام، چوک کی شام میں جناب درد نے شہر کی رنگا رنگیوں کا بیان کیا ہے۔ جہاں وہ پروان چڑھے تھے۔ اپنے آبائی وطن کاکوری کو فراموش کرنا تو ان سے ممکن ہی نہ تھا۔ کاکوری سے متعلق ان کی نظم "وطن کی یاد" ہے جس میں اس تاریخی قصبہ کی عظمت پارینہ کا انتہائی حسرت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یاد رکھئے! بات یہ ہے کہ یہ نظم ۱۹۶۲ء کی ہے جب وہ اپنے وطن سے جدا ہو چکے تھے اور زندگی کا آخری زمانہ کراچی (پاکستان) میں بسر کر رہے تھے۔ اس عالم میں بھی ان کو کاکوری کا تابناک ماضی بڑی شدت سے یاد آتا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ؎

یارب مرے وطن کو نظر کس کی کھا گئی
جس سے چمن ہے نہ چمن کے نشاں رہے

سب صورتیں نہ خاک میں پنہاں ہوں اے خدا
کوئی تو شکل لالہ و گل سے عیاں رہے

کاکوری آہ قابلِ فخر اب کہاں رہی
سیف و قلم نہ صاحبِ طرزِ بیاں رہے

کیفی، حبیب، اطہر و سجاد اور شوق
کیسے نہ ان پہ چشمِ وطن خوں فشاں رہے

شاعر ادیب سعدی و کاظم، تراب و صبر
ذوق و شریف محسن و احسن کہاں رہے

فریاد و سحر و نادر و نیرنگ اور جذب
علم و ادب کے بہر ادب پاسباں رہے

اخگر، شرر و نیر و اعجاز اور اسیر
اصنافِ نظم و نثر میں جادو بیاں رہے

افسوس قیصری رہے خسرو نہ قیس آہ
یہ چند نام حاملِ نظمِ فغاں رہے

ذاتِ خدائے پاک ہے بس لازوال درد
یہ جادداں رہی ہے نہ کیوں جاوداں رہے

درد کاکوروی کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مختلف موضوعات اپنی شاعری میں نظم کئے ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں ایک طرف ایسی نظمیں ملتی ہیں جن میں عرفان یا معرفت بھی ہے اور مے الفت و محبت بھی، اور دوسری طرف حقیقت بھی۔ دوسری نظموں میں واردات و مشاہدات کا صحیح اور سچا عکس پیش کرتے ہیں۔ درد کی طرح اپنے موضوعات پر

نظمیں ہیں جن کی اساس جذبہ سے زیادہ فکر پر ہے۔ اور جہاں شاعر عالم محسوسات کا ترجمان بن کر حقائق کو ایسے انداز میں پیش کرتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے متأثر بھی ہوں اور غور و فکر پر بھی مائل ہوں۔ ہنگامۂ زرکوئی، افراد زادے، مکالمہ واردات شہود، جنبش شکوک، سکوت انسان، میکدۂ صفات، روح کی گہرائیاں، ہنگامۂ زندگی، واردات زندگی، پردۂ ہستی، زندگی اور موت، علم الانسان دل، اس طرح کی نظمیں ہیں جہاں حکیمانہ نکات کو شاعرانہ لباس پہنایا گیا ہے اور مشکل سے مشکل بات آسان لفظوں میں کہی گئی ہے۔

موضوعات کے اعتبار سے ان کی چند نظمیں وہ ہیں جنہیں بحیثیت مجموعی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں کہنا چاہیئے۔ شاعر کا دل ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہمیں اس کے ماحول کا صحیح عکس نظر آتا ہے۔ ماحول کا ایک رخ تو وہ ہے جس کا تعلق حسن فطرت سے ہے اور دوسرا وہ ہے جس میں انسان کی عملی زندگی کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔

درد نے بچوں کے لئے بھی نظمیں کہی ہیں اور طنزیہ اور مزاحیہ نظمیں بھی رقم کی ہیں۔ مزاحیہ نظموں میں "گھڑی میں کچھ ہے گھڑی میں کچھ ہے"۔ بے اور یہ بھی نیشن ہے بہت دلچسپ اور سبق آموز نظمیں ہیں۔ بچوں کے لئے "چاند ایک بچے کی زبان سے"، تتلی، بولو میاں مٹھو۔ ان کی قادر الکلامی کی آئینہ دار ہیں۔

درد نے اپنی شاعری میں مناظر فطرت کا بیان بھی بہت خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ ایسی نظموں میں شفق۔ چاندنی۔ برسات۔ سحر کے حسین منظر۔ قمر قوس و قزح۔ شام۔ صبح بنارس۔ اور شام اودھ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ مجموعی حیثیت سے درد بہت کامیاب نظم نگار شاعر ہیں۔ ان کی نظموں کے مطالعہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ شعر گوئی پر ان کو

کامل دستگاہ تھی اور زبان اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی میں بھی ان کو عبور حاصل تھا۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جو زبان استعمال کی ہے وہ نہایت سادہ رواں، پرکشش اور اثرانگیز ہے۔

درد کی نعتیہ نظموں کا جائزہ

درد کاکوروی نے اپنی نعتیہ شاعری میں کسی ایک رنگ کو اختیار نہیں کیا بلکہ انھوں نے صرف اس مقدس موضوع کو سامنے رکھا۔ سیدھی سادی نعت گوئی بھی کی ہے جو بالکل عوامی سطح کی ہے۔ اور زبان وبیان کی تمام نزاکتوں کے ساتھ قاآنی کے رنگ میں سراپائے رسولؐ بھی لکھا ہے۔ ایک دوسرے سراپا میں انھوں نے بڑی فارسی آمیز زبان کا استعمال کیا ہے۔ فارسی شعراء کی مشہور نعتوں کی تضمین کی ہیں نعت گوئی کے میدان میں انھوں نے عوام کے لئے سیدھی سادی زبان میں عقیدت اور محبت کے اظہار کے لئے بہت کچھ کہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نعتیہ (شاعری) صرف ان کے لئے نہیں ہے بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لئے نعتیہ شاعری کی ہے۔ نعتیہ شاعری کا مقصد ہمیشہ عقیدت کے اپنے اظہار اور اس سے ذاتی تسکین کے ساتھ مسلم معاشرہ میں پائے جانے والے ہر طبقہ کی جذباتی تسکین کرنا رہا ہے۔

اردو میں نعتیہ شاعری کا سب سے روشن دور انیسویں صدی میں تھا جب شمالی ہند میں اس صنف سخن پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دی گئی۔ انیسویں صدی کے نصف اول ہی میں اردو کے بڑے قدآور نعت گو شاعر منظر عام پر نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شہرت چاردانگ عالم میں

پھیل گئی۔ یہ تین شاعر مولانا غلام امام شہید، کرامت علی خاں شہیدی، اور محسن کاکوروی تھے۔ مولانا غلام امام شہید نے اردو کا پہلا مقبول عام میلاد لکھا جو نثر نگاری کا ایک شاہکار تھا اور اس کی نثر شعوری طور پر بلند خوانی کے لئے لکھی گئی تھی تاکہ اس کو میلاد کی محفلوں میں پڑھا جا سکے۔ یہ میلاد گھر گھر پہنچ گیا تھا خود اس میں نعتیہ شاعری کے بہت عمدہ اور شاندار نمونے شامل تھے۔ لیکن غلام امام شہید نے خاص طور پر نعت گوئی کو اپنا میدان بنایا تھا۔ وہ خود بھی والہانہ انداز میں میلاد پڑھتے تھے۔ انھوں نے فارسی اور عربی میں نعت گوئی کی اور ان سب میں بہت سادہ شاعری کے ساتھ ساتھ مرصع زبان میں بحر طویل کے قصیدے بھی کہے۔ کرامت علی خاں شہیدی نے بھی نعتیہ شاعری میں کئی فنی تجربے کئے۔ محسن کاکوروی نے نعت گوئی کو حد کمال تک پہونچایا۔ انھوں نے قصیدے کی دشوار زبان اور فنی کمالات کو بڑی خوبی سے اپنے نعتیہ کلام میں سمو دیا تھا۔ غلام امام شہید۔ کرامت علی خاں شہیدی اور محسن کاکوروی کے نام گھر گھر تک پہنچ گئے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو بلاشبہ ان کی زبان و بیان کی خوبی اور بلندی تھی لیکن ایک وجہ اور بھی تھی۔ ان تینوں بزرگوں کے پاس اُبھرے جذبات کی فراوانی تھی یہ والہانہ عقیدت اور والہانہ محبت کے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔ ان کی شاعری میں اس لئے کشش تھی کہ وہ ایک روحانی تجربے کی ترجمانی تھی۔ غلام امام شہید، کرامت علی خاں شہیدی، اور محسن کاکوری کے اثرات نے انیسویں صدی کے وسط ہی میں نعت نگاری کی ایک لہر پیدا کردی اور اردو میں پہلی مرتبہ اس صنف سخن میں شعوری طور پر اضافہ کرنے کی تحریک شروع ہو گئی۔

درد کاکوروی نے جب آنکھیں کھولیں تو زمین اور آسمان انھیں نورانی زمزموں سے گونج رہے تھے۔ گھر گھر میں میلاد شریف کی محفلیں ہوتی تھیں۔ غلام امام شہید کے

مولود یا اس کی تقلید میں لکھے جانے والے بے شمار اردو مولود پڑھے جاتے تھے۔ ہر گھر میں ان میلاد کا ہونا ضروری تھا گھروں کے اندر عورتیں بھی یہ مولود پڑھتیں، سنتی اور سناتی تھیں۔ کیونکہ گھروں میں میلاد شریف ہوتے تھے اس طرح سے بچوں کی تعلیم اور تربیت میں یہ میلاد خواں شعر و سخن میں تربیت کا کام کرتی تھی مشہور نعتیہ اشعار حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے۔ محسن کاکوری کا لامیہ قصیدہ مدیح خیر المرسلین ؎

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

اپنے جذبے اور محبت کے والہانہ اظہار کے ساتھ قصیدہ نگاری کے تمام اوصاف کا حامل ہے اور یہ اس دور میں بچے بچے کی زبان پر تھا۔ نعت گوئی کے سنہرے دور کے سایہ میں اردو شاعری نے نعت کو ہر طرح مالا مال کیا۔ اردو اس میدان میں فارسی سے کسی طرح پیچھے نہیں رہی۔

درد کاکوری پر اس مجموعی روایت کا پورا اثر ہے انھوں نے نعتیہ شاعری میں زبان و بیان کی مختلف سطحوں پر اپنی عقیدت کو شعر کا جامہ پہنایا۔ ایک بلند فنی سطح تو وہ ہے جس میں وہ فارسی اور اردو کی قصیدہ نگاری یا مشکل گوئی کے رنگ کا اظہار کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش میں خوشی کے مظاہرے اور سراپا کے نام سے اردو میں بہ رنگِ قاآنی کے نام سے ایک نعت کہی۔

بہ عیش گل ہزار ہا بہ نغمہ صد و سار ہا
بجشن نوبہار ہا بہ ساز عشق تار ہا
بہ رقصِ بادہ خوار ہا بہ کیفِ کوہ سار ہا
بہ چنگ و نے نگار ہا بہ مستی دخمار ہا
بصف بہ بیں ہزار ہا قطار در قطار ہا

چمن ہوا ہے آسماں جدول اس کی کہکشاں
ہے پھول پھول زرفشاں کمالِ حسن مہوشاں
صبا ہوئی ہے گل فشاں وہ لو چلی کشاں کشاں
کھلائے گل یہاں وہاں عجب ہے ایک گلستاں
ہے مست خود بھی بوستاں ہے کون آج آرہا
جو دشت و کوہسار ہے عجیب لالہ زار ہے
وہ پڑ رہی پھوار ہے نظر بہ جوئے بار ہے
صبا بھی بے قرار ہے لباس گل میں خار ہے
جوانی پر بہار ہے چمن جو زرنگار ہے
قطار در قطار ہے ہزار در ہزار رہا
ہے سرخ غنچوں کی قبا نوید گل میں ہے صبا
ہے چل رہی خنک ہوا گھرا ہے ابر جابجا
فلک پہ چھائی ہے گھٹا ہر اک روش ہے دلکشا
وہ تازہ پھول کھل گیا چٹک کے غنچہ بول اٹھا
صبا ہے کس کے آنے کا یہ گل بگل بجا رہا

انھوں نے ایک دوسرا سراپائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لکھا ہے جس کا تاریخی نام سراپائے جمیل حضورؐ انور ہے۔ اس میں بھی یہی مرصع زبان استعمال کی گئی ہے ع

جلوہ گر دل میں جو ہے ذوق سراپائے حضورؐ
نعت کے شوق میں ہر بیت ہو بیت المعمور
ہر ورق حسن مقدر سے ہو رقِ منشو
ہر سطر جس کی ہو والطور کتاب مسطور

سر بسر خلق نبیؐ خلق ہے جب قرآں کا
پوچھنا کیا ہے سراپا کے لئے عنواں کا

میں لکھوں اور سراپائے رسول اکرمؐ
اللہ اللہ یہ ہے بے ادبی بہر قسم
ہو گیا درد مگر لطف خدا سے ہمدم
نعت احمدؐ کے لئے آ گئے خود لوح و قلم

پردۂ غیب سے سامان یہ آیا جب ہاتھ
آ گئی آب شب قدر ہوں میں اس کی دوات

بہر توصیف ہوا وادیٔ ایمن کاغذ
نعت گوئی کے لئے طور ہے روشن کاغذ
للہ الحمد کہ ہے غیرت گلشن کاغذ
شوق میں نعت کے ہے نور کا دامن کاغذ

صل یارب علیٰ نور تقدم بمع سُبل
صل یارب علیٰ شاہ امم ختم رُسل

اردو میں ایک نعتیہ قصیدہ بہت مشہور اور مقبول تھا۔ کرامت علی خاں شہیدی نے سب سے پہلے اس زمین میں قصیدہ لکھا تھا جس میں اس دور کے مشہور متنازعہ مسئلہ "امکان خاتم النظیرین" کی طرف بھی اشارہ کیا گیا تھا۔ شہیدی کے قصیدے کا شعر تھا ؎

ہوا تجھ سا نہ ہو سکتا ہے میرا ہے یہی ایماں
نہ مانوں مسئلہ ہرگز کسی زندیق نے مرتد کا

اس قصیدے کی زمین میں بہت سے قصیدے لکھے گئے۔ محسن کاکوروی نے

بھی قصیدہ لکھا ہے جو اپنے زور بیان کے اعتبار سے لاجواب ہے ؎

مٹا نا لوح دل سے نقش ناموس اب و جد کا
دبستان محبت میں سبق تھا مجھ کو ابجد کا

محسن کاکوروی نے اپنے قصیدہ میں نزاعی پہلو کو نظر انداز کردیا۔ لیکن شہیدی کی زمین میں بہت سے جوابی قصیدے اس نزاع سے تعلق رکھتے ہیں۔ حافظ عبدالرحمن دہلوی نے اپنے قصیدہ میں شہیدی کے پورے قصیدہ کو رد کر دیا ہے اور اس مخصوص شعر کا جواب دیا ہے ؎

ترا ثانی بہ امکانِ وقوعی ہو نہیں سکتا
نفی امکانِ مطلق کی مگر ہے قول مرتد کا

درد کاکوروی نے بھی مذکورہ زمین میں نعتیہ قصیدہ کہا ہے ؎

یہ ہے میری زباں پر وصف کس نور مجرد کا
کہ ہے نوئے علی نور آج مطلع مہر سرمد کا
تنا ہے شامیانہ آج بسم اللہ کے مد کا
ہے ڈنکا بج رہا محشر میں کس کی آمد آمد کا
محمدؐ نام ہے نور ازل حسن مقید کا
حقیقت میں مخاطب تھا یہی کُن یا محمد کا

اس قصیدہ میں درد نے شہیدی کے قصیدہ اور اس کے جواب میں لکھے جانے والے قصیدوں کی بحث میں حصہ لیا۔ حافظ عبدالرحمن دہلوی نے شہیدی کے پورے قصیدہ کو رد کیا۔ درد کاکوروی نے شہیدی کی طرف سے جواب میں یہ اشعار کہے ہیں ؎

نظیر اور مثل احمدؐ کا نہیں ممکن نہیں ممکن
کہ ہے ختم النبی ختم الرسل صغریٰ محمدؐ کا

نفی امکانِ مطلق کی اسی سے صاف ظاہر ہے
جسے شک ہے تو پھر ایماں کہاں ایسے متردّد کا
محمد مصطفٰے سے جب مرے حق کو محبت ہے
تو امکاں غیر کی الفت کا ساماں ہے نرا رد کا

نعتیہ شاعری میں قصیدہ کا رنگ، رنگین بیانی اور مرصع زبان شاعرانہ کمال کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ آمد سے زیادہ آورد، زبان پر ماہرانہ قدرت، شعری روایتوں سے آگاہی اور صنائع و بدائع سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔ درد کاکوروی نے فارسی کی نعتیہ شاعری اور اردو شاعری کے ممتاز نمونوں پر جو تضمین کہی ہیں ان میں ان کے علم اور معلومات کی پوری جھلک پائی جاتی ہے۔ بہت سی نعتیں انھوں نے مشہور نعتیہ نظموں اور قصیدوں کی زمین میں کہی ہیں۔ محسن کاکوروی کی زمین میں انھوں نے ایک نظم اور بھی کہی ہے جس کے کچھ اشعار ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں ؎

کہا جب یا محمدؐ حق نے حرفِ کُن کے دفتر میں
مجسم ہو گیا نورِ خدا محبوب پیکر میں
عجب پھیلی ہے خوشبو صبحِ میلادِ پیمبر میں
جہاں کا ذرہ ذرہ بس گیا ہے کس گل تر میں
تجلی نورِ مطلق کی مقید ہے یہ منظر میں
ڈھلا ہے یا خدا کا نور اس پاکیزہ پیکر میں
جمالِ مصطفٰے ہے نور افگن ماہ انور میں
جلالِ مجتبٰی کا عکس روشن مہرِ خاور میں

انھوں نے محسن کاکوروی سے گہرا اثر قبول کیا ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے وہ شعوری طور پر محسن کاکوروی کی پیروی کرنے پر مجبور بھی تھے۔ "صبح عید میلاد"

میں بھی انھوں نے چھوٹی بحر میں محسن کی پیروی کی ہے۔ نعتیہ مثنوی کی پیروی کی ہے اس میں تشبیہ استعارہ اور علامتوں کا بہت ہی ماہرانہ استعمال کیا ہے ؎

بیضاوی صبح عید میلاد — کشاف نقاب حسن دل شاد
واللیل کے خواب کی تعبیر — والفجر کی والضحیٰ کی تفسیر
والفجر کا حاشیہ ہے والشمس — یا عید کا غاشیہ ہے والشمس
صبح میلاد کی یہ تنویر — ہے کلک جمال حق کی تحریر
کس درجہ سحر ہے بے مثالی — آئینہ حسن ذوالجلالی

درد کاکوروی نے جامی نظامی قدسی اور خسرو کے فارسی کلام پر جو خمسے کہے ہیں ان میں اصل کلام کے رنگ کا لحاظ رکھا ہے۔ اس طرح اردو کے قدیم اور جدید نعت گو شاعروں کے نعتیہ کلام پر ان کی تضمین ہیں اصل کلام کی زبان اور کیفیت سے پوری ہم آہنگی برقرار رکھی ہے۔ صاف اور سادہ لیکن سوز اور گداز سے بھرپور زبان میں خواجہ الطاف حسین حالی کی زبان سے ایک قصیدہ بطور "عرض حال" نکلا ہے جو بارگاہِ رسالت مآب میں اُمت کے زوال اور ادبار کا حال بیان کرتے ہوئے درحقیقت ایک استغاثہ ہے۔ حالی کی یہ نعت اردو کی مذہبی شاعری میں انتہائی مقبول نعت ہے ایک زمانے میں یہ گھر گھر پڑھائی جاتی تھی۔ مذہبی اور ملی جلسوں کا آغاز اسی نعتیہ کلام سے ہوا کرتا تھا ؎

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

درد کاکوروی نے اس کی تضمین میں وہی کیفیت اور سوز و گداز اپنے مصرعوں میں بھر دیا ہے جو حالی کے یہاں جلوہ گر ہے۔ درد کاکوروی فرماتے ہیں ؎

جو چاند کہ روشن تھا سر چرخ کہن سے
جو لعل تھا قیمت میں گراں لعل یمن سے

جو پھول کے آیا تھا مدینے کے چمن سے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

وہ دین ہوا دشتِ جہاں جس سے گلستاں
وہ دین ہوا جس سے دو عالم گل خنداں
وہ دین ہوئی شانِ خدا جس سے نمایاں
وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں
آج اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

درد کاکوروی نے اپنی نعتیہ شاعری میں اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار طرح طرح سے کیا ہے۔ بعض بہت مشکل ردیفوں میں بھی طبیعت کی جولانی دکھائی ہے چنانچہ ایک قصیدہ "انشاءاللہ" کی ردیف میں کہا ہے ع

حوض پر ہم بھی جگہ پائیں گے انشاءاللہ
جامِ کوثر کے لئے جائیں گے انشاءاللہ
ناخدا تجھ کو مبارک رہے کشتی تیری
ہم یونہی پار اتر جائیں گے انشاءاللہ
گو گنہگار ہیں آغوشِ نبیؐ میں لیکن
لطف و رحمت سے جگہ پائیں گے انشاءاللہ
حضرت احمدؐ مختار کو دیکھیں گے جہاں
ہم وہیں قدموں پہ گر جائیں گے انشاءاللہ

اور آخر میں رجائیت اور یقین سے معمور مقطع بھی کمال کا ہے ع

درد ہم اور یہ مجلس کے ہمارے ہمدم
سب یہ کوثر پہ نظر آئیں گے انشاءاللہ

انھوں نے نعتیہ شاعری کے عام موضوعات کا احاطہ بھی کیا ہے اور مدینے میں حاضری کی آرزو بھی کی ہے۔ مدینے کے فضائل بیان کئے ہیں اور مدینہ کی فضاؤں میں گم ہو جانے کی تمنا بھی کی ہے "روضۂ مقدس" کے عنوان سے ایک نظم کے چند بند ملاحظہ فرمائیں ع

اے جذبۂ دل لے چل ——— للہ وہیں لے چل
کب لطف ہے جینے میں اے قلب حزیں لے چل
پھر درد ہے سینے میں اے ذوق حسیں لے چل
عشرت کے سفینے ہیں فردوس بریں لے چل
یعنی کہ مدینے میں ہیں شہِ دیں لے چل
اے جذبۂ دل لے چل ——— للہ وہیں لے چل

اے جذبۂ دل تجھ پر یہ عزم سفر قرباں
اے جذبۂ دل تجھ پر اشکوں کے گہر قرباں
اے جذبۂ دل تجھ پر یہ دردِ جگر قرباں
اے جذبۂ دل تجھ پر یہ ذوق نظر قرباں
اے جذبۂ دل لے چل ——— للہ وہیں لے چل

جس وادیٔ رحمت میں انوار برستے ہیں
جس عہد نبوت میں انوار برستے ہیں
جس عہد رسالت میں انوار برستے ہیں
جس مشہدِ رحمت میں انوار برستے ہیں
اے جذبۂ دل لے چل ——— للہ وہیں لے چل

نعتیہ شاعری میں سلام کی بھی اپنی الگ اہمیت ہے۔ یہ ایک اُمّی کی جانب سے

دربار رسالتؐ میں ذاتی عقیدت اور محبت کا نذرانہ ہوتا ہے۔ درد کاکوروی نے قدیم اور جدید طرز کی نعتیہ شاعری کے تمام رنگ اپنی نظم ظہور قدسی مع درود سلام میں سمو دیئے ہیں۔ ابتدا ظہور قدسی یعنی ولادت باسعادت کے تذکرہ سے ہوتی ہے ؎

سحر کا وقت ہے رنگین جلوے مسکراتے ہیں
فضائے دہر میں معصومیت کے گیت گاتے ہیں
ترانے گا رہے ہیں سب زمیں سے آسمانوں تک
درودوں کے ہیں نغمے رقص میں دل سے زبانوں تک

یہ عالم ہے سمٹ آیا اجالا ایک مرکز پر
یہ عالم ہے کہ ہے مستی کی موجیں لے رہا کوثر
ہوائیں صبح کے پھولوں کے دل میں گدگداتی ہیں
ضیائے نور سے شبنم کے موتی جھلملاتی ہیں
چھلک اٹھی شراب نور تاروں کے کٹوروں سے
مہک اٹھی عجب خوشبو بہاروں کے سکوروں سے
منور ہوگئی ہے سنگ اسود کی سیاہی بھی
شفاعت کے لئے مضطر ہوئی ہے بے گناہی بھی

اور اس کے بعد ولادت باسعادت پر تہنیت و مبارک باد پیش کی ہے۔

مبارک نور رب العالمیں تشریف لائے ہیں
مبارک ہو شفیع المذنبیں تشریف لائے ہیں
مبارک ناظر و منظور حق تشریف لائے ہیں
مبارک جلوۂ صد طور حق تشریف لائے ہیں
مبارک بے عدیل و بے بدل تشریف لائے ہیں
مبارک نور نور لم یزل تشریف لائے ہیں

اور اس کے بعد انھوں نے درود اور سلام کا فرض ادا کرتے ہوئے یہ شعر کہے۔

درود ان پر کہ جن کا کام حق کا کام ہے گویا
سلام ان پر سلام ان پر یداللہ ہاتھ ہے جن کا
درود ان پر کہ جن سے نسل آدم کو ملی عزت
سلام ان پر کہ جن سے سارے عالم کو ملی عزت
درود ان پر جو پتھر باندھتے ہیں بھوک میں اکثر
سلام ان پر جو مسکینی سے سوتے تھے چٹائی پر
درود ان پر جنھوں نے حق کی خاطر سختیاں جھیلیں
سلام ان پر جنھوں نے بد دعا سن کر دعائیں دیں

اس کے بعد جناب درد کاکوروی نے سلام کے متعدد اشعار کہے ہیں، جن میں نئے طرز کی نعت گوئی کا رنگ ہے اور اسلامی تعلیمات کے حوالے سے بارگاہ رسالت مآب میں اپنی عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے

سلام اے آمنہ کے لال مہر و امن کے بانی
سلام اے حاصلِ انسانیت، تا حدِّ امکانی
سلام اس پر اخوت کا سبق جس نے دیا ہم کو
سلام اس پر کیا کافور جس نے ظلم کے غم کو
سلام اس پر محبت جس نے سکھلائی زمانے کو
سلام اس پر صداقت جس نے دکھلائی زمانے کو
سلام اس پر کیا جس نے معزز ابنِ آدم کو
برابر حق دیے جس نے تمام اقوام عالم کو
سلام اس پر نکالا جس نے ہم کو دام باطل سے
جہاں میں زاویے جس نے تخیل کے بدل ڈالے

سلام اس پر کہ جس نے زیست کے آداب سکھلائے

جسے انسانیت کہتے ہیں وہ اخلاق بتلائے

سلام اس ذات پر جس نے غلامی سے نکالا ہے

کہ جس سے آج تک آزادیوں کا بول بالا ہے

ان کی نعت گوئی میں جو کیفیت ہے وہ سادہ گوئی میں بھی نظر آتی ہے۔ اور مرصع زبان میں بھی لیکن ان کے شاعرانہ کمال کا اظہار دراصل اسی مرصع زبان میں ہوا ہے جس میں قصیدوں کی آب وتاب نظر آتی ہے یا پھر ایسی نظموں میں جو رنگین بیانی اور رنگین زبانی کا شاہ کار ہیں۔ ایسی ہی ایک نظم "بہار ولادتِ ختم المرسلین" ہے۔ جس کی ابتدا انھوں نے یوں کی ہے ؎

ولادتِ حضورؐ کی عجیب کچھ بہار ہے

خدا جو نور بار ہے بہشت جاں نثار ہے

نسیم مشک بار ہے شمیم عطر بار ہے

بنفشہ اور یاسمن قطار در قطار ہے

جو دشت وکوہ سار ہے عجیب لالہ زار ہے

روش جو سبزہ زار ہے بہار ہی بہار ہے

پیام گل میں ہے صبا ہے سرخ غنچوں کی قبا

جہاں میں آج آرہا حبیبِ کردگار ہے

اس کے بعد انھوں نے خالص رومانی انداز میں بہار پر یہ اشعار کہہ کر اپنی شاعری کے کمال کا مظاہرہ کیا ہے ؎

یہ عنبریں کیاریاں یہ اخضریں کیاریاں

یہ احمریں کیاریاں یہ دل نشیں کیاریاں

کیا دیاں یہ رنگ و بو یہ سرخیاں یہ رنگ و بو
تجلیاں یہ رنگ و بو عجیب کچھ خمار ہے
شراب حسن زندگی پیے ہوئے ہر اک کلی
اسی کا اس نگاہ کو حسین انتظار ہے

نعتیہ شاعری ہر حال میں اپنے عقیدے کے جذبہ کا اظہار ہوتی ہے۔ عقیدت کا یہ جذبہ ضروری نہیں کہ اعلیٰ درجہ کے فن یا بلند پایہ شاعری کی شکل میں ظاہر ہو لیکن کوئی بھی بڑا شاعر شعری روایات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہی اس کے سامنے مثال ہوتی ہے۔ درد کاکوروی نے بھی نعت گوئی کے میدان میں نعتیہ شاعری کے مثالی شاعروں اور ان کی نعتیہ شاعری کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ ان کی یہ شعوری کوشش خصوصیت کے ساتھ ان کی تضمینوں میں نظر آتی ہے جن میں زبان و بیان فطری طور پر اصل شاعر کے رنگ و آہنگ کے پابند ہیں جن کے اشعار پر درد کاکوروی نے تضمین کی ہے لیکن نعتیہ شاعری میں درد کا کمال صرف یہیں تک محدود نہیں ہے۔ انھوں نے عقیدت کے جذبات کا آزادانہ اظہار بھی کیا ہے اور اس اظہار میں زبان و بیان کی سادگی بھی ہے اور سوز و گداز بھی۔ اس رنگ کی شعر گوئی میں وہ اپنی انفرادیت پوری طرح اجاگر کرتے ہیں۔ نعت گوئی سے ان کا مقصد اپنے لئے دوسری دنیا میں بہتری کی طلب ہے۔ یہی نعت گوئی کا بنیادی مقصد بھی ہے۔ بڑی سادگی اور روانی کے ساتھ انھوں نے مناجات میں اپنی نعت گوئی کا یہ مقصد بیان کیا ہے ؎

یا رب مری تجھ سے التجا ہے
صدقے میں حبیبؐ کے دعا ہے
آساں مری مشکلات کر دے
دامن گل آرزو سے بھر دے

بگڑی نہیں اب بنائے بنتی
ہے تیرے ہی ہاتھ لاج میری
صدقہ شہدائے کربلا کا
کر دے مری آرزو کو پورا
نکلے مری روح جب تن سے
یوں پڑھتی ہوئی درود نکلے
یارب صلی علی محمدؐ
نورِ رب العلا محمدؐ

درد کاکوروی کی نعتیہ شاعری کا مجموعی جائزہ یہ بتاتا ہے کہ ان کے پاس نہ جذبہ کی کمی ہے اور نہ اس کے اظہار کی۔ والہانہ عقیدت کا جذبہ ان کی نعتیہ شاعری کا محرک ہے اور یہی جذبہ ان کو نعتیہ شاعری میں مختلف میدانوں میں لے جاتا ہے۔ اور ان کی نعتوں میں ہر رنگ نظر آتا ہے۔ سادگی بھی ہے۔ اور صفائی بھی وہ ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے ساری کائنات میں ایک ہی نور کا جلوہ دیکھتے ہیں اور اس دنیا میں نور ازل کا سب سے مظہر ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی نظر آتی ہے۔ یہی عشق ان کے لئے سرمایۂ جان ہے۔ نجات کا راستہ رسول اللہؐ کا نام لینا اور آپ سے شفاعت کی طلب کرنا ہے۔ یہ درد کاکوروی کا خانقاہی مسلک اور عقیدہ ہے جو ان کی تمام عمر شاعری میں جاری وساری ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری بھی ان کے اس مسلک اور عقیدہ کی ترجمان ہے اپنی کئی نثری تصنیفات میں بھی انھوں نے اس مسلک کی وضاحت کی ہے۔ اور شاعری میں بھی وہ اس کی وضاحت اور ترجمانی کرتے ہیں۔ بیسویں صدی میں نعتیہ شاعری بہت کچھ بدل گئی لیکن درد کاکوروی نے اس کا قدیم رنگ قائم رکھا۔

یہی ان کا سب سے بڑا وصف ہے۔

فنا ہو کر رضائے حق میں اس رتبے کو پہنچے ہیں
بنا دیں دشت کو فردوس دیوانے محمد کے
کہا کرتی ہے دوزخ سرد ہو جاؤں نہیں بالکل
نہ آنے پائیں میرے پاس پروانے محمد کے

تاریخی اور مذہبی نظمیں

درد کاکوروی بنیادی طور پر تصوف کے مسلک میں وجودی مسلک کے پیرو ہیں اس لئے ان کی تمام مذہبی شاعری پر وحدت الوجود کے فلسفہ کا غلبہ ہے۔ مذہب ان کے لئے کوئی روایتی چیز نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کا ایک ایسا نظریہ ہے جس کے توسط سے وہ اپنے وجود کی بھی تشریح کرتے ہیں اور تمام کائنات کی بھی ان کا مذہب ان کی شاعری کی جان ہے اور ان کی شاعری ان کے مذہب کا اظہار ہے لیکن یہ وہ مذہب نہیں ہے جو تنگ نظری سکھاتا ہے۔ اور انسان کو انسان سے دور کرتا ہے۔ ایک انسان اور ایک مسلمان کی حیثیت سے درد کاکوروی کے سامنے زندگی کا مقصد بالکل واضح ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جائے اور اسی سے ہدایت اور نجات طلب کی جائے۔ اس کی بے پایاں رحمت پر یقین رکھا جائے اور اسی رحمت کی طلب میں زندگی بسر کی جائے۔ اس جذبے کے اظہار میں انھوں نے بے شمار شعر کہے ہیں۔ جو ان کے کلام میں جا بہ جا بکھرے ہوئے ہیں ان کی شاعری میں مذہب پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے انھوں نے حمد و مناجات کی صورت اپنے جذبۂ اسلامی کا بڑا دلکش اظہار کیا ہے یہ عبودیت کا جذبہ ہے جس میں اپنے اعمال پر شرمندگی بھی شامل ہے

اور رحمت و مغفرت کی طلب بھی، امید بھی ہے اور یقین بھی۔

جرم سارے بخش دے پروردگار
ہم گنہگار اور تو آمرزگار
ہے گناہوں سے بہت شرمندگی
ہو سکی مطلق نہ ہم سے بندگی
جان خستہ لب پہ آہِ سرد ہے
دل رہین یاس و تف درد ہے
سینہ بریاں اور ہے افسردہ دل
چشم گریاں اور ہے جاں مضمحل

بندگی کے اس جذبے کے ساتھ ساتھ ان کو بندہ نوازی کرنے والے کی رحمت پر بھی پورا یقین و ایمان ہے۔

ہم ہیں بے کس اور تو بے کس نواز
ہم ہیں ناکام اور تو ہے کارساز
ہم سیہ کار اور تو ستار ہے
ہم گنہگار اور تو غفار ہے
ہم ہیں بندے اور تو بندہ نواز
دیر کیا ہے اپنے بندوں کو نواز

بارگاہ الٰہی میں ان کی التجا کا مقصد ہدایت کے راستہ کی رہنمائی ہے۔ ایک صوفی کی طرح وہ خدائے پاک سے توفیق مانگتے ہیں کہ نفس کی گمراہیوں سے نکلنے کا راستہ نظر آجائے اور اس پر چلنے کی سعادت نصیب ہو جائے ؎

ہے نہ توشہ اور نہ زاد راہ ہے
ساتھ اپنے نفس بد گمراہ ہے

نفس و شیطاں سے یہ دل بیزار ہے
تو اگر چاہے تو بیڑا پار ہے

جو رہنمائی اور جو ہدایت انھوں نے طلب کی ہے وہ یقیناً ایک صوفی کے دلِ دردمند کی پکار ہے۔ وہ منزلِ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور یہاں تک پہنچنے کے لئے طریقت کے راستے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ کہ اس کی انھوں نے طلب کی ہے ؎

ہم کو اپنے عشق سے کر سرفراز
پھر ہمارے دل میں بھر دے اپنا راز
میری آنکھوں میں بنا لے اپنا گھر
تاکہ آنکھوں سے تو ہی آئے نظر
بجلیاں عرفان کی بھر دے تمام
تاکہ ہر شے سے سنوں تیرا کلام
اے خدا کر عشق میں کامل ہمیں
نور سے کر دے تو بینا دل ہمیں

انھوں نے حدیث و قرآن سے قبولیت والی دعاؤں کا ایک انتخاب "مناجات مکرم" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اور ان دعاؤں کو ہفتہ کی سات منزلوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ ایک طویل مناجات ہے۔ اور اپنی سات منزلوں میں اس کی ہر منزل الگ الگ کیفیت کی حامل ہے۔ اس طویل مناجات میں بیان کی ندرت الفاظ کی شوکت اور تخیل کی بلند پردازی پوری طرح موجود ہے۔ اور ان کا دردِ دل میں ایمان کے ساتھ ساتھ ذہن کو شاعرانہ کیفیات سے لبریز کر دیتا ہے "مناجات مکرم" میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے صفات کو دہرا کر ہر اسم کی مطابقت سے دعا

مانگی گئی ہے۔ اور ان تمام دعاؤں کا حاصل یہ ہے کہ ؎

اللہ اللہ دل کو بھر دے نور سے

اللہ اللہ مست کر دے نور سے

یہ مناجات اپنے سوز و اثر کے سبب اہل معرفت میں بے حد مقبول ہوئی۔ اور اللہ کے بے شمار بندوں نے اس کو اپنے روزانہ کے ورد کا ایک حصہ بنالیا۔ پہلی مرتبہ یہ مناجات "آہ مرد" کے نام سے ۱۳۴۸ھ میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۳۹۱ھ میں "مناجات مکرم" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ بعد میں اس کی بہت سی اشاعتیں ہوئیں درد کاکوروی نے قرآن و حدیث سے لی جانے والی دعاؤں کے مشہور مجموعہ "حصن حصین" سے یہ دعائیں منتخب کی ہیں۔ اور ان کو مثنوی شریف کی طرز میں نظم کیا ہے۔ شاعرانہ کمال یہ ہے کہ ہر اسم صفت کے حوالے سے ایسی دعائیں مانگی ہیں جو اسم صفت کے پرتو سے تعلق رکھتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

ہر گھڑی یہ آرزو ہے یا سلام
تو بنا دے گھر مرا دار السلام

دے مجھے یا مومن امن و امان
کیونکہ ہے شیطان دشمن بدگمان

تو بچا جبار ہم کو جبر سے
رحم فرما عافیت بھی بخش دے

دور کر متکبر کبر و غرور
ہم ہیں عاجز ہر طرح تیرے حضور

ہم پہ ہو یا خالق چشم کرم
دین دنیا کا نہ ہو کچھ درد و غم

بخش یا غفار میرے سب گناہ
ہے گناہوں سے بہت حالت تباہ
دیکھ مت قہار چشمِ قہر سے
کام لے مولا تو لطف و مہر سے
یا علیمُ علم باطن کر عطا
دے مجھے انوار تسلیم و رضا
یا مُذلُّ ہم کو ذلت سے بچا
از طفیل شافعِ روزِ جزا
یا متینُ کر عطا سنجیدگی
جس کا ہر انجام ہو عیش و خوشی
صلِّ یارب بر محمد مصطفےٰ
صلِّ بر اصحاب آلِ مجتبےٰ

"مناجات مکرم" میں دین اور دنیا کی بھلائیوں کی طلب کو ایک جگہ سمو دیا ہے واقعی یہ ایک بہترین دعا نامہ ہے۔ عوام اور خواص دونوں میں اس کی غیر معمولی مقبولیت اس بات کی دلیل ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں انسانی دلوں کی یہ ایک آواز ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر ایمان والے کے دل اور دماغ کی آواز ہے۔

درد کاکوروی کی مذہبی شاعری میں امام بوصیری کے قصیدۂ بردہ کا منظوم ترجمہ بھی شامل ہے۔ جو مثنوی مولانا روم کے طرز میں ہے۔ امام بوصیری کا قصیدہ عالمی شہرت رکھتا ہے۔ خانقاہوں میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

امام بوصیری کا انتقال ۶۹۵ھ میں ہوا تھا اور یہ قصیدہ انھوں نے ۶۸۰ھ میں اس وقت کہا تھا جب وہ فالج میں مبتلا ہو کر اپنی صحت کی طرف سے مایوس

ہو چکے تھے اسی عالم میں یہ قصیدہ کہا ہے اور خواب میں آنحضرت کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضورؐ نے اپنے دست مبارک کو ان کے جسم پر پھیر کر اپنی چادر اڑھادی۔ اس کے بعد امام بوصیریؒ بالکل صحت یاب ہو گئے۔

دردؔ کاکوروی نے اس کے عربی، فارسی اور اردو کے قدیم ترجمہ کو سامنے رکھ کر اپنا منظوم ترجمہ کیا۔ قصیدہ کے ہر عربی شعر کی پوری تشریح اور وضاحت انھوں نے اردو اشعار میں کی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر ایک اصل عربی شعر کا ترجمہ اردو نظم میں بغیر وضاحت تو ہو سکتا تھا لیکن یہ ترجمہ لفظی ترجمہ ہو جاتا اور اس طرح مکمل طور پر معنی سامنے نہ آتے۔ دردؔ کاکوروی نے اپنے منظوم ترجمے میں یہ طریقہ اختیار کیا کہ جہاں اصل عربی شعر کا مفہوم ایک یا دو اردو اشعار میں ادا ہو گیا وہاں ایک یا دو شعروں پر ہی اکتفا کیا ہے۔ لیکن جہاں پورا مفہوم ادا کرنے کے لئے ضرورت سمجھی ہے وہاں ایک شعر کے معنی کو اردو میں منتقل کرنے کے لئے تین چار اور پانچ شعر بھی کہے ہیں۔ مثال کے طور پر دسویں شعر میں مناجات و عرضِ حاجات، ایک درجن عربی اشعار کا ترجمہ تیس سے زیادہ اردو اشعار میں کیا گیا ہے۔ اور صرف ایک پہلے شعر کا ترجمہ مندرجہ ذیل سات شعروں میں ہے:

یا اکرم الخلق مالی من الوذ بہ

سواک عند حلول الحادث العمم

اردو ترجمہ:

اکرم و احسن امام الانبیاء	اعظم و اشرف محمد مصطفےٰ
ہوں اکیلا سو بلائیں سر پہ ہیں	کس کے دامن میں پناہ لوں جا کے میں
کون ہے عالم میں حضرت کے سوا	میرا حامی اے امام الانبیاء
یا محمد مصطفےٰ فریاد ہے	نفس سرکش بر سر بیداد ہے

فیض اللہ مار حسم کا ہے سوال | بہر عشرت اے حبیب ذوالجلال
التجا مظلوم کی سُن لیجئے | یا محمد دستگیری کیجئے
افضل و اکمل محمد مصطفٰےؐ | اب کرم فرمایئے بہر خدا

اُن کی شاعری میں جو مذہبی رنگ ہے وہ بیسویں صدی میں انھیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتا ہے۔ سندھ یونیورسٹی، حیدر آباد کے ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں نے ان کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے:

"حالیؔ اور اقبالؔ کی قومی شاعری اور ترقی پسند مصنفین کی اشتراکی شاعری کے بعد دردؔ صاحب کی یہ دینی اور اسلامی شاعری بلاشبہ ایک نئی روایت کا اضافہ ہے۔ جسے اردو ادب کی تاریخ میں ایک فال نیک تصور کرنا چاہیئے۔ صوفیانہ خیالات، اخلاقی مضامین اور مذہبی تعلیمات کو دردؔ صاحب نے بڑے اچھے پیرائے میں نظم کیا ہے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ از اول تا آخر صبغت اللہ میں رنگا ہوا ہے"[1]

دردؔ کاکوروی کی مذہبی شاعری میں حمد اور منقبت بھی ہیں۔ انھوں نے متعدد حمد شان خداوندی میں لکھی ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدین کی شان میں انتہائی عقیدت کے ساتھ منقبتیں قلم بند کی ہیں۔ دو حمد سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تو فراز عرش بریں سہی یہ جبیں بہ روئے زمیں سہی،
مرے سجدے ہیں ترے واسطے ہیں کہیں سہی تو کہیں سہی
مرے سر کو سجدے کی آرزو ہے بہت زمانے سے اے خدا
ترے نقش پا سے قریب ہی مرا ایک نقش جبیں سہی

---

[1] مقدمہ از غلام مصطفٰے خاں پروفیسر عربی مشمولہ صوفیانہ نظمیں ص ۷

ایک صوفی کی حیثیت سے ان کو آلِ رسولؐ سے بھی والہانہ محبت اور عقیدت ہے اور تمام بزرگانِ دین سے بھی ان کی عقیدت کا یہی عالم ہے۔ انھیں کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی تمنا ان الفاظ میں بیان کی ہے

نہ غم خوار کوئی نہ کوئی ہے یاور
ہے ہر فرد امت پریشان و مضطر
بس اب دستِ رحمت رکھو امت کے سر پر
الٰہی بہ تصدیقِ صدیقِ اکبرؓ
وزیرِ صداقت مآلِ محمدؐ

الٰہی سوا تیرے کس سے کہیں ہم
جو ہے مضطرب دل تو ہے چشم پرنم
ستم کچھ ستمگر کے ہوتے نہیں کم
الٰہی بہ انصافِ فاروقِ اعظمؓ
امیرِ عدالت سگالِ محمدؐ

ہے ہر اک مسلمان کی آنکھ گریاں
جو ہے آنکھ گریاں تو سینہ ہے بریاں
اب امت کی ہر ایک مشکل ہو آساں
الٰہی بہ اکرامِ عثمانِؓ عفاں
کہ شد کشتہ در امتثالِ محمدؐ

ادب سے یہی عرض ہے سر جھکا کر
خدایا کہاں تک یہ خوں ریز منظر

پریشاں ہے امت کرم کر کرم کر
الٰہی بہ تکریم و اعزاز حیدرؓ

کرہ ظاہر شد عزم و کمال اُمید

دردؔ کاکوروی نے اسلامی تاریخ کے جن نمایاں بزرگوں کی شان میں جو کچھ کہا ہے اُن میں خلفائے راشدین بھی ہیں اور صحابۂ کرام بھی۔ آلِ رسول ہیں، اہل بیت بھی ہیں۔ اسی طرح شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری جیسے بزرگ صوفیائے کرام کو انھوں نے اپنی نسبت اور عقیدت کے نذرانے پیش کئے ہیں۔ خود اپنے پیر و مرشد شاہ علی حیدر قلندر کو بھی وہ بار بار عقیدت کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی ساری شاعری جذبے اور سوز اور گداز سے مملو ہے۔ غیر مذہبی شخصیتوں پر انھوں نے ایسی توجہ نہیں کی ہے لیکن شاید بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب ترکی خلافت کے زوال کے بعد ترکی پر یونان نے حملہ کیا تھا تو ہندوستان اور سارے عالم اسلام میں ترکی سے ہمدردی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ ترکی کی آزادی اور سالمیت کی جنگ لڑنے والے مصطفےٰ کمال اتاترک کو ہندوستان کے مسلمانوں کی نظر میں بھی غیر معمولی احترام حاصل ہو گیا تھا اسی ماحول میں دردؔ نے ایک نظم میں مصطفےٰ کمال کو اپنی عقیدت کا خراج پیش کیا تھا۔ یونان پر ترکوں کی زبردست فتح کا تذکرہ کرتے ہوئے دردؔ نے کہا ہے ؎

یوں تاج و تخت چھینیں گے ہم ہاں ابھی تو اور
ہے جوشِ قوم قلب میں پنہاں ابھی تو اور
دشمن سے ہوں گے دست و گریباں ابھی تو اور
لائے گا رنگ خونِ شہیداں ابھی تو اور

جب تک مٹا نہ دیں گے عدو کے نشان کو
واپس کبھی نہ آئیں گے اپنے مکان کو

نظم کے آخری بند میں دربارِ خداوندی میں مسلمانوں کے لئے دست بہ دعا ہیں ؎

یارب سیادت اور وہ شوکت نصیب کر
کانپ اٹھیں غیر ہم کو وہ سطوت نصیب کر
سائل ہو ہم سے غیر وہ دولت نصیب کر
اسلام کو وہ شانِ حکومت نصیب کر

یہ دردِ دل کی عرض ہے صدقہ رسول کا
یارب اس التجا کو شرف دے قبول کا

درد کی نظموں کی مجموعی خصوصیات

درد کاکوروی کی شاعری میں لکھنوی شاعری کی روح اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ وہ زبان و بیان کی پاکیزگی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ خیالات ہوں یا جذبات و احساسات کی ترجمانی، بلندی اور لطافت ان کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ اپنی نظموں میں بھی انھوں نے اپنا انفرادی رنگ برقرار رکھا ہے۔ وہ نہ تو مغربی شاعری سے متاثر ہوئے ہیں اور نہ اس کی تقلید کی ہے۔ اردو میں بھی وہ کسی کے مقلد نہیں ہیں۔ ان کے دورِ شباب میں اردو شاعری کی سب سے جدید اور مقبول تحریک رومانی تحریک تھی۔ درد کاکوروی پر اس کا اثر بہت ہلکا نظر آتا ہے۔ لیکن ان کی نظم نگاری میں مناظرِ فطرت کی تصویر کشی اسی رومانی تحریک کا اثر ہے اس کے باوجود انھوں نے فطرت کے حسن و جمال میں جو جلوہ دیکھا ہے وہ رومانی تحریک کے شاعروں کو کبھی نظر نہیں آیا۔ جو جمالیات برائے جمالیات کے قائل تھے لیکن درد صاحب جمالیات برائے حقیقت شناسی کے ترجمان ہیں۔ ان کی نظم نگاری بھی کائنات میں پوشیدہ ایک ہی حقیقت کے اظہار کا نغمہ ہے۔

اردو کے معتبر نقاد پروفیسر وقا عظیم نے درد کی نظم نگاری پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے بالکل بجا لکھا ہے :-

"درد صاحب نے بھی ہر اچھے شاعروں کی طرح دوسرے اچھے شاعروں کے خیال اور اسلوب سے اثر قبول کیا ہے اور اسے کامیابی کے ساتھ اپنایا ہے۔ ان کے کلام میں حفیظ کے گیتوں کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے اور قاآنی کے مترنم بحروں کا رقص بھی۔ حسرت اور جگر کے انداز تغزل کا رنگ بھی اور اقبال کے پیام جاوداں کا عکس بھی لیکن ان گوناگوں اثرات کو انھوں نے اس طرح اپنایا ہے کہ ان کی انفرادیت چھپی نہیں رہتی۔" [۱]

ان کی یہ انفرادیت ان کی تمام شاعری میں نمایاں ہے۔ ان کی نظم نگاری بھی اپنی ایک خاص زبان رکھتی ہے۔ ایک طرف وہ شعر و سخن کے ذخیرۂ الفاظ میں سے تمام ضروری اور مناسب الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ تصوف کی علمی اصطلاحوں اور علامتوں کا برمحل استعمال کر کے مجازی شاعری کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتے ہیں۔ ہر مقام پر مجاز کا پردہ ہٹا کر حقیقت کی جھلک دیکھتے ہیں اور اس جھلک کو بڑے دلکش اور دلنشیں انداز سے پڑھنے والے کے سامنے بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ ان کے فن کا کمال ہے۔ ایسا کمال صرف اسی وقت کسی شاعر کو حاصل ہو سکتا ہے جب وہ اردو اور فارسی شاعری کی اعلیٰ روایتوں سے پوری طرح واقف ہو۔ درد کاکوروی ہماری اس بزرگ نسل سے تعلق رکھتے تھے جس نے مشرقی علوم کے دامن میں تعلیم و تربیت حاصل

---

[۱] میکدہ معنی از درد کاکوروی ص ۶

کی تھی۔ ان کی شاعری میں قدیم ادب کی ساری دولت بھی ہے اور بیسویں صدی کا نقطۂ نظر بھی ہے۔ ان کی نظم نگاری اپنے عصر اور عہد سے ہم آہنگ ہے۔

درد نے اپنی نظموں کے موضوعات میں فطرت کے حسن و جمال کو نمایاں کیا ہے ان کی نظموں میں حکمت و دانش کی روشنی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اپنی نظم عورت' میں انھوں نے عورت کے وجود کو جنس کی نظر سے نہیں دیکھا ہے بلکہ خالص جمالیاتی نگاہ سے عورت اور اس کے وجود کی غرض و غایت پر فلسفیانہ نظر ڈالی ہے چنانچہ کہا ہے ؎

تعبیر ہے خواب زندگی کی	تصویر باب زندگی کی
منشائے تجلیات فطرت	اک جلوۂ کائنات فطرت
فطرت کا ہے ایک ساز گویا	قدرت کا ہے اک راز گویا
پھولوں کی نظر فریب شوخی	امید کی جاں تری خموشی
اللہ رے وہ ترا ترنم	اللہ رے وہ ترا تبسم
تو ہے جنت کا خوشنما پھول	جو دیکھ لے تجھکو جائے غم بھول
ماشاء اللہ چشم بدور	کیا رنگ جھلک رہا ہے پر نور

عورت کا وجود ہر گھر کے لئے ضروری ہے۔ عورت نہ ہو تو گھر میں چہل پہل باقی نہیں رہتی ہے۔ اس خیال کو درد صاحب یوں شعر کا پیکر عطا کرتے ہیں ؎

ویرانہ ہے گھر بغیر تیرے	بے لطف سفر بغیر تیرے
اختر ہے کہیں کہیں قمر ہے	القصہ تو جنت نظر ہے

درد کاکوروی کی نظم نگاری میں جمال پرستی کا رجحان بھی نمایاں ہے اس لئے وہ شعر و شاعری کا بھی ایک بڑا حسین اور دلکش تصور رکھتے ہیں۔ اس تصور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی شاعری کو کیا سمجھتے ہیں اور اس سے کیا کام

لیتے ہیں۔ اپنی نظم شعر و شاعری میں انھوں نے لکھا ہے کہ ؎

شعر ہے وہ شعر جس سے پھول برسیں کیف کے
جگمگا دے ایک عالم کو جو رنگ و نور سے
شعر ہی تو ایک منظر کیف اور مستی کا ہے
شعر ہی تو ایک نغمہ طائر روحی کا ہے
شعر ہی تو ہے حسین دنیا تصور کی تمام
شعر ہی ہے ایک تنہا لالہ گوں بادہ بجام

شعر کی اس جمالیاتی تصویر کشی کے بعد وہ شعر کی افادیت کے پہلو پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں ؎

شعر ہی گویا پلٹ دیتا ہے عالم کی بساط
شعر میں ہوتی ہے پنہاں قوتِ عیش و نشاط
شعر ہی دنیا میں ہو جاتا ہے وجہِ انقلاب
شعر ہی تو روح تن کو بخش دیتا ہے شباب
شعر بزم کیف اور مستی کا مہ پارہ بھی ہے
شعر آزادی کی خاطر ایک انگارہ بھی ہے

شاعری کی نوعیت ان کے نزدیک صرف حسن و جمال سے اثر لینا اور اس اثر کا اظہار کرنا نہیں ہے بلکہ وہ شعر کو انسان کے دل و دماغ کی تہذیب و تربیت کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس سے دانش و بینش کو بڑھانے کا کام لیتے ہیں۔ ان کی نظم نگاری میں عارفانہ شاعری جس طرح پنہاں ہے اس نے ان کی شاعری میں بڑی تہہ داری پیدا کر دی ہے۔ وہ شعر کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں ؎

شعر وہ ہے سنتے ہی ہو جائے فوراً دلنشیں
شعر وہ ہے جس میں دنیا ہو خیالوں کی حسیں

یہ لکھنؤ کی دبستان شاعری کے اس سارے رویہ کا نچوڑ ہے جو ناسخ اور ان کے تلامذہ سے لیکر صفی لکھنوی اور ان سے متاثر ہونے والے لکھنوی شاعروں کا رہا ہے۔ درد کاکوروی نے شاعری کو حکمت و عرفان کے اظہار کا ذریعہ بنانے کی شعوری کوشش کرنے کے باوجود زبان و بیان کے سلسلہ میں لکھنؤ کے معیار کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔ وہ بڑے اور اہم خیالات کو صاف سادہ اور دلنشیں زبان میں بیان کرنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ اس لئے ان کی زبان میں سلاست و روانی پر خاص توجہ ملتی ہے۔ انھوں نے علمی اصطلاحوں کا استعمال کرنے کے باوجود کوشش یہی کی ہے کہ شعر دشوار و گراں بار نہ ہونے پائے بلکہ اس کا مجموعی مفہوم خود اس اصطلاح کی وضاحت کردے۔ درد کاکوروی دراصل تصوف کے بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی نظم نگاری کا ایک مقصد یہ بھی ہے اور اس مقصد کے لئے انھوں نے زبان کو کئی سطحوں پر برتا ہے، کہیں رنگین بیانی اور دشوار لفظی ترکیبوں سے بھی کام لیا ہے اور فارسی آمیز زبان استعمال کی ہے لیکن ان کا عام رنگ یہ نہیں ہے۔ وہ لکھنؤ کے طرز سخن کی پوری طرح پیروی کرتے ہیں اور زبان و بیان کو بہت زیادہ بوجھل بنانے سے ہمیشہ احتراز کرتے ہیں مجموعی حیثیت سے ان کی نظم نگاری صرف خواص کے لئے نہیں ہے بلکہ عوام کے لئے ہے وہ عوام ہی کو مخاطب بناتے ہیں اور اپنے دل کی بات براہ راست ان کے دلوں تک پہونچاتے ہیں اس لئے وہ بار بار سادہ بیانی کی جانب لوٹتے ہیں۔ یہی خصوصیات ان کی نظم نگاری کا امتیازی وصف ہے۔

بابِ پنجم

دردؔ کاکوروی کی رُباعیات
اور دیگر اصنافِ سخن کا مطالعہ

(الف) رباعیات کے بنیادی موضوعات

(ب) قطعات، تاریخ گوئی ۔ تضامین کی خصوصیات

(ج) فارسی شاعری کا جائزہ

(الف) رباعیات کے بنیادی موضوعات

رباعی ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں فارسی اور پھر اردو میں مجاز و حقیقت دونوں کی ترجمانی برابر ہے۔ عمر خیام کی فارسی رباعیات عالمی شہرت کی حامل ہیں۔ ان کی رباعیوں میں جہاں ایک طرف رندی اور سرمستی کے مضامین ملتے ہیں وہاں حکمت و دانشمندی، اخلاق و فلسفیانہ اور عارفانہ شاعری کے اعلیٰ ترین نمونے بھی موجود ہیں۔ رباعیوں کی یہ دو رنگی اردو میں بھی پوری طرح پائی جاتی ہے۔ ہر زمانہ میں ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے رباعی کہنے کا رواج رہا ہے۔ رباعی کہنا مشکل کام ہے اس کے باوجود تقریباً اردو کے تمام شعرا نے رباعیاں کہی ہیں۔ بیسویں صدی میں اردو کے عظیم رباعی گو کی حیثیت سے امجد حیدر آبادی کا نام لیا جاتا ہے۔ رباعی کے فن کو میر انیس، جگت موہن لال رواں اناوی، جوش ملیح آبادی، اور فراق گورکھپوری نے بھی بڑی جلا بخشی ہے۔ آغا خاں قزلباش دہلوی نے عمر خیام کی رباعیات کے کامیاب ترجمے کر کے اس صنفِ سخن کو مقبول بنانے میں بڑی مدد فراہم کی ہے۔ رباعی کے بارے میں اس تاریخی حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی سرپرستی سب سے زیادہ خانقاہوں میں ہوئی اور اس کا پہلا رواج صوفیوں کی محفلوں سے ہی ہوا۔ درد کا گورودی کا ذہنی پس منظر ان کو رباعی گوئی کے لیے بالکل مناسب اور موزوں فن کار بناتا ہے۔ درد نے شاعری کی متعدد اصناف میں طبع آزمائی کی

ہے اور مختلف رنگوں میں اشعار کہے ہیں۔ یہی حال ان کی رباعی کا ہے کہ ان میں ہر قسم کے خیالات و موضوعات موجود ہیں۔ لیکن یہاں بھی ان کے دوسرے موضوعات پر تصوف کا غلبہ ہے۔ ان کی رباعیوں میں مجاز سے زیادہ حقیقت پر توجہ ملتی ہے اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہیں ؎

میں بندۂ ناداں ہوں خرد مند ہے تو
مولا میں سبوس، نیشکر، قند ہے تو
دولت مری یہ ہے کہ ہوں بندہ تیرا
عزت مری یہ ہے کہ خداوند ہے تو

اللہ ہو کرم کا یہ نقشہ مرے ساتھ
ہردم رہے رحمت تری آقا مرے ساتھ
بھٹکانے نہ پائے درد کے دل کو کوئی
ہر وقت تری مدد ہو مولا مرے ساتھ

وہ عمر خیام کی طرح خدا کی شان جلال میں اس کی شان جمال کے سوا کچھ نہیں دیکھتے۔ یہ بھی رباعیوں کا ایک خاص مضمون ہے اور درد کاکوروی کی رباعیات میں جابجا خیام کے اس رنگ کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ؎

مانا کہ تو جبار ہے قہار بھی ہے
رحمٰن، رحیم اور ستار بھی ہے
میں اپنے گناہوں سے ڈرا جب اے درد
رحمت یہ پکار اٹھی کہ غفار بھی ہے

عشرت ہے وہی جو بے لقب ہو یارب
ہے فضل وہی جو بے سبب ہو یارب
مانگے سے دیا تو نے تو پھر بات ہی کیا
بخشش ہے وہی جو بے طلب ہو یارب

ناکردہ گناہ کون ہے دنیا میں بتا
جس نے نہ کیے گناہ وہ کیسے جیا
بدلہ جو برائی کا برائی تو دے
پھر ہم میں اور تجھ میں ہے کیا فرق بھلا

یہ وہی تصور ہے جو بو علی سینا اور دوسرے مسلمان فلسفیوں کے یہاں پایا جاتا ہے کہ خدا خیر محض ہے اس لیے وہ ہر صورت میں بندوں کو اپنے رحم و کرم سے نوازے گا جن کی خطاکاری کی وجہ صرف ان کے دل کی تاریکی ہوتی ہے۔

میں بندۂ عاصی ہوں، رضا تیری کہاں
تاریک ہے دل نور و ضیا تیری کہاں
طاعت سے ہمیں بہشت دی تو نے اگر
مزدوری ہوئی، لطف و عطا تیری کہاں

گو تیری عنایت سے مجھے دوری ہے
یہ عرض مگر تجھ سے بمعذوری ہے
ہے منحصر اخلاص پہ گر تیرا کرم
پھر تو وہ عنایت نہیں مزدوری ہے

یہی بات خیام نے بھی بار بار کہی ہے۔ اور رباعیوں میں رجائیت کی جو لہر موجود ہے وہ یہی خیال اور جذبہ بن کر طرح طرح سے رباعیوں میں نمودار ہوتی ہے ؎

دیتی ہے بیا خیال قدرت تیری
سو ناز سے پالتی ہے رحمت تیری
یوں درد گناہ گار ہے کہ یہ معلوم
ہیں جرم زیادہ یا کہ رحمت تیری

بو علی سینا اور دوسرے مسلمان فلسفیوں نے قلب و نظر کی تاریکی کا ازالہ ذات الٰہی کے علم و عرفان سے کرنے پر زور دیا ہے اور ان کے نزدیک فلسفۂ عرفان کا مقصد بھی یہی ہے۔ تصوف کا فلسفہ بھی یہی کہتا ہے۔ صرف معرفت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ درد صاحب خدا کے فضل و کرم سے مایوس نہیں ہوتے ؎

یارب نہیں کی ہیں طاعتیں گو میں نے
دن رات کیا ہے معصیت کو میں نے
مایوس نہیں ہوں یوں کرم سے تیرے
ہرگز نہیں ایک کو کہا دو میں نے

خیام کے رنگ میں ڈوبنے کے باوجود درد کا کورذی کا تصوف ان کی شاعرانہ فکر پر غالب ہے۔ مذکورہ بالا رباعی میں انہوں نے تصوف کے فلسفہ کی اصطلاحوں کو بڑی خوبی اور چابکدستی سے استعمال کیا ہے۔ ان کی دیگر رباعیوں میں بھی تصوف کی اصطلاحوں کا بے تکلف استعمال ہوا ہے۔ سالک مجذوب اور مجذوب سالک کی اصطلاحوں کی تشریح انہوں نے اپنی درج ذیل رباعیات میں بڑے خوب صورت پیرایے میں کی ہے۔ ؎

سالک:
مٹ جائے اگر دل سے خودی کی کالک
کھل جائے کہاں تک ہے یہ بندہ سالک
سالک سے سلوک ہے عمل کی حد تک
کچھ بات نہیں دردؔ ہو اگر سالک

مجذوب:

تھا اپنا عمل سلوک میں اک مطلوب
دشوار ہے دردؔ اس کا ہونا محسوب
ہے ختم عمل جذب کہ آغاز ہے سیر
اس واسطے سالک سے ہے بڑھ کر مجذوب

سالک مجذوب:

بندہ غالب ہے اور خالق مطلوب
تا ہوا جذب حق کا ٹھہرا مجذوب
اپنا لیا دردؔ حق کے جذبوں نے جسے
افضل دونوں سے ہے یہ سالک مجذوب

مجذوب سالک:

جسے حاصل ہے نور فضل ذالک
وہی اسمائے باری کا ہے مالک
وہی تو سب سے افضل دردؔ ہے جو
تعالی اللہ ہے مجذوب سالک

اپنے مستحکم عقیدے کے باوجود دردؔ کاکوروی رباعی کی ایک قدیم روایت کی پیروی میں انسانی علم و عرفان کی نفی بھی کرتے نظر آتے ہیں ؎

کچھ علم ازل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے ہے
کچھ علم اجل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے ہے
نیکی کا ہے یا بدی کا پلہ بھاری
کچھ علم عمل کا نہ تجھے ہے نہ مجھے ہے

افسوس دردؔ اسیر زماں و مکاں ہوا
مطلق سے جب ہے دور تو عارف کہاں ہوا
کیا جانیں اہل مدرسہ اسرارِ معرفت
کیڑا کتاب چاٹ کے کب نکتہ داں ہوا

گو میں کیڑا ہوں کتابوں کا کمالی نہ ہوا
فخرِ رازی نہ ہوا، رشکِ غزالی نہ ہوا
دردؔ پروانہ اسی بات پہ جل مرتا ہے
میں فدا حسن پہ ہو کر بھی جمالی نہ ہوا

انہوں نے علم و معرفت کی وہی حد تسلیم کی ہے جو صوفیوں کے نزدیک فکر کی آخری پرواز ہے۔ یہ ذاتِ الٰہی کے دیدار تک کبھی نہیں پہونچتی۔ بس ہر طرف صفات کے بے شمار جلوے دیکھتی ہے۔ یہی انسان کی حقیقت ہے۔ ؎

ہے جسم عیاں اور ہے یہ روح نہاں
سب جسم ہیں بے نشاں یہ ہے حق کا نشاں
ممکن نہیں ہم ذات کو دیکھیں اے دردؔ
البتہ صفات کو جو ہیں اس سے عیاں

یہ وحدت الوجود کا بنیادی نظریہ ہے اور درد کا کوردی اسی کے ترجمان ہیں اور وہ توحید وجودی کے علم ویقین ہی کو عرفان کامل کہتے ہیں ؎

جب روز ازل کی یاد ہے یادِ وطن
کھل جائیں نہ کیوں قلب میں عرفاں کے چمن
اے دردؔ حقیقت میں وہی عارف ہے
توحیدِ وجودی میں جو رہتا ہو مگن

توحید وجودی کا ثبوت اپنے عقیدہ کی روشنی میں ان الفاظ میں فراہم کرتے ہیں ؎

بے کچھ دینے کو کیا خدا کبھی آیا ہے
دیتے ہوئے اللہ کو کیا دیکھا ہے
توحیدِ وجودی اس سے ثابت ہے دردؔ
دیں بندے مگر کہیں کہ خدا دیتا ہے

انھوں نے اپنی رباعیوں میں حکمت و دانائی کے جو موتی بکھیرے ہیں ان میں خیال کی سادگی ہے لیکن اس سے وہ بڑے معنی خیز نتیجے برآمد کرتے ہیں ؎

مرنا آخر ہے عمر فانی کب تک
جینا بھی صحیح تو زندگانی کب تک
طاقت پہ ہے موقوف ہر اک شے اے دردؔ
طاقت بھی سہی تو نوجوانی کب تک

اچھا ہی نہیں بڑا سمجھنا خود کو
یہ مت سمجھو کہ سب سے اچھے تم ہو
پُتلی سے آنکھ کی سبق لو اے درد
اپنے کو نہ دیکھو اور سب کو دیکھو

ہستی مری غیر ہے جدا ہوں سب سے
یعنی کہ میں عصیاں میں سوا ہوں سب سے
جب ہے مرے عیبوں کی خبر درد مجھے
سب اچھے ہیں مجھ سے میں برا ہوں سب سے

وہ ہر حال میں راضی بہ رضائے الٰہی رہنے کے مسلک کی ترجمانی کرتے ہیں اور انسان کو ہمیشہ شکر گذار رہنے کا سبق سکھلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کی نعمتوں اور عنایتوں کا شکر ادا کرنا ممکن ہی نہیں ہے ؎

بے تیرے مجھے قرار ممکن ہی نہیں
نعمت کا تری شمار ممکن ہی نہیں
ہر بال زباں ہو درد کی پھر بھی اے خدا
ہو شکر ادا ہزار ممکن ہی نہیں

ہر دم ترے غم میں جان کھویا ہی کروں
میں اشکوں سے فردِ جرم دھویا ہی کروں
بس اپنی محبت میں تو مجھکو یارب
وہ سوز و گداز دے کہ رویا ہی کروں

ان کو رحمتِ خداوندی پر کامل ایقان ہے۔ اور اسی لیے وہ بندے کی دعا کو تقدیر بدلنے والی طاقت سمجھتے ہیں۔ ؎

بگڑی ہوئی تقدیر سنبھل جاتی ہے
کیسی بھی بلا ہو اس سے ٹل جاتی ہے
ہے سرورِ کائنات کا یہ ارشاد اے دردؔ
تقدیر دعاؤں سے بدل جاتی ہے

مایوس نہ ہو اگر دعا ہو نہ قبول
اللہ کی مصلحت کا اس میں ہے شمول
جس چیز کی ہے دعا بری ہے کہ بھلی
خالق ہے علیم بس تو خالق کو نہ بھول

جو چاہے وہ اللہ مٹا دیتا ہے
بہتر ہے تو دنیا میں صلہ دیتا ہے
محفوظ ہے حق کے پاس لوحِ محفوظ
جو چاہے گھٹا بڑھا دیتا ہے

رباعی کی رنگینی و سرمستی اور اس رنگینی و سرمستی میں حکمت و عرفان کی چاشنی دردؔ کی رباعیوں میں جلوہ گر ہے اس کی بہترین مثال درج ذیل رباعی ہے جس میں انسان کی فانی زندگی کا ذکر کیا گیا ہے ؎

بے وجہ نہیں بادہ پرستی میری
ہے کیفِ خرابات یہ مستی میری

ہونا ہے کسی روز ہمیں خانہ خراب
القصہ کہ نیستی ہے ہستی میری

اپنی ہستی کے بارے میں یہ تصور وحدت الوجود کے مسلک کی نمائندگی کرتا ہے،
درد خود بھی اس سے بیحد متاثر ہیں بلکہ اسی مسلک کے دلدادہ ہیں اس مشرب
میں وہ بالکل بے لچک رویہ رکھتے ہیں اور عالم کی کثرت میں صرف وحدت کو
حقیقی سمجھتے ہیں ؎

کثرت جو عطا کی ہے تو وحدت بھی دے
فرمایا مجاز تو حقیقت بھی دے
دل تو نے دیا ہے درد بھی دے اپنا
جب دی ہے بصارت تو بصیرت بھی دے

قائل ہمہ اوست کا جو ہے بینا ہے
مے یاد خدا کی، جام ہے مینا ہے
پھر درد بشر کیوں نہ خلیفہ ہوتا
انسان جمالِ حق کا آئینہ ہے

وہ اپنے وحدت الوجود کے عقیدے کے حق میں شاعری کو بھی بروئے کار
لاتے ہیں اور تصوف کی مخصوص اصطلاحوں کی شاعرانہ تعبیر بھی پیش
کرتے ہیں ؎

ہر قطرہ یہ کہتا ہے کہ دریا ہوں میں
ہر ذرہ یہ کہتا ہے کہ صحرا ہوں میں

ہیں دردؔ تعینات کے یہ سب قول
یہ جذب وکشش حق کی ہے کہتا ہوں میں

فی الجملہ شہود ہے جو کہتے ہیں وہی
ہے بات تو یہ اہلِ طریقت سے سُنی
احمد کی زباں سے ہر احد بول رہا
اے دردؔ ہے رازِ دہر واللہ یہی

دردؔ کاکوروی نے اس کے باوجود ذاتِ الٰہی کے سلسلے میں اپنا رویہ طریقت کے ساتھ ساتھ بڑی سختی سے شریعت کی پابندیوں کے حصار میں رکھا ہے۔ وہ ایک صوفی بھی ہیں اور ایک عام مسلمان بھی، اس لیے عبودیت کا پورا جذبہ ان کے پاس موجود ہے ؎

اللہ جہاں میں کبریا تو ہی ہے
بندوں کی دعا کا مدعا تو ہی ہے
حاجت ہے تجھے حمد کی کب اے مولا
ہو جا ہے نہ ہو حمد، خدا تو ہی ہے

کشتی کو سوا ترے کوئی کھے نہیں سکتا
مرضی نہ تری ہو تو کوئی دے نہیں سکتا
مختار ہے جُز کا اور کُل کا تو ہی
ہو جسکو عطا تیری کوئی لے نہیں سکتا

دردؔ کے نزدیک جس شخص کو قرآن کے اللہ کا کلام ہونے کا یقین نہ ہو وہ کافر ہے ؎

اوّل بھی وہی اور وہی آخر ہے
باطن بھی وہی اور وہی ظاہر ہے
قرآن پہ ایمان ہے، اسکو جو دردؔ
حق کا نہ کہے کلام وہ کافر ہے

جس شاعر کے دل میں درد نہ ہو اس کو دردؔ شاعر نہیں تسلیم کرتے ؎

فطرت کی یہ کائنات باہر ہی نہیں
باطن بھی کوئی چیز ہے ظاہر ہی نہیں
اے دردؔ محبّت پہ ہے موقوف احساس
جس دل میں نہ ہو درد وہ شاعر ہی نہیں

رباعی گوئی میں دردؔ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے حکمت و عرفان کے مضامین کو ادا کرنے کے لیے اپنی ایک الگ زبان استعمال کی ہے یہ زبان صرف شاعری کی زبان نہیں ہے بلکہ اس میں جس تصوت اور تصوف کے فلسفہ کی اصطلاحوں کا برمحل استعمال ہوا ہے وہ اس کو شاعری کی جگہ تصوف کی زبان بنا دیتا ہے۔ عام طور پر رباعیوں میں تصوف کے مضامین ملتے ہیں لیکن تصوف کی اصطلاحوں کا فقدان ہوتا ہے۔ دردؔ کا کوروی کے پاس ان کی افراط ہے اور اس لیے ہے کہ انھوں نے رباعی کو رسمی طور پر اظہار کا ذریعہ نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے وسیلے سے اپنی فکر اور اپنے فلسفہ کی تبلیغ کی ہے۔

دردؔ کاکوروی اردو کے ساتھ ہی فارسی میں شعر کہنے پر قدرت رکھتے ہیں

ان کی فارسی شاعری کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا۔ انھوں نے فارسی میں متعدد رباعیاں کہی ہیں۔ یہاں پر ان کی صرف دو رباعی اس خیال کے ساتھ پیش ہیں کہ فارسی زبان میں رباعی کا نمونہ سامنے آسکے ؎

از فکر و غم بلندی و پستی باز آ
از وہم و خیال و علم ہستی باز آ
پندار خودی دور بفرما اے درد
باز آ باز آ از خود پرستی باز آ

من تشنہ اگر جام نہ نوشم چہ کنم
ایں جام خوش انجام نہ نوشم چہ کنم
درمان نشدہ درد را چوں مطلب تو
یا جائے تو دل را نہ فروشم چہ کنم

(ب) قطعات

رباعی اور قطعہ نگاری میں صرف وزن اور بحر کا فرق ہے۔ رباعی کا ایک وزن مخصوص ہے جو لاحول ولاقوۃ الا باللہ ہے۔ قطعات میں ایسی پابندی نہیں ہے لیکن چند اور جزوی اختلافات کے باوجود دونوں کے مقصد میں یکسانی ہے۔ کسی ایک خیال کو درجہ بدرجہ بیان کرنے کے بعد اس کے آخری مصرعہ میں اس کے نتیجہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ غزل گوئی کی طرح رباعی اور قطعہ گوئی کی روایت بھی ابتدا سے چلی آرہی ہے، فارسی میں اگر عمر خیام اور بہت سے باکمال رباعی گو اس صنف سخن کو سنوارتے اور نکھارتے رہے تو قطعہ نگاری کی صنف سخن میں بھی برابر پیش رفت ہوتی رہی اور ابن یمین نے رباعی اور قطعہ نگاری دونوں کو حد کمال پر پہونچا دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے قطعہ نگاری میں رباعی سے بہت زیادہ ایسے امکانات ہیں کہ یہ ایک نظم کی طرح کسی خیال یا تصور کا مکمل اظہار اس کے ذریعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ قطعہ میں اشعار کی تعداد کی کوئی قید نہیں ہے۔ کسی جذبہ، خیال یا واقعہ کو پھیلا کر بیان کیا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے اردو میں قطعہ نگاری پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔ ہر بڑے شاعر نے رباعیاں تو کہی ہیں لیکن قطعات کی طرف بہت کم متوجہ ہوئے ہیں جو قطعات ملتے ہیں وہ عام طور پر تاریخ گوئی سے تعلق رکھتے ہیں۔

درد کاکوروی اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ انہوں نے دیگر اصناف سخن کے ساتھ قطعات کہنے پر پوری توجہ دی ہے اور ہر موضوع پر قطعات کہے ہیں۔ انکے

یہاں جو قطعات پائے جاتے ہیں ان میں حمد، نعت، عارفانہ تصورات و نظریات نظم کیے گئے ہیں۔ انہوں نے اردو کے ساتھ فارسی میں کافی قطعات کہے ہیں۔ ان میں اخلاقی بھی ہیں اور اصلاحی بھی اور طنز و ظرافت کے نشتر بھی موجود ہیں۔ چند حمدیہ قطعات ملاحظہ فرمائیں جن میں دردؔ نے اللہ تعالیٰ سے اپنا دردِ دل بیان کیا ہے۔ ؎

اپنا عرفان اے مرے اللہ دے
چشمِ نمناک اور دلِ آگاہ دے
درد اپنا دے کے یارب دردؔ کو
سوز اپنا اور اپنی آہ دے

ہم ترے بندے ہمارا مالک و آقا ہے تو
ہم غریبوں، بیکسوں کا والی و مولا ہے تو
کون ہو سکتا ہے تیری حمد سے عہدہ برآ
ہو ثنا جتنی بھی اس سے ارفع و اعلیٰ ہے تو

غمِ دنیا و دیں سب دور کر دے
مئے عرفان سے مخمور کر دے
رکھ اپنے درد سے مسرور ہر دم
الٰہی بس سراپا نور کر دے

اللہ رگ دل میں وہ نور سحر بھر دے
جو جامِ حقیقت سے مدہوش مجھے کر دے

ان مست نگاہوں کا دیتا ہوں تجھے صدقہ
ساقی ہو بھلا تیرا پیمانہ مرا بھر دے

دین و دنیا سے الٰہی کر دے مجھ کو بے نیاز
میں ہوں تیرا بندۂ ناچیز اے بندہ نواز
اے مرے مولا نہیں اس کے سوا کچھ آرزو
وہ تجلی کر عطا جس میں ہو تیرا سوز و ساز

درد نے جو نعتیہ قطعات کہے ہیں وہ رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت و عقیدت کے مظہر ہیں۔ ان نعتیہ قطعات میں ان کا اصلی رنگ جھلکتا ہے، وہ ایک صوفی شخصیت کے مالک ہیں۔ اس لیے وہ اپنے روحانی سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت سے رہنمائی کے خواستگار ہیں ؎

کاش حضرت کی حضوری ہمیں حاصل ہو جائے
نام خدام کی فہرست میں داخل ہو جائے
کرم و لطف کی نظروں سے جو دیکھیں حضرت
آپ کے نور سے پُر نور یہ محفل ہو جائے

غلامی ہو درِ عالی کی حاصل یا رسول اللہ
تو حل ہو جائے گی ہر ایک مشکل یا رسول اللہ
تصدق آل اور اصحاب کا نظرِ کرم مولا!
کسی صورت ہو روشن درد کا دل یا رسول اللہ

فارسی کے قطعات میں بھی انہوں نے محبت وعقیدت کے اپنی جذبات کا اظہار کیا ہے ؎

من از سگانِ غلام تو یا رسول اللہ
حق است جملہ کلام تو یا رسول اللہ
حقیقتاً ہمہ آئینۂ وجود کلام !
منور است ز نام تو یا رسول اللہ

(کذا) حمد سرمایۂ صبر و شکیبم
ندارم جز تو چیزے آں غریبم
بیا درمانِ دردم یا محمد
بشو از داروئے فیضِ طلیبم

دردؔ کاکوری نے فن شاعری کی ایک نادر صنعت میں ایک نعتیہ قطعہ کہا ہے۔ یہ صنعت غیر منقوطہ میں ہے جس میں کوئی حرف ایسا نہیں استعمال کیا جاتا جس کی شناخت نقطے ہوتی ہو۔ اس طرح غیر منقوطہ شعر کہنے میں الفاظ کا ذخیرہ بہت محدود ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود شاعر کا کمال یہی ہوتا ہے کہ جو وہ کہنا چاہتا ہے وہ کہہ دے۔ دردؔ کاکوروی کا غیر منقوطہ قطعہ اس کسوٹی پر کھرا اترتا ہے ؎

حمد گو حمد ہر سرمد را
ہم درود و مکرم احمد را
دردؔ صلوٰۃ والسلام
محرم مدح دل محمد را

درد کاکوروی نے قطعات میں اپنی فکر و شعور کا اظہار بہت لطیف اور دلکش انداز میں کیا ہے۔ وہ دنیا کو روحانیت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ؎

جو ہستی ہے مادّہ کا دم بھرتی ہے
اور مادّہ آسماں ہے دھرتی ہے
اے دردؔ ہے اس کے سوا قوت ایک
اشیاء کا وہ ادراک کیا کرتی ہے

وہ ہوا اور ہوس سے ماوراء جس قوت کے قائل ہیں وہ مادی نہیں روحانی ہے اور ان کے عقیدہ میں انسانی شعور و ادراک کی جان یہی ہے۔ اس کے باوجود وہ سارے شعور و ادراک کو بھی ایک فریب سمجھتے ہیں جو اصل حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہے ؎

یہ نمود لے کے آتا نہ گناہ گار ہوتا
یہ شہود لے کے آتا نہ گناہ گار ہوتا
میں برنگ دردؔ ہوتا تو اسی میں تھا بھلا کچھ
یہ وجود لے کے آتا نہ گناہ گار ہوتا

حقائق اور معارف کا نہیں کس شے میں جلوہ ہے
ہر اک ذرّہ میں صحرا ہے ہر اک قطرہ میں دریا ہے
ہماری کیا حقیقت دردؔ اگر ہم غور سے دیکھیں
خدا خود ہے بڑا شاعر حقیقت اس کا نغمہ ہے

اپنی ذات کو وہ اسی حقیقت کی معرفت میں فنا کر دینے کے خواہش مند ہیں اور یہی جذبہ ان میں عاجزی اور عبدیت بھی پیدا کرتا ہے ؎

بہشت چاہیئے مجھکو نہ حسن باغ جناں
نہ سلسبیل، نہ کوثر، نہ سنبل و ریحاں
تو قہر میں ہے تو جنت بھی مجھکو دوزخ ہے
تو مہر میں ہے تو دوزخ ہے روضۂ رضواں

اچھے کاموں کا خدا بندوں کو کب دعویٰ ہے
امتحاں کس لیے بندوں کا تو پھر لیتا ہے
آئی آواز کہ یہ بات نہیں ہے اے درد
دیکھنا یہ ہے یہاں کون مرا بندہ ہے

وہ اس معرفت کے لیے علم و عقل دونوں کو ضروری نہیں سمجھتے۔ خاص طور سے ایک شاعر ان کے نزدیک حقیقت شناسی کے لیے دلیلوں کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی ایک خاص نظر رکھتا ہے۔ جو حقیقت کو بے دلیل سمجھ لیتی ہے۔ منقولات اور معقولات کی رہنمائی شاعر کو درکار نہیں ہے۔

تذکرے بے سود ہیں شاعر سے منقولات کے
جو ہر اس کے روبرو ہیں حسن معقولات کے
عام نظریں دیکھنے سے درد قاصر ہیں — مگر
ہے نظر شاعر کی تہ میں جملہ موجودات کے

لیکن وہ منقولات اور معقولات کے راستے حقیقت کی راہ پر گامزن ہونے والوں کو پورے احترام کا بھی سبق دیتے ہیں کیونکہ وہ ان کو بھی منزل کے عشق میں بے تاب پاتے ہیں۔

ملاحظہ ہو ؎

مت سمجھ صوفی و ملاؔ کو غلام اے ساقی
بدگمانی ہے شریعت میں حرام اے ساقی
تو نے چکھی ہی نہیں ان کی محبت کی شراب
تجھ کو معلوم نہیں ان کا مقام اے ساقی

ان کو یہ بھی یقین ہے کہ آخر جب زندگی کا خاتمہ ہوگا تو سارے پردے ہٹ جائیں گے اور حقیقت سامنے آجائے گی۔ لیکن موت سے پہلے انسانی زندگی ان دونوں کے درمیان کشمکش سے گذرتی ہے ؎

زندگی اک خواب ہے مرنا ہے بیداری تمام
بیچ میں دونوں کے انساں درد ہے محوِ خرام
موت کیا ہے روح کا دیباچۂ حسن شعور
ہو ہمیں اپنی خبر ہاں زندگی اس کا ہے نام

وہ انسانی زندگی کو بھی ایک خواب سمجھتے ہیں لیکن اس میں انسانی جذبات کی بے چینیوں نے زندگی کا پیرہن اختیار کر لیا ہے ؎

خوابِ عدم سے یہ ہمیں کس نے جگا دیا
خلوت سرائے راز کا پردہ اٹھا دیا
نکلی تڑپ کے درد بھرے دل سے یہ صدا
بے چینیوں نے ہے ہمیں انساں بنا دیا

وہ ایک بندے کی حیثیت سے اپنی بندگی پر بھی نازاں ہیں اور زبانِ حال سے کہتے ہیں ؎

خالقِ دردِ دین اور دنیا
ہے ادب سے یہ عرض میرے خدا
جب مجھے فکر ہو کوئی درپیش
ہو ترا فضل دستگیر مرا

برس کے رحمتِ حق کھل گئی ہے
بحمد اللہ کرم پر تُل گئی ہے
ہے کہتی درد بالوں کی سپیدی
گناہوں کی سیاہی دُھل گئی ہے

انھوں نے ایک سالک وصوفی کی حیثیت سے درد وغم اور عشق کی دولت کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ اور وہ اس سے کسی حال میں دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہیں ؎

عشق کے غم کو نہ بدلیں گے کبھی ساماں سے ہم
عشق میں یوں ہی گذر جائیں گے اک دن جاں سے ہم
حق یہ ہے جب یادگارِ دوست ٹھہرا دردِ دل
درد کو پھر تو نہ بدلیں گے کبھی درماں سے ہم

ان کی قطعہ نگاری میں بڑی رنگا رنگی ہے اور انہوں نے بہت سے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ فن کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر قطعہ میں اپنے جذبہ یا خیال کی ادائیگی میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کا کوئی بھی قطعہ پڑھیے تو اس کا مرکزی خیال پوری طرح سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہی ایک قطعہ کی سب سے بڑی

خوبی ہے ۔ درد کاکوروی کی قادر الکلامی نے ان کو تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرنے پر مائل کیا ہے ۔ رباعی اور قطعات بھی ان کی اسی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں ۔ ان میں خیالات کی بلندی ہے اور زبان و بیان کی تمام خوبیاں ملتی ہیں ۔

ایک دلچسپ بات ہے کہ انھوں نے یوں طنز و مزاح کی طرف خاص توجہ نہیں دی لیکن چند نظموں کی طرح ان کا ایک قطعہ بھی طنز و مزاح کی تمام شوخی کا ترجمان ہے ؎

دین کی بائیسکل میں ایسے پنکچر ہو گئے
مولوی جو بن نہ سکتے تھے وہ مسٹر ہو گئے
درد اس میں حرج ہی کیا ہے ترقی تو ہوئی
خطبۂ منبر نہ پڑھ سکتے تھے ممبر ہو گئے

قطعہ نگاری کی صنف میں درد کاکوروی پوری طرح کامیاب ہیں ۔ اور یہ کامیابی ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی ایک مثال ہے ۔ وہ جس طرح کسی بھی موضوع پر بے تکلف اظہار خیال کرتے ہیں، وہ انھیں کا حصّہ ہے یہ ان کی مجموعی شاعری پر صادق آنے والی بات بھی ہے ۔ اسی لیے پروفیسر وقار عظیم نے ان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے :

"وہ ایک ایسے شاعر ہیں جس نے زندگی کو واردات و مشاہدات کا خم خانہ جان کر ہر خم سے منہ لگایا ہے اور گوناگوں ذائقوں سے لذت کا سرمایہ فراہم کیا ہے ۔ اسی سرمایہ کو انہوں نے شعر کی صورت دی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اپنی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی سے مشکل بات کو اتنا آسان بنایا ہے کہ ان کے دل کی بات ہم سب کے دل کی بات معلوم ہوتی ہے ۔" [۱]

---

[۱] میکدۂ معنی از درد کاکوروی ص ۶

تاریخ گوئی

تاریخ گوئی ایک قدیم فن ہے جو فارسی کے ذریعہ اردو میں داخل ہوا۔ فارسی میں جو سب سے قدیم تاریخ ملتی ہے وہ سامانی عہد کے شاعر ابو شکور بلخی کی درج ذیل تاریخ ہے ؂

(کذا) مرایں داستاں کش بگفت از خیال
ابر سیصد و سی و سہ بود سال

اردو میں تاریخ گوئی کا رواج فارسی کے زیر اثر پیدا ہوا۔ قدیم اساتذہ نے فن تاریخ گوئی کو بام عروج تک پہونچایا۔ شعراء اردو نے بڑی تعداد میں فارسی میں بھی تاریخیں نکالی ہیں۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، صہبائیؔ اور مومنؔ نے تاریخ گوئی میں اپنی فن کاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس فن کی طرف خصوصی توجہ لکھنؤ میں دی گئی۔ مصحفیؔ، ناسخؔ اور ان کے شاگردوں نے اس فن کو بڑی ترقی دی ہے۔ یہ فن ان کے عہد میں معیاری فن بن چکا تھا۔

مصحفیؔ نے اپنے ایک شاگرد نور الاسلام منتظرؔ کاکوروی کی بھی تاریخ وفات کہی ہے ؂

سخن سنجے نصیبے منتظر نام چو در کنج لحد کرد از قضا جائے
زہاتف مصحفیؔ پرسید سالش بگفتہ شاعر شیریں زباں ہائے
۱۲۱۰ھ

ؔ گلزار از پروفیسر محمد ولی الحق انصاری ص ۴

فن تاریخ گوئی کو لکھنؤ میں پروان چڑھنے کے خصوصی مواقع ملے۔
لکھنؤ میں فن تاریخ گوئی کے عروج اور شعراء کے نزدیک اس کی اہمیت و افادیت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی رقمطراز ہیں:

"وہ شعراء جن کے سماجی حدود بہت پھیلے ہوئے ہوں اور حلقۂ تعارف وسیع ہو اور بالخصوص سوسائٹی پر اثر انداز ہونے والے طبقۂ اشراف سے ان کا گہرا ربط ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے اہم واقعات کا ان کے لیے تانتا بندھا رہتا ہے کہ جن میں تاریخ گوئی کے جوہر دکھانے کا برابر اچھا موقع دستیاب ہو۔ کسی کو خلعت ملا، کسی نے انعام پایا، کسی کو مہر عطا ہوئی، کسی کو دربار میں کرسی عنایت ہو گئی، کہیں شادی ہوئی، فرزند تولد ہوا، کوئی بیمار ہوا، کوئی اچھا ہوا، اور کوئی جاں بحق تسلیم ہوا، یا اگر کہیں کسی بادشاہ کی تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی تو یہ اور اس طرح کے ہزاروں مواقع تاریخ کہنے والوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ اور کشادِ احوال کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتے تھے۔" [1]

تاریخ گوئی کا تعلق حروف تہجی کی اس ترتیب سے ہے جو ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ کہلاتی ہے۔ حروف تہجی کی اس ترتیب میں اکائی دہائی اور سیکڑے کے حساب سے ہر حرف کے اعداد مقرر ہیں۔ خان بہادر مسعود حسین صاحب مؤلف عندلیب تواریخ نے ان اعداد کو ایک قطعہ میں کس خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے [2]

---

[1] ناسخ ص ۲۱۷ از پروفیسر سید شبیہ الحسن نونہروی۔
[2] صحیفۂ تواریخ از شاہ کوکب القادری ص ۱۵۔

ابجد و ہوز و حطی تک ہیں اکائی کے حروف
ی سے تا کلمن و سعفص ہیں دہائی کے حروف
قرشت و ثخذ و ضظغ جو بچے اے مسعودؔ
سیکڑوں کے ہیں وہ بے شبہ گنائی کے حروف

تاریخ کہنے والا ان حروف سے با معنی الفاظ کی تشکیل کرتا ہے۔ یہ ایک خاص دشوار ریاضیاتی عمل بھی ہے اور اسی کے پہلو بہ پہلو الفاظ کے ذخیرے سے پوری واقفیت اور الفاظ کے برمحل انتخاب کا تقاضا بھی کرتا ہے۔

اساتذہ سخن نے اس تکنیک کو کامیابی سے برت کر بہت شاعرانہ تاریخیں بھی کہی ہیں اور کبھی کبھی صرف ضرورت بھر کام چلایا ہے۔ تاریخ گوئی کے لیے اشعار کی کوئی تعداد نہیں مقرر ہے۔ اکثر ایک شعر یا ایک مصرعے سے بھی مادۂ تاریخ برآمد کیا جاتا ہے۔ عام طور پر تاریخی قطعات کم از کم دو شعروں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ دو سے زیادہ اشعار مثلاً پانچ، سات دس یا اس سے زائد میں بھی قطعۂ تاریخ ملتے ہیں۔

یہ تاریخ گوئی کا رواج کسی موقع یا کسی واقعہ کو محفوظ کرنے کی غرض سے عام ہوا۔ عام طور پر مختلف مواقع پر کہے گئے قطعات ملتے ہیں۔ بچّہ کی ولادت تقریب بسم اللہ، یا شادی کے موقع پر تاریخ کہنے کا رواج پڑھے لکھے گھرانوں میں موجود تھا۔

علم و ادب کے قدیم مرکز اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہونے کی وجہ سے قصبہ کاکوری میں بھی فن تاریخ گوئی کو بڑا فروغ ہوا۔ کاکوری کی تاریخی کتابوں اور تذکروں میں کثیر تعداد میں قطعات تاریخ موجود ہیں۔ اس زمانہ میں بچوں کا تاریخی نام بھی رکھنے کی رسم تھی۔ بچّہ کی ولادت، تقریب

بسم اللہ، رسم کتخدائی کے مواقع پر تاریخی قطعات لکھے جاتے تھے، عمارتوں، مسجدوں، مندروں، مقبروں، پلوں اور کنوؤں کی تعمیر پر بڑی تعداد میں قطعات تاریخ لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کتابوں کی اشاعت پر بھی قطعات تاریخ لکھے جاتے رہے ہیں۔ مذکورہ مواقع پر لکھے گئے چند قطعات ملاحظہ فرمائیں۔

مولوی مفتی شہاب الدین ابن حاجی امین الدین کی ولادت ۱۱۹۱ھ میں ہوئی۔ اس موقعہ پر قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں ثاقب نے قطعہ تاریخ ولادت کہا۔

آں نکو بخت چوں بعرش وجود
جلوہ فرما چوں شہ بہ تخت آمد
سال میلاد آں بلند اقبال
گفت ہاتف سعید بخت آمد

۱۱۹۱ھ

قطعہ تاریخ تعمیر روضہ شاہ محمد کاظم قلندر، از شاہ تراب علی قلندر المتخلص بہ تراب کاکوروی۔

خدا بہ لعل محمد جزائے خیر دہد
زسعی او چو بنا گشت روضۂ پیرش
تراب خوش شد و از بہر یادگاری دہر
بگفت گنبد پر نور سال تعمیرش

۱۲۳۰ھ

حضرت شاہ کرامت علی قلندر کا روضہ علامہ محسن کاکوروی نے نہایت خوشنما اور خوبصورت تعمیر کرایا۔ روضہ کے اوپر تعمیر سے متعلق

حسب ذیل قطعۂ تاریخ کندہ ہے ؎

مولوی محسن چو بوجہ حسن
ساختہ ایں روضۂ پاک دلی
سال بنا گفت سروش از فرید
بارگاہ شاہ کرامت علی

۱۳۰۵ھ

کاکوری کی بیشتر مساجد کی تعمیر کے وقت قطعات تاریخ شعرائے کہے۔ کچھ مسجدوں میں اب بھی کتبے لگے ہیں اور کچھ صرف تذکروں میں محفوظ ہیں۔

قصبہ کاکوری کے چودھری محلہ میں ساگر تالاب کے کنارے واقع مسجد جس کو مخدوم شیخ قیام الدین نے تعمیر کرایا تھا اس کو منہدم کر کے ان کے پوتے شیخ عبدالواحد نے ۱۳۱۴ھ میں از سر نو تعمیر کرایا۔ کتبہ مسجد میں لگا ہے ؎

حامی دیں شیخ عبدالواحد از فضل الٰہ
مسجد عالی بنا کرد از برائے عابدین
بانیش را در حق تعمیر یارب ایں ندا
آید از فردوس طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خَالِدِیْن
گوہر سالش بالماس دعا عشق بسفت
یارب ایں مسجد منور باشد از انوارِ دین

۱۳۱۴ھ

کاکوری اور رحمان کھیڑہ کے درمیان تیا نالے پر راجہ مکیت رائے نے پختہ پل تعمیر کرایا تھا۔ پل کے شروع میں جو کھمبہ ہے ایک قطعہ اس پر

کندہ ہے اور کھمبا جو آخر میں ہے قطعۂ تاریخ کندہ ہے۔ دونوں کے سن دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پل دو سال کی مدت میں بن کر تیار ہوا۔ دونوں قطعات درج ذیل ہیں ؎

(کذا)

راجہ ٹکیت رائے فیاضِ زماں
ساخت بر بتیا پل خوب و قدیم
پیرِ نکہت از پئے تاریخ گفت
نیک محکم ہیں صراط مستقیم

سنہ ۱۲۰۰ھ

ٹکیت رائے مہاراجہ دام دولتہٗ
چو شد بنا پل بتیا ز حسن تدبیرش
شدم ز ملہم غیبی چوں سائل تاریخ
بگفت معبر فیض است سال تعمیرش

سنہ ۱۲۰۲ھ
۱۸۴۵ء

کاکوری میں تاریخ گوئی کی روایت زمانہ قدیم سے موجود ہے۔ یہاں کے تقریباً ہر شاعر نے اس فن میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ دردؔ کاکوروی کے استاد شریف الدین شریفؔ کاکوروی، ان کے استاد مولوی محی الدین ذوقؔ تفضل حسین خاں شیداؔ، محسنؔ کاکوروی اور مولوی محمد عالم قیصریؔ نے کثیر تعداد میں قطعات کہے ہیں۔ بالفاظِ دیگر فن تاریخ گوئی کے فروغ میں ان شعرا نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ محی الدین ذوقؔ کو تو خصوصاً اس فن میں مہارت حاصل تھی وہ فارسی ہی نہیں عربی میں بھی تاریخ کہتے تھے۔ بعض تاریخیں تو ایسی کہی ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں۔ مذکورہ شعرا

کے چند قطعات بطور نمونہ درج ہیں ؎

محی الدین ذوقؔ نے عالم نزع میں اپنی تاریخ وفات کہہ کر لکھوائی تھی۔

دریں سالِ ہجری بغیں داشتم
کہ مرگم نصیب است پنداشتم
زہاتف سنِ فوت خود خواستم
بگفتہ بگو ذوقؔ برخاستم
۱۳۰۲ھ

محی الدین ذوقؔ کا ایک اور قطعہ ملاحظہ فرمائیں جو صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور ہر مصرعہ سے الگ سن برآمد ہوتا ہے۔ یہ قطعۂ تاریخ مولانا حاجی امین الدین شاہ محدثؒ کی لوحِ مزار پر کندہ ہے اور فن تاریخ گوئی پر ذوقؔ کی زبردست دسترس کا مظہر ہے ؎

ہیہات کہ آں معدن انوار شریعت
سمبت ۱۸۹۴

داماں زجہاں چید سوئے دارِ جناں رفت
فصلی ۱۲۴۴

بلبل صفت از دردِ جہاں نالہ بہ سنجم
۱۲۵۲ھ

آدنح کہ زہے عارفِ کامل زجہاں رفت
۱۸۳۷ء

قطعہ تاریخ وفات مولوی حامد علی از شریف کاکوروی ؎

چاردہ ماہ جمادی الاول و یوم خمس
مولوی حامد علی صاحب بخواب ناز خفت
سال تاریخ وفاتش ہاتف از طرح جدید
یکہزار و دو صد و ہشتاد و دو ہجری بگفت
۱۲۸۲ھ

قطعۂ تاریخ وفات منشی رسول بخش شہید و عبد الصمد شہید - از تفضل حسین خاں شیدا کاکوروی ؎

عبد الصمد جناب و قبلہ رسول بخش
تو ام زحادثات فتادند ہر دو لخت
تاریخ بست و چہارم شوال وقت صبح
روزِ چہار شنبہ بہم شد بلائے سخت
آمد دو بار سال ز شیدا بمصرعے
گفتہ بہ بیں قضا و قدر دو جگر دو لخت
۱۲۷۳ھ - ۱۲۷۳ھ

قطعۂ تاریخ وفات شاہ تراب علی قلندر۔ از محسن کاکوروی۔

چوں ساختند قبر شریف تراب شاہ
مقبول بارگاہ خداوندِ ذو المنن
گفتا سروش مرقد پاک تراب شہ
محسن بخواند خواب گہہ مرشد زمن
۱۲۷۵ھ

قطعۂ تاریخ وفات عارف باللہ شاہ صبغت اللہ قلندر
از قیصری کاکوروی۔

عارفِ بے نفس شاہ صبغت اللہ شیخ عصر
کز رموز شاہ شکراللہ آگاہ آمدہ
ہم ز خوانش نعمت شاہ محمد ماہ یافت
کز طفیل شاہ عاشق از بجا شاہ آمدہ
سیزدہ ماہ محرم بود کز دنیا برفت
بر لب جن و بشر صد نالہ و آہ آمدہ
قیصری دریاد ذات حق چو ذاتش محو شد
پس بذات حق وصالش حب دلخواہ آمدہ

۱۳۱۱ھ

دردؔ کاکوروی نے رواج زمانہ سے اثر قبول کیا۔ ان میں غضب کی عالمانہ اور شاعرانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ چونکہ انہوں نے قدیم مشرقی تعلیم کے تمام مرحلے طے کیے تھے اس لیے وہ اصنافِ سخن کے فنی پہلوؤں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ تاریخ گوئی کے مخصوص فن میں بھی انہوں نے اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے اور کثرت سے تاریخی قطعات کہے ہیں۔ تاریخ گوئی میں ان کے استاد شریفؔ کاکوروی جو یگانہ روزگار تھے انہوں نے اپنے استاد سے بے حد کسب فیض کیا۔

دردؔ نے کثیر تعداد میں تاریخی اشعار کہے ہیں لیکن ان کا ایک بڑا حصہ منظر عام پر نہ آسکا کیونکہ ان کی نگاہ میں یہ کوئی کمال کی بات نہ تھی لیکن اردو میں اب اس فن کے جاننے اور برتنے والوں کی نسل رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی ہے۔ دورِ جدید میں بہت کم شاعر ہیں جو تاریخ گوئی کے دشوار شعری تجربہ کے لائق ہیں۔

دردؔ کاکوروی نے متعدد قطعاتِ تاریخ کہے ہیں جو ادھر ادھر بکھرے

پڑے ہیں۔ حضرت انہوں نے اپنی کتاب " بارہ امام " میں رسولِ خدا صلعم، حضرت بی بی فاطمہ زہراؑ، خلفائے راشدینؓ اور بارہ اماموں کی تاریخ ولادت و وفات اپنے ایک ایک شعر میں نظم کی ہے۔ ان کے صرف دو قطعاتِ تاریخ .... "جذباتِ درد" میں موجود ہیں۔ کچھ قطعات کاکوری اخبار و نیز دوسری کتابوں سے بھی دستیاب ہو گئے ہیں۔ درد نے تقریباً اپنی ہر کتاب کی طباعت کے موقع پر تاریخی قطعات کہے ہیں جو ان کتابوں میں شامل ہیں۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں میں تاریخ گوئی کی ہے۔

ان کے جو تاریخی قطعات ہیں وہ یا تو کتابوں کی اشاعت کے موقع پر کہے گئے ہیں یا پھر مختلف لوگوں کی وفات کے موقع پر۔ درد کے جو قطعات تاریخ وفات دستیاب ہوئے ہیں وہ حضرت شاہ تقی حیدر قلندرؒ، حضرت شاہ حبیب حیدر قلندر، جناب خسرو کاکوروی، جناب محمد احمد علوی اور جناب اعجاز حسین اعجاز کاکوروی کی وفات پر کہے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

قطعہ تاریخ وفات حضرت شاہ حبیب حیدر قلندر

فغاں کہ رحلت نمود ناگہ سلالۂ رشدِ دینِ اطہر
جناب کاظم، تراب و حیدر تقی و اکبر علی انور
بفکرِ سالِ وصال بودم سروش گفتہ بگو مکرم
وصال شاہ حبیب حیدر وصال شاہ حبیب حیدرؒ

۱۳۵۴ھ

منشی اعجاز حسین علوی اعجاز کاکوروی، درد کاکوروی کے ہمعصر بھی تھے اور دوست بھی۔ اعجاز صاحب نے یادِ وطن کے نام سے کاکوری کے متعلق ایک مثنوی لکھی تھی جو ڈپٹی امیر احمد علوی کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۲۷ء میں

شائع ہوئی تھی۔ درد نے ان کی وفات پر حسب ذیل قطعہ کہا ہے ؎

صاحبِ دیوان تھے اعجاز حسین
حیف رحلت کر گئے نادر ادیب
سالِ رحلت درد ہاتف نے کہا
شاعرِ معجز بیاں جنت نصیب
۱۳۵۹ھ

نواب حسین نواز جنگ بہادر منشی معراج الدین خسرو کاکوروی اپنے زمانے کے بہترین شاعر تھے ان کے کلام کا انتخاب چند سال قبل ڈاکٹر مسعود انور علوی نے 'انتخاب کلام خسرو کاکوروی' کے نام سے شائع کیا ہے۔ ان کی وفات پر جو قطعہ تاریخ درد کاکوروی نے کہا ہے وہ لوحِ مزار پر کندہ ہے ؎

حیف آں مردِ مختیر رفتہ
داشت او جملہ صفات خسرو
درد دل گفت ز روے افسوس
سالِ تاریخ وفات خسرو۔ [۱]
۱۳۵۴ھ

حضرت مولانا شاہ تقی حیدر قلندر کی وفات پر درد صاحب نے جو قطعہ تاریخ کہا ہے وہ ان کے دوسرے قطعات کے مقابلہ میں خاصا طویل ہے۔ یہ قطعہ سات اشعار پر مشتمل ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: ؎

صد حیف تقی حیدر افسوس مہ انور
از دیدۂ عالیاں آمد بحجاب اندر

---

[۱] انتخاب کلام خسرو کاکوروی از ڈاکٹر مسعود انور علوی کاکوروی ص ۳۲ ۱۹۸۴ء

آں پیر طریقت را واللہ جہاں بینم
حیرانم و گریانم ہر لحظہ بخواب اندر
خود رفتہ دراں عالم ہے ہے چہ بتو گویم
بگزاشت دریں عالم بارا بحزاب اندر
از شاہ حبیبِ حق چوں خرقۂ بیعت یافت
فی الجملہ مکمل شد عارف بہ شباب اندر
طغرائے خیال او بیں جذب وکمال او
تاریخ وصال او ہم یافت حساب اندر
مشہود کمالِ حق شیدائے جمالِ حق
شاداں بہ وصالِ حق آمد بہ نقاب اندر
از سال وصال او اے دردؔ سروشے گفت
اکلیل لقا آمد ہیرے بہ تراب اندر

۱۳۵۹ھ

"جذباتِ دردؔ" کے مقدمہ میں انہوں نے جن حضرات کا ذکر ضمناً کیا ہے ان میں سے امیر حسن دہلوی، علامہ آزاد بلگرامی اور نور الضیاء الدین نواب ضیا یار جنگ بھی شامل ہیں۔ ان تینوں کی وفات پر لکھے ہوئے قطعات بھی مذکورہ کتاب میں شامل ہوئے ہیں۔ امیر حسن دہلوی پر دردؔ نے ایک مضمون بھی لکھا تھا جو ماہنامہ عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا ہے۔

قطعۂ تاریخ امیر حسن دہلوی

حسن شد او شراب حسن لبریز
چناں شد جان شیریں لذت آمیز

بگفتہ ہاتفِ غیبی، کہ اے درؔد
بگو سالِ وفاتِ او شکر ریز
۱۲۳۷ھ

قطعۂ تاریخ وفات غلام علی آزاد بلگرامی

رفت علامۂ زماں افسوس
یعنی حضرت غلام علی آزاد
پس حزیں دور کردہ درؔد بگفت
گشت از قید عنصری آزاد
۱۲۰۰ھ

قطعۂ تاریخ وفات نور الضیاء الدین نواب ضیاء یار جنگ

دن تھا منگل کا تو چھبیس محرم کی تھی
ہو گئی رحلت علامۂ ضیاؔ صد افسوس
سالِ رحلت کے لیے درؔد یہ رضواں نے کہا
لکھ دو سرمایۂ ادبِ یر تو ن الفردوس
۱۳۷۲ھ

حکیم مومن خاں مومن نے جس رنگ میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تاریخ نکالی تھی اسی رنگ میں درؔد نے محسؔن کاکوروی کی تاریخ وفات نکالی۔ ملاحظہ ہو

حسبِ حکم حضرت شارع ز اسہال کبد
چوں شہادت کرد حاصل شاعرِ محسؔن نکو

سالِ رحلتِ درد، بہر حضرت محسن شہید
از سرِ جا بنازد گریاں شیون غمگیں بگو
۱۳۲۳ھ

درد کاکوروی نے قطعات تاریخ وفات کے علاوہ جو دوسرے تاریخی قطعات کہے ہیں وہ ان کی کتابوں کی طباعت کی تاریخوں پر مشتمل ہیں ۔ درد نے جن کتابوں کی تاریخیں کہی ہیں ان میں شعری مجموعے بھی ہیں اور نثر میں ادبی اور مذہبی کتابیں بھی ہیں۔ انہوں نے ہر کتاب کی طباعت کے موقع پر تاریخی قطعہ کہا ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے صرف چند شعری، ادبی اور مذہبی کتابوں کے قطعات تاریخ پیش کیے جا رہے ہیں جس سے فن تاریخ گوئی میں درد کی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

جذبات درد، درد کا درماں، جام کوثر، صوفیانہ نظمیں، اردو اور شمالی ہند، سیرت قادری، سماع کی حقیقت، اچھے اعتقاد، عاشورہ اور بارہ امام کی طباعت کے تاریخی قطعات پیش ہیں۔

جذباتِ درد

چھپا جو درد کا دیوان منتخب ایوان
ہوئے نہ عشق سے پورے مطالبات سخن
کہا یہ ہاتف غیبی نے درد، ہجری میں
کہ سال طبع ہے اس کا نوادرات سخن
۱۳۶۲ھ

درد کا درماں

شکر خالق چھپ گیا مجموعۂ نعت نبیؐ
اس سے ظاہر ہے بحمد اللہ قبولیت صفت
گرچہ مدت بعد نمبر اس کا آیا پھر بھی درد
تم لکھو سالِ طباعت عرش کرسی منزلت

۱۳۸۷ھ

جامِ کوثر

چھپا شکرِ خدا نعت نبیؐ کا خوب مجموعہ
قبول بارگاہِ مصطفےؐ ہو کاش یہ دفتر
فرشتوں نے کہا سالِ طباعت درد یہ لکھو
بحمد اللہ ہے، ہتاب جام ساقی کوثر

۱۳۸۹ھ

صوفیانہ نظمیں

رنگیں بہ فضل حق ہے ہر شعر صبغت اللہ
مطلق سے کب ہے باہر وصفِ مقیدانہ
سال طباعت اس کا ہے درد دل نے لکھا
شوق وصال بے حد اشعار صوفیانہ ۱۳۸۹ھ

سیرت قادری

کس درجہ منتخب ہے غوث الوریٰ کی سیرت
کہتے ہیں اہل دل یہ انعام قادری ہے
ہے شکر دردؔ دل سے بولا سروش غیبی
تاریخ طبع لکھ دو یہ انعام قادری ہے
سنہ ۱۳۶۸ھ

سماع کی حقیقت

کلام باری حدیث حضرتؐ سے ہے مزین تمام نسخہ
چھپا نہ اب تک جو یہ رسالہ تو اس میں تھی کچھ خدا کی حکمت
خدا کا ہے شکر چھپ گیا اب تو دردؔ غیبی فرشتہ بولا
بفیض و لطف محمد احمد لکھو طباعت نصیب نصرت
سنہ ۱۳۷۴ھ

عاشورا

مقام غور ہیں سب واقعات اکبر و اصغر
مبارک کس قدر ہیں فعل اور افعال عاشورا ۱۳۸۷
جو فکر سال ہجری ہے لکھو روئے قواعد تم
لکھو اے دردؔ دل روز طلب اعمال عاشورا
سنہ ۱۳۸۷ھ

بارہ امام

ہوئی طبع شکر خدا یہ کتاب
ہے اس سے اماموں کا ظاہر کمال
برابر سے درد تاریخ ہے
جگر تشنہ بارہ اماموں کا حال

۱۳۸۵ھ

تاریخ گوئی میں بھی درد کی مہارت ان کے علم و فضل کا نتیجہ ہے۔ اور یہ علم و فن قدیم طرز کی تعلیم کا عطیہ ہے جس میں شعر و سخن کو بڑے اہتمام سے اس طرح پڑھایا جاتا تھا کہ ان کے تمام فنی محاسن اور لسانی امکانات طالب علم پر روشن ہو جاتے۔ یہ تعلیمی نظام اس صدی کی ابتدا تک پوری طرح سلامت رہا۔ اس نے جس نسل کو پیدا کیا تھا وہ بیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے بزرگوں کی صف میں داخل ہو گئی تھی اور اب بیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ ہمارے درمیان سے تقریباً رخصت ہو گئی ہے۔ درد کاکوروی اسی نسل کے نمائندہ تھے۔ اس لیے تمام اصنافِ سخن پر ان کو پوری دستگاہ حاصل تھی۔ تاریخ گوئی بھی ان کے کمالات میں سے ایک کمال تھی۔ اب برجستہ اور بامعنی تاریخ گوئی کے فن کار خال خال باقی رہ گئے ہیں ورنہ پہلے تو تمام کتابوں کے تاریخی نام بھی رکھے جاتے تھے۔ اساتذۂ سخن کے دواوین اور کلیات میں خود ان کی یا ان کے شاگردوں کی کہی ہوئی تاریخیں شامل ہوتی تھیں۔ جب چھاپہ خانوں کا رواج ہوا تب بھی کتابوں کی دنیا میں یہ روایت

مدتوں برقرار رہی ۔ اہم اور غیر اہم کتابوں کے ایسے قدیم ایڈیشن جب دستیاب ہوتے ہیں تو ادب کی تاریخ کو ان سے بڑا فائدہ ہوتا ہے کہ کتاب کا سنِ اشاعت اور دیگر تفصیلات کا مستند حوالہ مل جاتا ہے۔ اردو تحقیق اور تنقید میں اس سے بڑی مدد لی جاتی ہے۔

--

تضامین کی خصوصیات

تضمین بھی فارسی اور اردو شاعری کی روایتوں میں بہت اہمیت رکھتی ہے اگرچہ اب اس کا رواج اسی طرح اٹھ گیا ہے جس طرح سے طرحی مشاعروں کی تعداد بہت کم ہو گئی ہے۔ طرحی مشاعروں اور تضمین نگاری میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ شاعر اپنے شعری وقار کو شعوری طور پر ایک دائرے میں بند کر دیتا ہے۔ طرح کے مصرعہ پر غزل کہنے میں ردیف و قافیہ اور بحر کی پابندی ہوتی ہے۔ عام طور پر مصرعہ طرح پر غزل کہنے میں خاصی جانکاہی کرنا پڑتی ہے۔ تضمین نگاری میں ایک شاعر کو بلاشبہ ایک آزادی حاصل ہوتی ہے پھر بھی اس کا اصل کام یہی ہوتا ہے کہ جن اشعار کی تضمین کی گئی ہے ان میں ہر شعر کے بنیادی خیال سے ہم آہنگ اشعار کی تخلیق کر کے تضمین کا حق ادا کیا جائے۔ تضمین بلاشبہ ایک دشوار تخلیقی عمل ہے اور یہ نہ صرف تربیت یافتہ ذوقِ سخن کے بغیر ممکن نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ تضمین نگار کو زبان و بیان پر ایک قدرت ہو کہ وہ تضمین کو شعری شرح کے درجہ پر پہنچا دے تاکہ تضمین کے ذریعے اصل شعر کے مفہوم اور معانی مزید اجاگر ہو سکیں۔ تضمین کی تعریف و توصیف پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی رقم طراز ہیں :

> کسی شاعر کے کئی شعر یا مصرعے یا قرآن کی کسی آیت اور حدیث کے کسی ٹکڑے کو اپنے کلام میں شامل کر لینے کا نام تضمین ہے اور اس کے لیے ایک تو حسنِ انتخاب کی ضرورت ہوتی ہے

کہ جو شعر یا مصرع لیا جائے، وہ نہایت برجستہ، نادر اور پسندیدہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اسکو اپنے اشعار کے ساتھ اس قدر مربوط کر لیا جائے کہ وہ اپنے کلام کا جزو ہو جائے [1]۔"

اسی طرح ڈاکٹر ابو محمد سحر تضمین کی خوبی یہ بیان کرتے ہیں :

"تضمین کی خوبی یہ ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے شعر پر اس طرح مصرعے لگائے جائیں کہ اس کے تخیل کی توضیح ہو جائے یا نئے معنی پیدا ہو جائیں اور شعر بول اٹھے [2]۔"

درد کاکوروی تضمین نگاری کے اس فن کو بڑی خوبی اور کامیابی سے بروئے کار لائے ہیں اور وہ اس کے لیے ہر طرح سے موزوں بھی تھے وہ شعر و سخن کے ذائقہ شناس تھے، زبان و بیان پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ اردو کے علاوہ وہ عربی اور فارسی سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ اس لیے چاہے اردو کے اشعار پر تضمین نگاری ہو یا فارسی اشعار پر، درد کاکوروی کی تضمین نگاری مکمل اور معتبر ہے۔ عربی کلمات کا برمحل استعمال بھی تضمین نگاری میں ان کی مہارت کا ثبوت ہے۔

درد کاکوروی کی تضمینوں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک تو ان کی وہ تضمینیں ہیں جو اردو شاعری کے بہترین نمونوں کا مجموعہ ہیں۔ دوسری وہ تضمینیں ہیں جو انہوں نے فارسی کے بلند پایہ اشعار پر قلمبند کی ہیں۔ ان دونوں کا انتخاب انہوں نے اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق عارفانہ شاعری کے اس سرمایہ سے کیا ہے جو حمد و نعت، منقبت یا خالص صوفیانہ فکر و خیال سے مالا مال ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو اور فارسی کی مشہور و مقبول نعتوں پر تضمین کر کے

---

[1] اقبال کامل ص۲۲۳ از مولانا عبدالسلام ندوی ۱۹۶۴ء۔ [2] مطالعہ امیر مینائی ص۳۴۶ از ڈاکٹر ابو محمد سحر

ان کے جذبات و احساسات کو دو آتشہ بنا کر سامعین اور قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس نوعیت کی تضمینوں میں انہوں نے فارسی کے جن باکمال عارفان حقیقت اور ادباء و شعراء کا انتخاب کیا ہے ان میں امیر خسرو، اور امیر حسن دہلوی بھی شامل ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی، جامی، نظامی، شیخ احمد جام، سعدی، حافظ، عثمان ہارونی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدسی، فخرالدین عراقی، شیخ نظام الدین اولیا، شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی جیسے ممتاز بزرگان دین بھی شامل ہیں۔ اردو میں انھوں نے شاہ نیاز بریلوی، شاہ کاظم قلندر، شاہ تراب علی قلندر، حسرت موہانی، اور جگر مرادآبادی وغیرہ کے کلام پر تضمینیں کی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کی تضمینوں میں استادانہ رنگ ہے اور یہ تضمین نگاری کا پورا حق ادا کرتی ہیں۔

درد کاکوروی کا ایک اہم کام تضمین کے میدان میں فارسی اور اردو کی عارفانہ غزلوں پر تضمین کا ہے جو ابتداء سے اب تک سماع کی محفلوں کی جان رہی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں خانقاہوں اور بزرگوں کے حلقوں میں سماع کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ہندوستان میں خصوصیت سے چشتی مسلک کی خانقاہوں نے شعر و سخن کی طرح سماع کی بھی خصوصی سرپرستی کا فرض انجام دیا۔ اس زمانہ میں سماع کی محفلوں کا معیار بہت بلند تھا اور ایسی محفلوں میں حمد، نعت اور منقبت یا عارفانہ غزلوں کا عام رواج تھا۔ یہ وہ عارفانہ شاعری تھی جس میں مجاز کے باریک، لطیف اور رنگین پردوں کے پیچھے حقیقت صاف نظر آتی تھی۔ سماع اور سماع کی محفلوں کی غرض و غایت اور اہمیت یہی تھی۔ زمانہ بدلا تو سماع کی محفل اپنے آداب اور معیار کھو دینے کی نوبت کو پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ سماع کا تصور تک بدل گیا اور اس کو عام طور پر قوالی اور قوالی کی محفل

کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ یہ ایک ناخوشگوار تبدیلی تھی جس سے سماع کی حقیقی اہمیت اور افادیت کو بہر حال دھکا لگا۔

قوالی کا لفظ ایک اصطلاح بن کر بھی یہ وضاحت کرتا ہے کہ بہر حال یہ سماع نہیں ہے بلکہ قوالوں کا فن ہے۔ اس میں شعر و سخن سے زیادہ نغمگی اور موسیقی پر توجہ ہوتی ہے۔ موسیقی کے واقف یا موسیقی کے ماہر کو شعریت سے سروکار نہیں ہوتا، آہنگ و نغمگی سے ہوتا ہے۔ اس لیے قوال جن فن پاروں کا انتخاب کرتے ہیں ان میں شعر و سخن کی بلندیوں کو سامنے نہیں رکھتے بلکہ عام فہم اور عام پسند شاعری کے نمونوں کو اپنے فن کے اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس مخصوص پس منظر کو سامنے رکھا جائے تو یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ قوالی نے سماع سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ سماع کے کلاسیکل معیار کو خواص پسند بناتے تھے۔ مدت تک سماع کا مطلب سماع بلا مزامیر رہا۔ قوالی میں مزامیر نہ صرف ایک ضروری حصہ ہے بلکہ قوالی کی بنیاد ہی ساز و آواز دونوں کی ہم آہنگی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوالی نے اپنی عام پسندی کے بل پر بڑی مقبولیت حاصل کی۔ خانقاہی نظام کے زوال کے ساتھ سماع کی محفلوں پر بھی زوال آیا اور ان کی جگہ مزارات کے عرس کا سلسلہ زیادہ رائج ہو گیا اور ان میں عوام کی بھیڑ بھاڑ نے قوالی کو عرس کا ایک جزو بنا دیا۔ سماع فکر و جذبے کی تہذیب کا ذریعہ تھا۔ قوالی کا مقصد یہ نہیں تھا۔ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ خود خانقاہوں میں اس ناخوشگوار صورت حال کا احساس برابر کیا جاتا رہا اور اکثر اہم اور مشہور آستانوں میں عرس کے موقع پر یہ پابندی بھی لگا دی گئی کہ قوالیوں میں صرف مستند عارفانہ کلام ہی پیش کیا جائے اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ علم و معرفت کا معیار بھی سلامت نہیں رہا تھا۔

درد کاکوروی نے قوالی کے مقصد اور اس کی افادیت کو پیش نظر رکھ کر قوالی کی محفلوں میں سنائے جانے والے معیاری اور مستند کلام پر تضمین نگاری کی ہے۔ حمد و نعت یا عارفانہ شاعری کے ان نمونوں کا تعلق فارسی اور اردو کے بزرگ ترین شاعروں سے ہے۔ انھوں نے قوالیوں کی محفلوں کا معیار بلند کرنے کے لیے اس عارفانہ فارسی شاعری پر مخمس کی شکل میں تضمین لکھی ہیں۔ وہ سماع کے فلسفے اور غرض و غایت سے بخوبی واقف تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے سماع کی حقیقت کے نام سے نثر میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اپنے ان خمسوں کے مجموعے کی ابتدا میں بھی انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"بزمانۂ قدیم عرسوں، فاتحوں میں جو چیزیں گائی جاتی تھیں یہ کتاب ان چیزوں کے اردو خمسوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان پر اردو خمسے لکھ دیئے گئے ہیں تاکہ اردو زبان میں دلچسپی کی ہی وجہ سے۔ بزرگوں کی چیزیں زبان زد ہو جایا کریں۔ خدا نے موقع دیا تو فارسی خمسہ جات فارسی کے دیوان میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ بعض حضرات کے اصرار پر خمسوں کے علاوہ کچھ فارسی اردو چیزیں بھی شریک کر دی گئی ہیں۔ اللہ اپنے حبیب کے صدقے میں اس مجموعے کو قبولیت کا شرف بخش دے۔ آمین۔" [1]

اپنے اسی نقطۂ نظر کو انھوں نے تضمین نگاری کے اس مجموعہ میں اچھی طرح نبھایا ہے۔ انھوں نے جن شاعروں کے کلام پر تضمینیں کی ہیں ان میں

---

[1] خمسہ جات قوالی۔ از درد کاکوروی۔ ص ۲

مولانا روم، امیر خسرو، جامی، نظامی، قدسی، حافظ جیسے ممتاز فارسی شاعروں کے علاوہ ہندوستان کے بزرگان دین اور اردو شاعری کے بہترین عناصر کا انتخاب کر کے ان پر تضمینیں کی ہیں جو مخمس کی شکل میں ہیں۔ ہر ایک مخمس کا مقصد یہ ہے کہ وہ اردو زبان میں اپنے مصرعوں کے ذریعہ اصل فارسی شعر کا مفہوم واضح اور روشن کرتا ہے۔ اردو کلام پر کی جانے والی تضمینوں میں یہی مقصد کار فرما نظر آتا ہے۔ درد کی تضمینوں کا شعری اور فنی معیار بہت بلند ہے کیونکہ انہوں نے اصل کلام کے رنگ و آہنگ سے ہم آہنگ مصرعے اور اشعار اپنی تضمینوں میں استعمال کیے ہیں اور کلام کے جوش و جذبہ کو اپنے دل و دماغ میں پوری طرح جذب کر کے تضمین نگاری کی ہے۔ مولانا روم کی عارفانہ غزل پر تضمین میں اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔ ؎

اب کرم فرما خدارا ساعتے
کب یہ فرقت ہے گوارا ساعتے
ناز سے چل آشکارا ساعتے
اندر آ در خانہ یارا ساعتے

تازہ کن ایں جان ما را ساعتے

مولانا روم کی یہ غزل اپنے مرشد شمس تبریزی کی یاد میں کہی گئی ہے اور رومی کے دیوان کبیر کی دو تین اہم غزلوں میں سمجھی جاتی ہے۔ یہ سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہے۔ پوری غزل مولانا جلال الدین رومی کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اپنے روحانی رہنما کے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رومی نے بھی کچھ کہا ہے۔ اس پر درد کا کوروی کی تضمین نگاری اصل کلام سے ماخوذ ہے اسکو بڑی کامیابی سے اُجاگر کردیا ہے۔ ؎

سارے تارے کہہ رہے ہیں با طرب
کھل گئی چشمِ بصیرت بہر رب
اب ہو کچھ ایسی نگاہِ منتخب
تا ببیند آسماں در نیم شب
آفتابے آشکارا ساعتے

حاملِ حق تاکہ ہو مجبورِ عشق
عشرت آگیں تاکہ ہو رنجورِ عشق
اس قدر دکھلا تجلی طورِ عشق
تا ز قونیہ بتابد نورِ عشق
تا سمرقند و بخارا ساعتے

چھوڑ کر تجھ کو بھلا جائیں کہاں
دردِ تیرا دل میں ہے جانِ جہاں
اے جمالِ آفتابے لامکاں
روئے خود بنما بریں شوریدہ گاں
شمس تبریزی خدارا ساعتے

ان کی تضمین نگاری کا یہی کمال ان کے خمسوں میں بھی نظر آتا ہے جو انہوں نے فارسی کی طرح اردو کے عارفانہ کلام پر کی ہے۔ کاکوری کے شاہ کاظم قلندر اور شاہ تراب علی قلندر دو بہت مشہور صوفی گذرے ہیں۔ وردا انہیں کے سلسلے میں بیعت تھے۔ انہوں نے شاہ کاظم قلندر کی ایک عارفانہ غزل پر تضمین کی ہے جس میں وجودی فلسفہ کی اصطلاحوں کا استعمال بھی بڑی کثرت سے کیا گیا ہے۔

ملاحظہ ہو:

سرِ عرش لوح و قلم دیکھتے ہیں
جو تقدیر میں ہے رقم دیکھتے ہیں
غرض فضل حق دمبدم دیکھتے ہیں
ہم اس دل کو بیت الحرم دیکھتے ہیں
تمام اس میں نور قدم دیکھتے ہیں

کبھی حق کو ہر شے میں آنکھیں منزہ
کبھی حق کو ہر شے میں جانیں مشبہ
کبھی حق کو آدم سے سمجھیں مبرّا
کبھی حق کو عالم سے دیکھیں منزہ
کبھی عالم و حق بہم دیکھتے ہیں

شاہ تراب علی قلندر کے عارفانہ کلام پر ان کی تضمین میں کیف ومستی کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ کیونکہ اصل کلام میں یہی کیفیت موجود ہے ؎

مری رگ رگ میں کوئی آج نورِ بے خودی بھر دے
کوئی اپنی تجلّی سے مجھے مدہوش کر کر دے
اٹھا دے میری آنکھوں سے مری غفلت کے سب پردے
مئے وحدت سے مجھ کو بھی لبا لب ایک ساغر دے
میں صدقے اس کے ہو جاؤں جو متوالا مجھے کر دے

میں صبح و شام انا الحق کے لگاؤں دمبدم نعرے
ہو دنیا سے غرض مجھ کو نہ ہو کچھ کام عقبیٰ سے
نہ ہو اپنی خبر مجھ کو ترے قرباں ترے صدقے
پلا ساقی مجھے وہ مئے جو ذوقِ بے خودی بخشے
رگ و ریشے میں میرے کیفیت منصور کی بھر دے

ان کی تضمین نگاری میں تضمین کے تمام تقاضے پورے ہوتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کی وہ تضمینیں ان کا شاہکار کہی جا سکتی ہیں جو انہوں نے اوحد الدین اوحدی کرمانی کی فارسی نعت پر کہی ہے۔ اوحدی نے یہ نعت اس وقت کہی تھی جب وہ عزم سفر کر رہے تھے تاکہ کعبۃ اللہ کے طواف کے بعد مدینہ منورہ پہنچ کر روضۂ مبارک کی زیارت کر سکیں۔ اس مقدس سفر کے سارے جذبے اور کیفیت کو اوحدی نے بے مثال مرصع شاعری کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ درد کاکوروی نے اوحدی کے جس نعتیہ کلام کے جذبے اور احساس سے پورا تاثر لیا ہے اور اوحدی کے ہر نعتیہ شعر پر اردو کے جو تین مصرعے لگائے ہیں ان میں جذب و سرمستی کی وہی کیفیت ہے جو اوحدی کے یہاں ہے اور فکر و خیال کی وضاحت اتنی مرصع زبان میں ہے جو اوحدی کی اس فارسی نعت کی انفرادیت ہے۔ چند بند ملاحظہ فرمائیں ؎

اے رحمت للعالمین محبوب رب ذو المنن
دے سرور دنیا و دیں اے پاک ترا زما و من
آئے مبارک وہ گھڑی اے قافلہ سالار من
خوش آنکہ بندم در رہت بر ناقہ محمل از وطن
خیزم چوں گرد افتم چوں اشک آیم بسر غلطم برتن

سر میں جنوں لب پر فغاں خطرے میں جاں سینے میں غم
اس پر بھی یہ ہمت مری بڑھتی رہے ہر ہر قدم
اے رحمت للعالمین عاجز پہ ایسا ہو کرم
چوں پا نہم در راہ تو باشد پئے قطع رہم
پا راحلہ، کف آبلہ، چشم قدم، عمر ادمن

چہرہ ہے مرجھایا ہوا، لب خشک ہیں، آنکھیں ہیں نم
ابرِ سخا، دریا عطا، ہو موج زن بحرِ کرم
یوں ہو دوائے دردِ دل اے سیدِ والا حشم
آیم بریں دارالشفا، گویم بزاری دمبدم
کے شمعِ دیں، ختمِ رسل، مطلوبِ حق، فخرِ زمن

اے شاہ عالی مرتبت سلطان او ادنیٰ لقب
بندے سے کیا ہو منقبت سلطان او ادنیٰ لقب
حضرت امیر معدلت سلطان او ادنیٰ لقب
شاہ سریر سلطنت سلطان او ادنیٰ لقب
مکی نسب، اُمّی حسب، بطحا مکاں، یثرب وطن

ہو وصفِ محبوبِ صمد، ساعت بہ ساعت تازہ تر
ان پر درودِ بے عدد، ساعت بہ ساعت تازہ تر
کچھ ایسی ہو غیبی مدد، ساعت بہ ساعت تازہ تر
از گفتنِ نعتت بود، ساعت بہ ساعت تازہ تر
باغِ عمل، شاخِ طرب، گلزارِ جاں، نخلِ بدن

منصب نہیں، ثروت نہیں، دولت نہ ملک و سلطنت
مظلوم ہے ہر اُمتی، سلطانِ عالی مرتبت
نورِ خدا، فخرِ رسل، ایسی ہو عزت مرحمت
بعد وفاتم بس بود گرد ز راہِ معدلت
زادِ سفر، زیبِ عمل، شمعِ لحد، عطرِ کفن

لطف و عنایت سے تری ہے التجا شاہِ امم
دردِ دل پہ ہو چشمِ کرم، خورشیدِ حق نورِ قدم

دیتا ہوں آقا کو قسم مولا یہ مجبور ہوں نہ کم

اے آفتاب شرع دیں چوں سایہ پامال توام

در من گزر، بر من نگر، سایہ فگن، بر خرقِ من

تجھ کو نبیوں پر شرف حاصل ہے کامل سیدی

ذکرِ شبِ معراج ہے تفسیر سبحان الذی

کہتی ہے تیرے مہر سے معجز نما جلوہ گری

گر ضبط تو مانع شود گردد گریزاں یا نبی

مرگ از بر من، رنگ از عرض من گرگ از غنم، باز از زغن

ایمان بھی تجھ پر فدا، مومن کا ایماں ہے یہی

تو نور نوز سرمدی، صل علیٰ سیرت خفی

سرور ترے ہی وصف سے یہ دردِ دل ہے یا نبی

یاد کر نکو نعت تو خرم نشستہ ادحدی

آسودہ جاں، آزاد دش نے فکرِ دل، اندر بدن

وردؔ کاکوروی نے بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے عارفانہ کلام پر بڑی عقیدت اور احترام سے تضمین کی ہے۔ یہ سب سماع کی محفلوں یا قوالی کے جلسوں میں پڑھی جانے والی مشہور غزلیں ہیں۔ خالص ادبی اعتبار سے انہوں نے فارسی کے کئی مشہور شاعروں کی غزلوں پر بھی تضمین کی ہے۔ حافظؔ کا دیوان مدرسہ اور خانقاہ دونوں میں مقبول رہا ہے۔ یہ اپنی رنگینی، سرمستی اور تہہ داری کی وجہ سے فارسی غزل کی پوری روایت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ دیوان حافظ درس و تدریس کے نظام میں شامل تھا۔ حافظ کی بہت سی غزلیں زبان زد خاص و عام تھیں۔ وردؔ نے کلامِ حافظ کی تضمین بھی کی ہے۔ حافظ کی ایک مشہور غزل پر ان کی تضمین کا نمونہ حسبِ ذیل ہے ؎

بادۂ حق سے کرو خنو تازہ بہ تازہ نو بہ نو
رند کہیں گے حق ہو تازہ بہ تازہ نو بہ نو
رنگ جو لائے جذب ہو تازہ بہ تازہ نو بہ نو
مطرب خوشنوا بگو تازہ بہ تازہ نو بہ نو

بادۂ دل کشا بجو تازہ بہ تازہ نو بہ نو

امیر خسروؔ کی نعتیہ غزل پر ان کی تضمین بڑی دل کش اور اثر انگیز ہے ؎

واللیل وصف موئے تو زندان شان آزری
والنجم خال عارضت وجہ فغان آزری
والشمس فرمودہ خجل جان و جہان آزری
اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آزری

ہر چند وصفت می کنم در حسن زاں بالاتری

ای لقب، مکی نسب، آدم صدف تم ہو گہر
ہر مادے سے پاک تر، نور مجسم سر بہ سر
عشق خدا نے یوں کہا حسن اتم خیر البشر
ہرگز نہ یابد در نظر صورت ز رویت خوب تر

شمسے ندانم یا قمر یا زہرہ دیا مشتری

تضمین نگاری کے تمام فنی محاسن دردؔ کی ان تضمینوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں اصل کلام کی وضاحت، اس کے اپنے رنگ اور حتی الامکان اسی زبان میں کی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ آمد آمد شعری نہیں ہے بلکہ آورد ہے۔ لیکن ایک بڑے فنکار کی حیثیت سے دردؔ کا کورو اس ساختہ بے ساختگی میں پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ انکی تضمینوں میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جنکو کسی اچھی تضمین کی ضمانت کہا جا سکتا ہے۔

--

(ج) فارسی شاعری کا جائزہ

درؔد کا کوردی نے فارسی زبان اور فارسی شاعری کا طالب عالمانہ مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے وہ نہ صرف فارسی کے بہترین شعری سرمایہ سے واقف تھے بلکہ اس سے فیضیاب ہونے کے بعد انہوں نے اپنی شاعری میں اس سے پورا کام لیا۔ یوں بھی عارفانہ شاعری کا بہت بڑا حصّہ فارسی ہی میں ہے — بزرگانِ دین کے ملفوظات اور مکتوبات ہوں یا سلوک و معرفت کے مسائل کی تشریح و تعبیر کرنے والے رسائل اور کتابیں یہ سب فارسی کی ہی رہینِ منت ہیں۔ درؔد اپنی تعلیم اور ماحول کے علاوہ اپنے ذوق کی وجہ سے فارسی سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ یوں بھی اردو کے تمام استادانِ سخن نے فارسی شعر و ادب کے سایہ میں پرورش پائی تھی اس لیے میرؔ، سوداؔ سے لیکر غالبؔ تک تمام کلاسیکل شعراء نے اردو کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنانے کے باوجود فارسی شاعری سے اپنا ناطہ نہیں توڑا۔ غالبؔ تو اپنے اردو کلام کو اپنی فارسی شاعری کے مقابلہ میں "مجموعۂ بے رنگ" تک کہہ چکے ہیں۔ بیسویں صدی نے بھی ہندوستان میں فارسی کے کئی اچھے شاعر پیدا کیے۔ گرامیؔ جالندھری کا کلام تو ایران کے اہلِ زبان نے بھی تحسین و پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا۔ اردو کے عظیم شاعر علامہ اقبالؔ گرامیؔ جالندھری سے رہنمائی حاصل کرتے تھے اور خود انہوں نے فارسی میں بلند پایہ شاعری کی ہے۔ اقبالؔ کا نظریہ تھا کہ اردو بہرحال برصغیر تک محدود ہے اور فارسی ایک بین الاقوامی زبان کا درجہ رکھتی

ہے۔ ایشیا کے ایک بڑے حصہ میں اپنے افکار اور اپنے پیام کی اشاعت و تبلیغ کے لیے اقبال نے فارسی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ درد کاکوروی نے جب ہوش سنبھالا تو فارسی کا چرچا بالکل سرد نہیں ہوا تھا۔ کاکوری تو فارسی زبان کی تعلیم اور فارسی شعر و سخن کا بھی مرکز تھا۔ خاندانی کتب خانوں میں فارسی نثر و نظم کی بے شمار کتابیں موجود تھیں۔ انہوں نے جن بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں وہ ہماری قدیم تہذیب کا نمونہ تھے۔ اردو کی طرح فارسی بھی ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ درد کو فارسی وراثت میں ملی تھی۔ ان کے دادا حکیم مشتاق علی فارسی میں شعر کہنے پر مہارت رکھتے تھے۔ فارسی میں منظوم خطوط لکھنا ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

درد کاکوروی نے فارسی میں طبع آزمائی اپنی اس تہذیبی وراثت کے زیر اثر کی ہے۔ فارسی گوئی ان کا خاص میدان نہ ہونے کے باوجود انکی شاعرانہ صلاحیت کی مکمل طور پر آئینہ دار ہے۔ انہوں نے فارسی میں حمد و نعت بھی کہی ہیں۔ رباعی اور قطعات بھی کہے ہیں اور غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان سب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو کی طرح فارسی میں بھی اظہار خیال پر پوری طرح قادر تھے۔ فارسی غزل گوئی میں انہوں نے زبان اور فارسی کی شعری روایت سے واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ ایک فارسی غزل میں محبوب کے تصور اور اس کی ایک ایک ادا کا بڑا خوبصورت نقشہ اس طرح پیش کیا ہے۔ ؎

دلدار بودہ گیسو کمندے — آہو نگاہے جادو نگندے

بسیار تلخ و نازک مزاجے — از تند خوئی نخوت پسندے

در دل ستانی جادو نگاہے — آہو فریبے ناوک نگندے

در خاکساری عاجز نوازے — باز حسنِ دلکش منظر پسندے

ہر بند زلفش صد حلقہ دارے	آویخت جاہا بندے بہ بندے
از روئے انور روشن جہانے	وز عکس کاکل سایہ فگندے
صدہا چو مجنوں پابند دارے	صدہا چو لیلا گیسو کمندے

ہم سینہ بریاں ہم دیدہ گریاں
ہے ہے چہ پرسی از دردمندے

اسی مرصع اور آہنگ دار زبان میں انھوں نے ایک اور غزل لکھی ہے جس میں غزل کی تمام علامتوں کے ذخیرہ سے ایسی بہت معنی خیز علامتوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جو غزل کو لفظ و خیال سے مالامال کردیتی ہیں۔ اس غزل میں سوال وجواب کی ڈرامائی کیفیت بھی پوری طرح موجود ہے ؎

لب لعل تو چوں غنچہ چہ غنچہ، غنچہ خنداں
دو چشم سرمگیں خنجر چہ خنجر، خنجر براں
جمال یار می بینم بہ ہر شکلے بہر صورت
چہ صورت صورت معنی، چہ معنی، معنی پنہاں
بہ چشم حسن تو گلشن چہ گلشن گلشن جنت
بعالم روئے تو مصحف، چہ مصحف مصحف یزداں
مرنج اے گلبدن از من، منم گلچیں ایں گلشن
چہ گلشن گلشن عارض، چہ عارض عارض خوباں
زعکس تابش آں مہر انور گشتہ ام ذرہ
چہ ذرہ ذرہ اختر، چہ اختر اختر یزداں
برائے عاشق بیدل بود چشم سیہ جادو
چہ جادو جادوئے کافر چہ کافر کافر ایماں

عطا کن دردرا ساغر، چہ ساغر ساغر بادہ
چہ بادہ بادۂ دلکش، چہ دلکش دلکش مستاں

یہ جمالیاتی کیفیت ان کی فارسی شاعری پر حاوی ہے اور فارسی کی غزلوں کا بھی مزاج ہے۔ وہ دراصل ہندوستان میں فارسی شاعری کی اس روایت کے پاسدار ہیں جس کو ایران کے اہل زبان سبک ہندی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ سبک ہندی کی انفرادیت کا اعتراف ایران کے اہل زبان کو بھی ہے۔ دردؔ کاکوروی کی شاعری کو سبک ہندی کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے کہ ایک طرف وہ مرزا عبدالقادر بیدلؔ کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ان کو صائبؔ کی شاعرانہ عظمت کا احساس ہے۔

دردؔ کاکوروی کی فارسی شاعری کا بہترین زمانہ وہ تھا جب وہ اس صدی کی ابتدائی چوتھائی میں رام پور سے اورنگ آباد دکن پہونچے۔ اس زمانے میں اورنگ آباد سابق ریاست حیدرآباد کا ایک بڑا ادبی مرکز تھا۔ وہاں اردو کی طرح فارسی شاعری کی بھی گرم بازاری تھی۔ اورنگ آباد مزارات اور خانقاہوں کا شہر ہے۔ آستانوں پر مثنوی مولانا روم اور فارسی و اردو کے صوفیانہ کلام کو لحن و ترنم سے پڑھنے اور سننے والوں کی محفلیں ہفتہ میں ایک بار لازمی طور سے منعقد ہوتی تھیں اور دردؔ کاکوروی ان محفلوں میں برابر شریک ہو کر خود اپنا کلام بھی پیش کرتے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں اورنگ آباد میں نشرگاہ (ریڈیو اسٹیشن) کا قیام عمل میں آیا تو ہفتہ میں ایک بار مثنوی مولانا رومؔ کے کسی نہ کسی حصہ کو ترجمہ اور شرح کے ساتھ نشر کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ خدمت دردؔ کاکوروی نے انجام دی۔ اس طرح ایک فارسی شاعر اور فارسی شعر و ادب شناس کی حیثیت سے ان کی شہرت ملک بھر میں پھیل گئی۔ اورنگ آباد ہی میں دردؔ کاکوروی نواب نورالضیاء الدین ضیا یار جنگ سے قریب ہوئے جو اورنگ آباد کے ایک قدیم صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ایرانی اہل زبان بھی ضیاء یار جنگ کی شاعری کے معترف تھے۔ نواب صاحب کی صحبتوں میں

درؔد کی فارسی شاعری کافی پروان چڑھی اور ان کو عراق و ایران کے اہل زبان کی صحبت سے بڑا فائدہ ہوا۔ ایک ایرانی شاعر نے درؔد کاکوروی کے اس شعر کو بہت داد دی تھی ؎

بچشم سرمگیں کردم نگاہے
کشیدم ہے زانگور سیاہے

نواب ضیا یار جنگ نے درؔد کاکوروی کی فارسی شاعری کو سند توصیف سے نوازا تھا اور درؔد کو ایک فارسی قطعہ میں یوں خراج تحسین پیش کیا تھا ؎

درد را میر درؔد باید گفت
رنگ طبعش چو زرد باید گفت
از رہِ سوز و کہنہ مشقی ہا
در سخن پیر مرد باید گفت

اورنگ آباد چھوٹا تو فارسی شاعری سے اتنی قربت پھر ان کو حاصل نہیں ہوئی لیکن درؔد پھر فارسی میں کچھ نہ کچھ کہتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے وجدان کا سرچشمہ فارسی شاعری سے آخر وقت تک فیضیاب ہوتا رہا ؎

عکسِ جمال روئے تو پیمانہ را رنگیں کند
ویں جلوہ نور رخت میخانہ را رنگیں کند
چوں پرتو حسن رخت پیمانہ را رنگیں کند
پیمانۂ تو ساقیا، دیوانہ را رنگیں کند
ہردم تماشائے رخت دیوانہ را رنگیں کند
دیوانہ و شیدائے تو ویرانہ را رنگیں کند

حاجت نہ باشد دردرا از بادۂ گلرنگ نسب
ساقی دو چشم مست تو مستانہ را رنگیں کند

جس چیز نے ان کو رنگین کہا ہے وہ وہی شراب معرفت ہے جو فارسی کے میخانے سے انکے نصیب میں آئی۔ وہ اسی رنگ اور اسی کیفیت کے وفادار عاشق ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

دل نثار ساقی میخوار باد
جاں فدائے نرگس خمار باد
ہستی من مرکز انوار باد
مستی من جاذب اسرار باد
تا وجودم اندرون عالم است
مست جانم از مئے دلدار باد

وہ اسی کیفیت کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے ہیں اور خود اس کیفیت کے ہمیشہ سلامت رہنے کے خواہشمند ہیں ؎

ہست تا ساقی میانِ میکدہ
روح با مینا و ساغر یار باد
وصل باشد یا نباشد در نصیب
اندرونِ سینہ دردِ یار باد

ان کی فارسی شاعری میں ان کے وجودی مسلک کا پر تو بہت نمایاں ہے اور یہ ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ فارسی شاعری اور خصوصیت سے غزل میں وحدت الوجود کے مضامین بڑی والہانہ سرمستی کے ساتھ ہمیشہ بیان ہوئے ہیں۔ کائنات کی ہر حرکت میں صرف ایک وجود اور اس کے جلال و جمال کی کارفرمائی

کا یقین اور اس کا شاعرانہ اظہار فارسی غزل کی بنیادی اور بلند ترین روایت ہے۔ دردؔ کاکوروی نے اپنی ایک غزل میں اس ساری روایت کو اس آن بان سے پیش کیا ہے کہ بے ساختہ زبان سے کلمات تحسین نکل آتے ہیں ؎

بازبکوئے من گزر کرد کہ کرد یار کرد

باز بسوئے من نظر کرد کہ کرد یار کرد

محبوب حقیقی کی اس توجہ اور مہربانی کا اعتراف کرنے کے بعد دردؔ اس کے نتیجہ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں ؎

باز بہ تیغ غمزہ ہا کشت کہ کشت یار کشت

ظلم و ستم بریں جگر کرد کہ کرد یار کرد

باز بسوئے بسمل آں دید کہ دید یار دید

باز بہ خستگاں نظر کرد کہ کرد یار کرد

یہ اس عنایت الٰہی کا بیان ہے جو ایک صوفی کو عشق کی نعمت اس کا سوز و گداز اس کا اضطراب اور بے چینی عطا کرتی ہے۔ برق جمال کی تجلی چونکہ ہمہ وقت ہر شے میں دیکھتا ہے اور اپنے دل پر اس کا نزول اس کو نظر آتا ہے ؎

برق جمال بر دلم ریخت کہ ریخت یار ریخت

باز بہ عشق شور و شر کرد کہ کرد یار کرد

از مئے صاف ذوالمنن مست کہ بود یار بود

بیخود و مست و بے خبر کرد کہ کرد یار کرد

ساری کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دردؔ کو ایک ہی ذات وحدت کا کرشمہ نظر آتا ہے۔ وہ عشق اور اس کی شوریدہ سری کو جلوۂ حقیقت سے جدا نہیں سمجھتے وہ اس کو نشان جلال و جمال کا ایک حصہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے پاس مایوسی کا دور دور تک گذر نہیں۔ اس لیے وہ کہتے ہیں ؎

سوز و گداز درد دل داد کہ داد یار داد
باز زناز یک نظر کرد چہ کرد یار کرد

وہ شاعری کو اسرار حقائق کی ترجمانی کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور برملا ایک صوفی اور عارف کی حیثیت سے کائنات اور اس کی رنگارنگی پر نظر ڈالتے ہیں ؎

بہ بحر حقائق چو باقیستم من
بہ جز ماہیٔ بحر حق کیستم من
چو مستم من از بادۂ نور مطلق
باین مستی و بیخودی کیستم من
چو از خود چو برخود تجلی نمودی
بعشق تو در حیرتم چیستم من

اپنے مجموعۂ کلام 'میکدۂ معنی' کے حصۂ قند پارسی میں درد نے سب سے پہلے اپنے اس نظریہ اور فلسفہ کو بڑی خوش اسلوبی سے ان مسلسل فارسی اشعار میں بیان کر دیا ہے جن میں شاعرانہ اظہار بھی ہے اور وحدت الوجود کے مخصوص مسلک کی اصطلاحوں کا استعمال بھی کیا گیا ہے ؎

دل مست شراب لایزالی — جاں محو جمال ذوالجلالی
در میکدۂ شہود داند — یک جرعہ برند لاابالی
حق کرد ظہور با حقائق — در صورت پیکر خیالی
خورشید وجود ضو فگن شد — در شان جمالی و جلالی
ہائیم طلسم گنج دانش — داریم کمال لایزالی
خورشید صفت چرا نباشیم — داریم چو مہر ذات عالی

در آئینۂ وجود بنگر صد جلوۂ حسن بے مثالی
چوں دردؔ بتافت مہرِ حُسنش
شد روح من احسن الجمالی

چونکہ دردؔ کی فارسی شاعری میں ایک مشرب کی ترجمانی بھی ہے اور مسلک کی بھی۔ اس لیے کہیں یہ خالص شاعری نہیں رہ جاتی ہے اور اس میں فکر و فلسفہ کی آمیزش شعریت کا رنگ پھیکا کر دیتی ہے۔ مگر اس کے باوجود دردؔ کاکوروی نے اپنی شعری ترتیب اور سخن فہمی کے مذاق کی وجہ سے شاعری کو بالکل بے شاعری ہونے سے بچالیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس سرمستی و رنگینی کبھی مفقود نہیں ہوئی اور ان کا رویہ مجموعی حیثیت سے ایک شاعر کا رویہ رہتا ہے۔ فارسی کی ایسی غزلوں میں جہاں شعریت اور جمالیاتی ذوق ان کے اظہار پر غالب ہے وہاں وہ ایسے ممتاز فارسی غزل گو کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جو بیسویں صدی کی ہندوستانی ادبی دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے کیونکہ اب اردو کے استادانِ سخن بھی فارسی میں اظہارِ خیال نہیں کرتے ہیں۔ ان کی یہ غزل زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ایک شاہکار ہے ؎

جاں میکدۂ عشق است جانانِ خرا باتم
واللہ بسریر دل سلطان خرا باتم
در ذرّۂ ہر پستی باستی و ہستی
باصد طرب و مستی شایانِ خرا باتم
ہم ناظر و منظورم دل موسیٰ و من طورم
می رقصم و مخمورم، جانان خرا باتم

ہم اینم و ہم آنم حیرانم و شادانم
خوش پرتوِ جانانم، چوں جانِ خراباتم
ہم ناطق و خاموشم، باہوشم و بیہوشم
ہم نیشم و ہم نوشم مہمانِ خراباتم
خوش بختم و فیروزم، من شمع شبِ امروزم
من عشق جہاں سوزم قربانِ خراباتم
ایں خرقۂ ہستی را اے درد دریں عالم
چوں رہن بہ مے کردم عریانِ خراباتم

درد کا کوروی نے اردو کی طرح فارسی میں بھی مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے فارسی میں حمد، نعت، غزل، قطعہ رباعی بھی کہی ہیں۔ یہاں پر ان کے فارسی کلام سے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ جو فارسی شاعری میں درد کی قادر الکلامی کے غماز ہیں۔

نعت

محمدؐ بطورِ دلم جلوہ گر شد وزاں نورِ جان و تنم جلوہ گر شد
زہے نورِ حق بینم اندر حوادث وزاں نورِ جان و تنم جلوہ گر شد
زہے خاکسارم کہ منزل بہ منزل ہمہ نورِ نقش قدم جلوہ گر شد
زہے ایں وجودم شود پارہ پارہ تجلی بطورِ عدم جلوہ گر شد
ہو اللہ اے درد در شکلِ انساں
بشانِ وجود و عدم جلوہ گر شد

قطعات و رباعیات

ایکہ شد نامش علی حیدر شیر جری
ایکہ آمد تیغ دستش ذوالفقار حیدری
ذرۂ ناچیز را در اختراں ممتاز کن
ایکہ بر اوجِ ولایت بکہ مہر انوری

محمد سرمایۂ صبر و شکیبم | ندارم جز تو چیزے آں غریبم (کذا)
بیا درمانِ درد م یا محمدؐ | بشو از داروئے فیضت طلیبم

سرمست سرم بدور ساغر بادا
در وجد دلم ز جام احمرؐ بادا
ایں جامہ ہستیم بعالم اے درد
خاکِ درِ کوئے قلندر بادا

من تشنہ اگر جام نہ نوشم چہ کنم
ایں جام خوش انجام نہ نوشم چہ کنم
درماں شدہ درد چو مصرلب تو
یا جائے تو دل را نہ فروشم چہ کنم

غزلیں

از عکس جمال تو ہر ذرہ چو گنجینہ
ہر قطرہ شدہ دریا ہر قلب چو آئینہ

جاں قبلۂ سبحانی دل کعبۂ روحانی
زاہد چہ غرض ما را از مسجدِ سنگینہ
بشکن تفس خاکی بر عرش بکن منزل
شر سوقی صیانی دل صوفی پشمینہ
از شربت سبحانی دہ ساغر نورانی
از خواجہ چہ می پرسی از بندۂ دیرینہ
از جلوۂ صد خلوت اے دردؔ چہ می پرسی
روشن ز رُخِ انور ہم دیدہ و ہم سینہ

ہستئ خود را حجابے دیدہ ام
آفتابے در نقابے دیدہ ام
دیدہ از آتش ہر آبے دیدہ ام
سوختہ را دل کبابے دیدہ ام
پردہ انگندی باسماء وصفات
بر جمالت خوش نقابے دیدہ ام
نسخہ کاں را مصنف خود نوشت
ہستئ خود را کتابے دیدہ ام
مہر کردی جلوہ گر بے پردہ
یا کہ در شب آفتابے دیدہ ام
چوں فتادہ عکس رویت جابجا
ذرہ ذرہ ماہتابے دیدہ ام

دردؔ دل شد نغمہ زن از بیخودی
من کرا مست شرابے دیدہ ام

ہمہ را بہر تو دیوانہ دیدم	بشمع حسن تو پروانہ دیدم
بساغر جلوۂ جانانہ دیدم	رخ دلدار در پیمانہ دیدم
بدستش گردش پیمانہ دیدم	بجانش مستیٔ میخانہ دیدم
نہ من کعبہ نہ من بتخانہ دیدم	جمال اللہ بہ ہر کاشانہ دیدم
قدم زد ساقی کوثر برنداں	میان حلقۂ رندانہ دیدم
زخلوت یار من آمد بجلوت	چہ خوش مستی زن مستانہ دیدم

بحمد اللہ دردؔ دل بہ خلوت
ہم جانی وہم جانانہ دیدم

آموخت بما عشق تو آشفتہ سری ہا
دیں پردہ دری، نوحہ گری جامہ دری ہا
صاحب نظراں مات بافسوں نظری ہا
صاحب خبراں بے خبر از جلوہ گری ہا
دل می بُرد آں شوخ بافسوں نظری ہا
جاں می ستد از حسن بصد جلوہ گری ہا
بے پردہ کنی گر یہ سحر جلوہ گری ہا
دیوانۂ عشق تو کنی جامہ دری ہا
نظارۂ روئے تو برد تاب و تواں را
دیں نرگس مست تو دہد بے خبری ہا

افشائے سر از سرمد و منصور چہ پرسی
آوازۂ حسنِ تو کند پردہ دری ہا

گو دنف صد آلام کند عرصۂ کونین
غم نیست چو لطفش بکند چارہ گری ہا

اے چارہ گرِ عشق بدرماں نہ دہد درد
دردی کہ فروشند زجادو نظری ہا

من خوں خورم در کنج غم تو مے کشی جائے دگر
در بست تنہا من سر زنم تو خلوت آرائے دگر

اے جان من جانان من از جلوۂ حسن رخت
جاں در تماشائے من و من در تماشائے دگر

تنہا نہ من سر می زنم اے یار اندر عشق تو
لیلا بہ سودائے دگر مجنوں بہ صحرائے دگر

اے بادشاہِ دلبری دارم بعشقت اے پری
ہر صبح غوغائے دگر ہر شام سودائے دگر

اے درد دل برداشتم از آرزوئے جام جم
دل محو شہلائے دگر جاں مست صہبائے دگر

باب ششم

دردؔ کاکوروی بحیثیت نثر نگار

(الف) دردؔ کے تحقیقی، اور تنقیدی مضامین

(ب) سوانحی اور تاریخی مضامین کا مطالعہ

(ج) مذہبی اور صوفیانہ موضوعات

دنیا کی ہر زبان کے نگار خانے میں ہم کو تین طرح کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جو صرف شاعری کرتے ہیں دوسرے جنہوں نے نثر نگاری کو اپنا شعار بنایا اور تیسرے وہ جو شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی بہترین صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

درد کاکوروی کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے شاعری بھی کی اور نثر کے میدان میں بھی اپنے اشہب قلم کو جولاں کیا۔ یہاں یہ بھی عرض کر دینا بعید از موضوع نہ ہوگا کہ ایسے لوگوں کی تعداد خال خال ہے جن کو نظم اور نثر دونوں میں کامل دستگاہ حاصل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے درد کی ایوان ادب اردو میں اہمیت وافادیت اور نمایاں ہو جاتی ہے۔

درد کاکوروی نے اپنے عہد شباب میں شاعری کے ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی خاص توجہ کی اور مختلف تاریخی، ادبی اور مذہبی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ان کی نثر میں سادگی اور سلاست کے ساتھ علمی سنجیدگی ہے اور اسی لیے ان کے ادبی اور تاریخی مضامین میں ان کی فکر پوری طرح ظاہر ہوئی ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہوگی کہ اس وقت اردو نثر میں درد نے زبان پر جس قدرت کا ثبوت دیا ہے وہ انشا پردازی نہیں ہے بلکہ فکر و خیال کی

ترسیل کا کامیاب نمونہ ہے۔ نثر میں درد کئی حیثیتوں سے نمودار ہوتے ہیں۔ وہ بیک وقت مصنّف بھی ہیں اور مؤلف بھی، محقق بھی ہیں اور ناقد بھی، مرتب بھی ہیں اور مؤرخ بھی۔ انھوں نے اپنی نثر میں مختلف النوع مضامین یادگار چھوڑے ہیں۔ درد صاحب جس پایہ کے شاعر ہیں اسی پایہ کے نثر نگار بھی ہیں۔ اردو نثر میں ان کے دو مضامین ایسے ہیں جنھوں نے بحیثیت نثر نگار ان کو شہرت کی بلندیوں پر پہونچا دیا۔ ایک مضمون تو وہ ہے جس میں انھوں نے مخدوم اشرف جہانگیر سمنانیؒ کے رسالۂ معرفت کو اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیا ہے اگرچہ یہ بات ابھی تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچ سکی ہے پھر بھی اس کتاب کے وجود سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ درد کاکوروی نے خود ۲۰۷ صفحات پر مشتمل اس قلمی کتاب کو دیکھا تھا اور اس کے چند جملے بھی بطور نمونہ پیش کیے تھے ان کا یہ مضمون نگار دسمبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا اور پروفیسر حامد حسن قادری نے اپنی کتاب "داستان تاریخ اردو" میں اس رسالہ کو پہلی کتاب تسلیم کرتے ہوئے لکھا:

"میر نذر علی درد کاکوروی رسالہ نگار بابت دسمبر ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں کہ :-

"سید اشرف جہانگیر سمنانی نے اپنے سلسلہ کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں (جس کو اس زمانہ میں زبان ہندی کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے۔ میں نے اپنے بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ صفحہ کی ہے اس کے صفحہ ۱۱۸ کی عبارت کا ایک ٹکڑا یہ ہے:-

"اے طالب آسمان و زمین سب خدا میں ہے۔ ہوا سب خدا میں ہے۔ جو تحقیق جان اگر تجھ میں سمجھ کا کچھ ذرہ ہے تو صفات کے

باہر بھینز سب ذات ہی ذات ۔" لہ

درد کا کوروی کی یہ تحقیق حامد حسن کے حوالہ سے اتنی مشہور ہوئی کہ ادبی حلقوں میں انھیں کے نام سے منسوب ہو گئی ۔ حالانکہ قادری صاحب نے اس سلسلہ میں درد کاکوروی کی تحقیق کا ہی حوالہ دیا تھا ۔ مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر نسیم قریشی نے بھی یہی غلطی کی ہے کہ حامد حسن قادری کی کتاب دیکھے بغیر ہی انھوں نے اپنی کتاب " اردو ادب کی تاریخ " کے صـ۱۲۹ پر لکھ دیا کہ

" پروفیسر حامد حسن قادری کی تلاش و تحقیق نے ایک اردو رسالہ کا پتہ لگایا ہے جو دہ مجلس سے سوا چار سو برس پہلے ۱۳۰۰ء میں تصنیف ہوا اس کے مصنف خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی ہیں ۔ " ٢ہ

اب علمی حلقوں میں یہ بات تسلیم کی جانے لگی ہے کہ یہ دریافت درد کاکوروی کی مرہون منت تھی ۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری ایڈیٹر ماہنامہ نگار کراچی (پاکستان) نے لکھا ہے کہ

" شعبۂ تحقیق میں بھی اہل کاکوری کے بعض اضافے بہت اہم ہیں ۔ میر نذر علی درد کاکوروی نے نگار دسمبر ۱۹۲۵ء کے شمارہ میں حضرت امیر خسرو کے ایک معاصر اشرف جہانگیر سمنانی کے " رسالۂ معرفت " کا سراغ دے کر اہل نظر کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ اردو نثر کی پہلی تصنیف یہی رسالہ ہے اور اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اردو میں نظم و نثر کے آغاز کا زمانہ ایک ہی قرار پاتا ہے اور اردو نثر کی تاریخ

لہ داستان تاریخ اردو صـ۲۴ از حامد حسن قادری ۔

٢ہ اردو ادب کی تاریخ صـ۱۲۹ از ڈاکٹر نسیم قریشی ۔

بھی کوئی سات سو سال پرانی ہو جاتی ہے۔" [1]

ان کے تحقیقی کارناموں میں دسویں صدی ہجری کے ایرانی شاعر زُلالی خوانساری کی مثنویوں کو روشناس کرانا بھی شامل ہے۔ زُلالی خوانساری کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہ باکمال مثنوی نگار تھے۔ درد نے ان کی مثنویوں کو پہلی بار ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس سلسلہ میں مؤلف سخنوران کاکوری حکیم نثار احمد علوی رقم طراز ہیں:-

"غالب آگرہ کا ۴۶ سالہ پرانا ماہنامہ تھا جس کے مدیر اعزازی مقبول حسین قاتل اکبر آبادی اور منشی شمس الدین اکبرآبادی تھے۔ یہ چھتہ راجہ کاشی آگرہ سے شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ مارچ ۱۹۲۹ء میں نکلنا شروع ہوا۔ یہ اب تک نہ معلوم ہو سکا کہ بند کب ہوا۔ غالب لائبریری (کراچی) میں جلد (۱) نمبر (۲) بابت ماہ اپریل ۱۹۲۹ء محفوظ ہے۔ اس میں علامہ درد کاکوروی نے "زلالی خوانساری" پر مضمون لکھا ہے۔ فرماتے ہیں" زلالی تقریباً ۹۷۱ھ میں پیدا ہوئے یہ خوانسار کے رہنے والے تھے۔ ان کا کلام اختراع نازک اشارات سے مملو ہے۔ شراب نوشی کی تصویر خوب کھینچتے ہیں۔ ان کی مثنویوں میں "محمود و ایاز" سب سے عمدہ مثنوی ہے جو ۱۰۰۱ھ میں شروع اور ۱۰۲۴ھ میں ختم ہوئی ——— محمد افضل امام [2] بن محمد از سند خیر آبادی نے اس کو ۱۱۹۸ھ [3] میں نقل کیا اور ۱۱۹۲ھ میں یہ قلمی مثنوی اور مثنویوں کے

---

[1] سخنوران کاکوری۔ پیش لفظ از فرمان فتحپوری ص ۱۳ [2] یہ نام فضل امام ہے۔

[3] یہ سن غالباً ۱۲۹۳ء ہوگا؟ یا پھر نقل کا سن ۱۱۹۳ء اور ہاتھ آنے کا سن ۱۱۹۸ ہوگا۔ (مؤلف سخنوران کاکوری)

ساتھ ہمارے والد حکیم حبیب علی علوی کے ہاتھ آئی ۔"

منقول از رسالہ کراچی (جنوری مارچ ۱۹۷۵) [۱]

درد کاکوری کی تلاش و تحقیق نے شمالی ہند میں اردو کے وجود میں آنے اور اس کے ابتدائی ارتقاء کے کئی اہم گوشے اجاگر کیے ہیں ۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اردو کی ابتدائی شکل گجرات دکن یا دہلی کے گرد و نواح میں نمودار ہوئی ۔ درد کاکوروی نے اپنی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کو بروئے کار لاتے ہوئے شمالی ہند میں ریختہ، ہندوی یا اردو کے ابتدائی نمونے تلاش کر کے اپنی کتاب 'اردو اور شمالی ہند' میں شامل کر دئے ہیں ۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں صوفیائے کرام کے کلام و ملفوظات اور اوراد و وظائف کے حوالوں سے بھی زبان کے وجود اور ارتقاء پر نگاہ ڈالی گئی ہے اور اودھی، برج بھاشا کے باکمال شاعروں کے کلام میں اس ملی جلی زبان کے نایاب نمونے تلاش کر کے پیش کیے گئے ہیں جو آخر کار اردو کہلائی ۔ درد کاکوروی نے "اردو اور شمالی ہند" کا سبب تالیف اپنے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"حکیم عبدالحئی مؤلف کتاب تذکرہ "گل رعنا" نے اس امر پر زور دیا ہے (یا یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے) کہ دکن سے اردو کی ابتدا ہوئی جس کیلئے عادل شاہ، قطب شاہ، ولی دکنی وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے حالانکہ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہم نے یہ کتاب ترتیب دی ہے ۔" [۲]

اردو اور شمالی ہند ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۶۷ء میں درد نے اس کتاب کو اپنے مکتبہ کتاب گھر عزیز آباد کراچی سے شائع کیا ۔ اس پر مقدمہ صوفی عبدالغنی پرنسپل اردو کالج کراچی نے تحریر کیا ہے ۔ تبصرہ سیف الدین صاحب

---

[۱] سخنوران کاکوری ص۳۸۲ ۔ [۲] اردو اور شمالی ہند ص۱۸

لکچرار سندھ کالج کراچی نے نہایت بسیط اور مدلل لکھ کر کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ اس کے بعد تعارف جسے شمس وارثی نے لکھا ہے۔ درد کاکوروی کی شخصیت شاعری اور نثر نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے شمس وارثی رقمطراز ہیں:

"جناب درد صاحب کی شخصیت اگر ایک طرف بلند پایہ ادیب، محقق، نقاد کی طرح ابھرتی ہے تو دوسری جانب وہ ایک صاحب کمال اور صاحب فن شاعر کی حیثیت سے اپنی شاعرانہ رعنائیوں کی پوری آب و تاب سے منصۂ شہود پر نظر آتے ہیں وہ عربی و فارسی، اردو تینوں زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں۔

درد صاحب نہ سستی شہرت کے دلدادہ ہیں اور نہ ان میں پیشہ ورانہ ذہنیت کار فرما ہے۔ وہ بے حد خوددار، وضع دار، غیور، قانع اور صوفی منش انسان ہیں اور یہی صفات ان کی تحریروں کا مزاج ہیں۔ وہ نہ مشاعروں کی اکھاڑہ بازی کے قائل اور نہ واہ واہ والے شاعر ہیں اور نہ وہ محفلوں میں ہنگامہ برپا کرنے والے نثر نگار ہیں وہ جو کچھ لکھتے اور کہتے ہیں وہ محض ذاتی ذوق اور فطری رجحان طبع کا نتیجہ ہوتا ہے۔"[1]

'اردو اور شمالی ہند' پر تبصرہ کرتے ہوئے شمس وارثی لکھتے ہیں:۔

" اردو اور شمالی ہند' یقیناً چونکا دینے والی تالیف ہے اور یہ سوچنے سمجھنے والے اذہان کو نئی دعوت فکر کا سامان بہم پہونچاتی ہے۔ یہ اردو زبان کی ابتداء کے باب میں ایک نیا اور بالکل نیا موضوع ہی نہیں بلکہ دریافت بھی ہے جسے اس سلسلہ میں ناقابل فراموش اضافہ کہا جاسکتا ہے۔"[2]

---

[1] اردو اور شمالی ہند۔ ص ۱۳-۱۲۔

[2] " " ص ۱۳۔

اس مختصر سی کتاب کی تیاری اور اس کی تالیف کے سلسلہ میں مؤلف نے بڑی کد و کاوش سے کام لیا ہے اور ہر دعویٰ کو مدلل طریقے سے پیش کرتے ہوئے تذکرہ "گل رعنا" "تاریخ مدارس اورنگ آباد" "تاریخ ہند حصہ اول" "آثار الصنادید"، "اردو کا نشو و نما" "شجرۂ آصفیہ"، "نکات الشعراء"، "نفحات العنبریہ" "خم خانۂ جاوید" "خندۂ گل" "پنجاب میں اردو" اور نہ جانے کتنی کتابوں اور تذکروں سے حوالے پیش کیے ہیں۔ اردو کی تاریخ و ابتداء پر روشنی ڈالتے ہوئے مؤلف نے اس دور کے شاعر و ادیب اور صوفیاء کے ملفوظات و کلام مع سن تحریر کیا ہے۔ درد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ دکن سے تقریباً تین صدی پیشتر ہی اردو شمالی ہندوستان میں کسی نہ کسی روپ میں جنم لے چکی تھی۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> "سب سے پہلے شمالی ہند میں اردو کی ابتدا ہوئی۔ میری مراد ان علاقوں سے ہے جہاں مسلم فاتحین پہلے داخل ہوئے۔ دکن میں محمد تغلق کے وقت سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تھی۔ اگر دکن میں حکومت بہمنی کے آغاز سے عربی الفاظ کا اختلاط مقامی زبانوں کے ساتھ مان لیا جائے تو بھی شمالی ہند کی تقدیم ہر طرح ثابت ہے۔ دکن سے تقریباً تین سو سال پہلے شمالی ہند میں اردو کی بنیاد پڑ چکی تھی۔" [۱]

"اردو اور شمالی ہند" میں درد کاکوروی نے بہت سی غیر معروف کتابوں، ملفوظات اور صوفیائے کرام کے تذکروں سے استفادہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ صدیوں کے اعتبار سے پانچویں صدی ہجری میں سید سالار مسعود غازیؒ اور چھٹی صدی میں مسعود سعد سلمان لاہوری، شیخ فرید الدین گنج شکر، ساتویں صدی ہجری میں امیر خسرو، بہاؤ الدین انصاری، آٹھویں صدی ہجری میں شاہ نور قطب عالم، نویں صدی ہجری

---

[۱] اردو اور شمالی ہند ص ۲ از درد کاکوروی۔

ہیں کبیر داس' دسویں صدی ہجری ہیں ملک محمد جائسی، گرونانک مہاراج اور رام چرت مانس کے مصنف تلسی داس کے کلام میں اردو کے کتنے ابتدائی نقوش واضح طور پر ملتے ہیں۔

درد کاکوروی نے اس سلسلہ میں شیخ کمال الدین سعدی کاکوری کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے جنہوں نے دورِ اکبری میں انتقال کیا۔ وہ اپنے عہد کے ایک ممتاز صاحب درس عالم، چشتی مسلک کے مینائی سلسلہ کے بڑے شیخ تھے۔ قدیم تذکروں اور تاریخوں میں ان کی شاعری کے بارے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "طبع موزوں داشتے وبزبان فارسی وہندی شعر نکو گفتے"۔ ریختہ یعنی فارسی اور کھڑی بولی کی زبان میں ان کی غزل عام طور سے ادبی تذکروں میں ملتی ہے جس کا مطلع اور مقطع حسب ذیل ہے ؎

قشقہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کیا دیت ہے
گفتہ کہ دُر اے باورے اس ملک کی یہ ریت ہے
سعدیؔ بگفتہ ریختہ، در ریختہ دُر ریختہ
شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

بعض تذکرہ نگاروں نے غلطی سے مذکورہ غزل کو سعدیؔ شیرازی یا سعدی دکنی سے منسوب کیا ہے لیکن دردؔ کاکوروی نے اردو کے سب سے بڑے محقق علامہ محمود شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اردو' اور حکیم شمس اللہ قادری کی کتاب 'اردوئے قدیم' کے حوالوں سے اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا کہ یہ شیخ سعدیؔ کاکوروی کی غزل ہے۔ انہوں نے اپنے مرحوم والد کے حوالے سے بھی لکھا ہے کہ کاکوری میں بزرگوں کی زبان پر تذکرہ رہتا تھا کہ مخدوم نظام الدین بھکاری اور شیخ سعدیؔ کاکوروی جو معصر تھے آپس میں اسی ریختہ میں گفت گو کرتے تھے۔ دردؔ کاکوروی کی 'اردو در شمالی ہند' ایک بہت اہم تحقیقی کتاب ہے، اور یہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی کتاب

اردو کی ترقی اور صوفیائے کرام کا حصہ سے کم اہمیت نہیں رکھتی۔ درد کی یہ کاوش بلاشبہ ستائش کے لائق ہے۔ اس سے اردو زبان پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مفید معلومات فراہم ہو سکیں گی۔ یعنی ایسی اہم باتیں اس میں درج ہیں جو عموماً دوسری کتابوں میں نظر نہیں آتیں۔

مثال کے طور پر اردو کے وہ قدیم نمونے جن کا تعلق شمالی ہند سے ہے اور خالق باری سے متعلق محمود شیرانی کا جواب وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مؤلف کی ذاتی رائے نہیں ہے اور نہ اس کے دماغ کی اختراع ہے بلکہ ان ٹھوس حقائق کا اظہار و اعلان ہے جو ابھی تک عدم توجہ کا شکار تھے۔ کتاب کے عنوان کے باب میں اس کو روشن دلائل کی زندہ تصویر کہنا غلط نہ ہوگا۔ یہ اردو کے تاریخی ادب میں ایک زبردست حیثیت رکھتی ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

ان کے تمام تحقیقی اور تنقیدی مضامین میں یہ خصوصیت نظر آتی ہے کہ انہوں نے روش عام سے ہٹ کر نئے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی نثر نگاری تحریر برائے تحریر نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی نئے خیال کا اظہار ہے۔

درد کاکوروی نے اپنے مضمون "امیر خسرو ایک اردو شاعر کی حیثیت سے" میں اس بات پر زور دیا ہے کہ امیر خسرو کو اردو کی بنیاد ڈالنے والوں میں پہلی جگہ ملنی چاہیے اس سلسلہ میں ان کی سب سے بڑی دلیل وہ ہے جس کو عام طور پر اردو کے نقاد نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ درد نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ:

"میر تقی میرؔ نے اپنے تذکرہ میں حضرت امیر خسروؔ کی بابت لکھا ہے کہ "اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد و دریں خود متردد نیست" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کے زمانے تک خسروؔ کا اردو کلام بہت کچھ موجود تھا صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے تذکرہ میں اردو شاعروں

کی صف میں سب سے پہلے جگہ دی ہے۔" [1]

ان کا کہنا یہ ہے کہ اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز امیر خسرو سے ہوا ہے۔ اب رہی زبان کی صفائی تو وہ رفتہ رفتہ پیدا ہوئی اور اس میں کافی وقت لگا۔ درد نے اسی مضمون میں سید اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالہ "معرفت" کو اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیا ہے۔ جس کا حوالہ حامد حسن قادری نے اپنی کتاب "داستان تاریخ اردو" میں دیا ہے۔

درد کاکوروی نے فارسی شعر و ادب سے اپنی گہری وابستگی اور واقفیت کی وجہ سے فارسی شعرا، امیر حسن دہلوی اور خواجہ حافظ شیرازی کی شخصیت اور شاعری پر اپنے مضمونوں میں روشنی ڈالی ہے۔ جو فارسی ادب سے ان کے غیر معمولی شغف کے غماز ہیں۔ حافظ کی شاعری کے عارفانہ پہلوؤں پر انہوں نے زیادہ زور دیا ہے اور تفصیلی حالاتِ زندگی بھی قلم بند کیے ہیں۔ آخر میں حافظ اور غالب کے ہم مضمون اشعار کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر دونوں کا ایک ایک شعر پیش ہے ؎

حافظ:- جام جہاں نماست ضمیر منیر دوست
اظہار احتیاج خود آنجا چہ حاجت ست

غالب:- جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے [2]

امیر حسن دہلوی امیر خسرو کے ہمعصر اور ان کے دوست تھے اور خسرو ہی کی طرح

---

[1] امیر خسرو اردو شاعر کی حیثیت سے از درد نگار دسمبر ۱۹۲۵ء ص ۱۹

[2] حضرت خواجہ حافظ شیرازی از درد کاکوروی۔ شمولہ اسلامی خلافت جنتری ۱۳۴۲ھ ص ۴۵۔

خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے خاص عقیدت مند تھے ۔ دونوں کی دوستی اور محبت ضرب المثل تھی ۔ درد کاکوروی نے اپنے مضمون " امیر حسن دہلوی " میں ان کے کلام پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :-

" اصل یہ ہے کہ سوز و گداز، عاجزی، درد، عجز و نیاز یہ چیزیں غزل کی جان ہیں اور حسن دہلوی کے یہاں زیادہ نمایاں ہیں " [1]

حسن دہلوی کی شاعری کے جوہر نمایاں کرنے کے لیے انھوں نے بعض اشعار کا انتخاب کرکے ان کی تشریح کی ہے ان کے مذکورہ مضمون سے بطور نمونہ چند سطور پیش ہیں :

" بعض وقت انسان اپنے خاص احباب سے اپنے عاشقانہ زندگی کے واقعات بیان کرتا اور غمگساری، چارہ گری کا خواہاں ہوتا ہے حسن اس کی اس طرح تصویر کھینچتے ہیں ؎

دوستاں در سرم امروز ہوائے دگرست
گل اُمید مرا بوئے وفائے دگرست

پھر اپنے دل سے متوجہ ہو کر کہتے ہیں کہ :

" اے دل تو بہت تنگ ہے کہ مرنے سے ڈرتا ہے حالانکہ یہ مرنا عین زندگی ہے ؎

اے دل تنگ تو از درون جاں می ترسی
مردن اندر نظر دوست بقائے دگرست

میں تھا، حریف تھا۔ ایک کونہ اور نغمہ مگر غم اور بلا کو نہ معلوم کس نے جبر کردی ۔ اس مضمون کو کس قدر دلکش پیرایہ میں ادا کیا ہے ۔ سنیے ؎

---

[1] امیر حسن دہلوی ۔ از درد ص ۲۹ عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۱ء

من بودم و کنجے و حریفے و سرودے
غم راکہ نشاں داد و بلا راکہ خبر کرد

بعض اوقات احباب آتے ہیں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی ہیں، ہمدرد حال پوچھتے ہیں، عاشق کہتا ہے کہ میں تم کو دل کا حال کیا بتاؤں اب محبت اس نوبت پر ہے کہ دل صبر سے زیادہ اور صبر دل سے زیادہ آوارہ ہوگیا ہے۔

حال صبر و دل چہ می پرسی چہ شد
صبر از دل، دل ز صبر آوارہ تر۔" [1]

درد کاکوروی نے اپنے مضمون "مثنوی" میں لکھا ہے کہ اصناف سخن میں مثنوی ہی ایک ایسی صنف ہے جس کے ذریعہ انسان جذبات کی پوری ترجمانی کرسکتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مثنوی کا میدان بہت وسیع ہے۔ اس میں اشعار کی قید ہے نہ قافیے کی پابندی۔ پھر لطف یہ کہ مثنوی مختلف بحروں میں لکھی جاسکتی ہے۔ تصوف، عشق و محبت، فلسفہ، مناظر قدرت، چاہے جس موضوع کو نظم کیجئے اس کی تصویر ہو بہو سامنے آجاتی ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے فارسی مثنوی نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ اور اس مضمون کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پھر مثنوی نگاری میں نعت گوئی، عاشقانہ شاعری، ہجر و وصال اور درد و غم یا تغزل کے رنگ کو مثنویوں کے اشعار سے مثالیں دے کر واضح کیا ہے۔ مولانا جامی کے ایک نعتیہ شعر کو نعت کا بہترین شعر قرار دے کر لکھا ہے ؎

اے خاک در تو کحل بینش
روشن بہ تو چشم آفرینش

---

[1] امیر حسن دہلوی از درد عالمگیر خاص نمبر سنہ ۱۹۳۱ء، ص ۲۰-۲۹۔

آپ کے در کی خاک بینائی کا سرمہ ہے اور نہ صرف یہ کہ آفرینش کی آنکھ بھی تجھی سے روشن ہے تو کوئی خوبی نہ ہوتی۔ لفظ چشم کے ساتھ آفرینش کا لفظ لگاکر شاعر نے مصرع میں جان ڈال دی۔ اس طرح مصرع کا مضمون نہایت بلند ہوگیا۔

اے روئے تو کعبۂ صفائم
ابروئے تو قبلۂ دو عالم

آپ کا چہرہ میری صفتوں کا قبلہ اور آپ کی ابرو دو عالم کا قبلہ ہے۔[1]

درد کاکوروی نے بزرگوں کی صحبتیں بھی بہت اٹھائی تھیں۔ چنانچہ "حضرت شوق قدوائی" کے عنوان سے ان کا ایک مضمون شوق قدوائی کی ۱۹۲۵ء میں وفات کے چھ برس بعد عالمگیر میں شائع ہوا تو اس میں انہوں نے لکھا کہ۔

"اسیر کے شاگرد تھے۔ ان کے کلام میں بے ساختہ پن بہت پایا جاتا ہے۔ جس زمانے میں شوق صاحب ریاست رام پور کے سرکاری کتب خانہ میں ملازم تھے۔ میں بھی وہیں مقیم تھا۔ اکثر ان سے نیاز حاصل ہوتا۔ اپنا کلام سناکر محظوظ فرماتے۔ میں بعض شعر نوٹ کر لیا کرتا تھا۔ وہی اشعار آج ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ان میں محاورات کا استعمال، زبان کا چٹخارہ اور سادگی خاص طور پر پائی جاتی ہے۔"[2]

اس تمہید کے بعد درد نے شوق قدوائی کے کلام سے متعدد اشعار بطور نمونہ درج کیے ہیں۔ یہ مضمون بہت مختصر ہے صرف دو صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن شوق قدوائی کی شاعری کی خصوصیات پوری طرح نمایاں کرتا ہے۔ شاعری

---

[1] مثنوی از درد کاکوروی۔ عالمگیر ص ۲۴ سالنامہ نمبر ۱۹۲۸ء

[2] حضرت شوق قدوائی از درد ماہنامہ عالمگیر [illegible]

اور خاص طور پر اردو شاعری کے بارے میں درد کاکوروی کے نظریات کا احاطہ ان کا مضمون " ہم اور ہماری شاعری " کافی حد تک کرتا ہے جس میں انہوں نے قدیم وجدید کے امتزاج پر زور دیا ہے۔ انھوں نے نہ تو قدیم طرز کی شاعری اور غزل گوئی کو ہر ایک خامی سے مبرا سمجھا ہے اور نہ مغربی تہذیب اور اس کے اثر سے مغربی شاعری کو بہ تمام وکمال قبول کرنے کی حمایت کی ہے۔ ان کا یہ مضمون اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ ۱۹۳۱ء میں لکھا گیا تھا جب اردو ادب واقعی ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ ایک طرف مغربی اثرات نے اس نئی شاعری کو رائج کر دیا تھا جو اردو میں ایک نئی آواز تھی۔ دوسری طرف غزل اور اردو شاعری کی روایتوں کی پاسداری کرنے والے بھی موجود تھے اور تیز رفتار تبدیلیوں کی مزاحمت کر رہے تھے۔ درد کاکوروی نے بڑا متوازن رویہ اختیار کرتے ہوئے لکھا تھا:

"یورپ پہ کیا موقوف کسی زبان کا ادب ہو اس سے اچھی اچھی باتیں چن لیجئے نہ یہ کہ بالکل اسکل بچوّ مقلد بن جائیے۔" [1]

ان کا نظریہ یہ ہے کہ بہرحال شاعری میں نیا اضافہ ہونا چاہیے اور صرف پرانے شعری ذخیرے پر قناعت نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں کہ:

" وہ باکمال شعرا جو دہلی اور لکھنؤ کے مقبروں میں آرام کر رہے ہیں انھوں نے اپنے زمانے میں اس زبان کے مذاق کے مطابق جو کچھ کہا بہت اچھا کہا اور اتنا ذخیرہ فراہم چھوڑ دیا کہ اب اس رنگ میں اضافے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔" [2]

انھوں نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کی ابتداء میں یہ متوازن بات کہی تھی کہ:

[1،2] ہم اور ہماری شاعری ص۵ کاکوری اخبار ۱۵ ر جولائی ۱۹۳۱ء۔

"موجودہ جدید تحریک بہت زوروں پر ہے اور یہ کسی طرح رکنے کی نہیں اس کے علاوہ عربی کی ایک مثل ہے "دُر مع الدھر کیف داء ، یعنی زمانہ جس رخ پھرے اسی رخ پھر جاؤ۔ زمانہ بدل گیا، زمانہ کا مذاق بدل گیا اس لیے ہم کو بھی جدید رنگ سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ہم کو غزلوں کے ساتھ نیچرل نظمیں بھی لکھنا چاہیے۔ جہاں تک ہو نئی تلاش نئی بندش، نئے مناظر، نئے خیالات نظم کریں تاکہ ہم بھی میدان ترقی میں اور لوگوں سے پیچھے نہ رہیں۔ مگر اس کا خیال رہے کہ جو کچھ کہیں اس میں واقعیت ہو نرا مبالغہ ہی نہ ہو بلکہ اس میں سچے جذبات ہوں۔ نظموں کی طرف توجہ دلانے کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ غزل کہنا موقوف کردی جائے۔ نہیں غزل ضرور کہی جائے لیکن بے معنی فارسی جملوں کی موزوں ترکیب کا نام غزل نہ ہو۔ روزمرہ کی پابندی کی جائے۔ اگر فارسی ترکیب سے کام لیا جائے تو الفاظ و ترکیبیں غیر مانوس نہ ہوں۔ غزل کو ہوا و ہوس اور صرف عاشقانہ مضامین کے لیے محدود نہ کر دیا جائے بلکہ اس کو ہر قسم کے مہذب اور دلچسپ مضامین سے زینت دی جائے۔ جن مضامین کو متقدمین باندھ چکے ہیں اگر وہ باندھے جائیں تو کم از کم ان کا انداز بیان جدید ہو، تشبیہوں، استعاروں سے کام لیا جائے مگر نہ اس قدر کہ شعر چیستاں بن جائے۔"[۱]

اس طرح نہ صرف درد کاکوروی کا نظریہ شاعری اور خود ان کا شعری رویہ پوری طرح سامنے آجاتا ہے بلکہ اردو کی ادبی تاریخ کا یہ اہم نکتہ بھی ہماری سمجھ

---

[۱] ہم اور ہماری شاعری ص۔ کاکوری اخبار۔ شمارہ جولائی ۱۹۳۱ء

میں آجاتا ہے کہ بیسویں صدی کے وسط سے پہلے ہی اردو میں قدیم شاعری کو بالکل مسترد کر دینے یا مغربی اثرات کو سرتاسر قبول کرنے کی دونوں انتہا پسندیوں کے درمیان آمیزش اور امتزاج کا ایک نیا شعور ابھر رہا تھا۔ درد کاکوروی نے اسی کی ترجمانی کی ہے۔ اور اس وقت ہمارے شعروادب اور تنقید سب میں توازن اور اعتدال کا بول بالا ہے۔

درد کاکوروی نے تحقیقی اور تنقیدی مضامین اگرچہ کثیر تعداد میں نہیں لکھے ہیں اور نہ ہی وہ خالص تنقیدی اور تحقیقی مزاج کے آدمی تھے پھر بھی انھوں نے جو مضامین یادگار چھوڑے ہیں ان میں ایک گہرا تحقیقی شعور اور تنقیدی بصیرت کارفرما نظر آتی ہے جو ہر قسم کی انتہا پسندی سے پاک اور ان کی اعتدال پسند رویہ کی آئینہ دار ہے۔

••

(ب) سوانحی اور تاریخی مضامین

درد کاکوروی کی نثر نگاری کو سہولت کے پیش نظر تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین پر اظہار خیال کیا گیا۔ اس حصہ میں ان کے سوانحی اور تاریخی مضامین کو زیر بحث لایا جائے گا۔ آخری حصہ میں ان کے مذہبی اور صوفیانہ موضوعات پر لکھے گئے مضامین وکتابوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

تاریخ نگاری اور سوانح نگاری کے سلسلہ میں درد کاکوروی نے جو راہ اختیار کی ہے وہ غور وفکر اور تحقیق سے کام لینے کی راہ ہے۔ اپنے مضمون "فن تاریخ نویسی" چند نکتے" میں انھوں نے اپنے اس نظریہ کو واضح کیا ہے کہ کسی تاریخی واقعہ کے چھان بین میں تمام تاریخی مصادر کا استعمال کرنے کے بعد ہی واقعہ کی اصل نوعیت سامنے آتی ہے۔ انھوں نے مثال کے طور پر چودھویں صدی عیسوی میں سلطان غیاث الدین تغلق اور اس کے بیٹے محمد جونا کے درمیان ٹکراؤ کے واقعہ کو پیش کیا ہے۔ جونا خاں بعد میں سلطان محمد بن تغلق کے نام سے تاریخ کے صفحات پر ایک اہم اور عجیب وغریب کردار بن کر ابھرا تھا۔ ۱۳۲۱ء میں سلطان غیاث الدین تغلق نے اس کو تلنگانہ (دکن) فتح کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ تلنگانہ کی راجدھانی 'وارنگل' کا محاصرہ کرنے کے بعد اس لشکر میں بغاوت پھیل گئی۔ بعد میں جونا خاں کو غیاث الدین تغلق نے معاف کر دیا لیکن بغاوت کی سازش کے الزام میں ملک رمل افغانی، عبید شاعر اور شیر زاد دمشقی سمیت کئی ممتاز افراد کو دہلی میں عبرت ناک سزائیں دے دی گئیں۔

اپنے مذکورہ مضمون میں درد نے ضیاء الدین برنی، ابوالقاسم فرشتہ اور عبدالقادر بدایونی کی تاریخوں کے حوالے سے اس نکتہ پر زور دیا ہے کہ ان سب کے بیانات میں اختلاف ہے۔ یہ بغاوت کی ذمہ داری جوناخاں پر ڈالنے سے احتراز کرتے ہیں لیکن۔ یہ نہیں بتاتے کہ خود جوناخاں کا طرزِ عمل کیا تھا۔ درد کاکوروی نے لکھا ہے کہ برنی تو درباری مؤرخ تھا اس نے جوناخاں یعنی سلطان محمد بن تغلق کو اس لیے پارسا دکھایا ہے کہ برنی سلطان دربار سے وابستہ تھے۔ محمد قاسم کی تاریخ فرشتہ اور عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ میں اس واقعہ کی چھان بین کے بغیر صرف برنی کی روایت درج کر دی گئی ہے۔ لیکن ایک اہم اور بے لاگ مؤرخ اور بھی ہے۔ یہ دنیا کا مشہور سیاح ابن بطوطہ ہے۔ جو ہندوستان آیا اور سلطان کی عنایات سے فیضیاب بھی ہوا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس واقعہ کی بابت لکھا ہے کہ جوناخاں نے دکن میں اپنے باپ سے بغاوت کر دی تھی اور عبید شاعر وغیرہ کے ذریعہ لشکر میں غیاث الدین تغلق کی موت کی خبر پھیلا دی تھی۔ مگر جب لشکر کے فوجی سردار سلطان سے فرمانبرداری پر قائم رہے تو جوناخاں بھاگ کر باپ کے پاس دہلی چلا آیا۔ باپ نے بیٹے کو تو معاف کر دیا مگر اس کے ساتھیوں کو قتل کروا ڈالا۔

درد کاکوروی نے لکھا ہے کہ :-

"ابن بطوطہ کے بیان سے باغی اور غدار خود شہزادہ ثابت ہوتا ہے کہ اس نے فوج کو ورغلا کر باپ کا تخت حاصل کرنے کی کوشش کی اور پھر اپنے کارپردازوں کو باپ کے ہدفِ انتقام کے لیے چھوڑ دیا۔

برنی شہزادہ محمد کے معائب سے چشم پوشی کرتا نیز اس کے محاسن اور مسلمہ قابلیت کا ذکر کرتا ہے۔ ایک درباری سے بھلا یہ کب ممکن ہے

کردہ ابن بطوطہ کی طرح شہزادہ کو باغی ثابت کرے۔

ابن بطوطہ ہر قسم کی ترغیبات اور خوف وخطرہ سے آزاد تھے، کیونکہ اس نے اپنے سفر کے حالات اس وقت شائع کیے جب وہ ہندوستان سے بہت دور اپنے وطن میں تھا۔ وہ بلاشبہ ایک باریک بین اور دور اندیش مورخ تھا۔

پس ابن بطوطہ کے بیان کو ترجیح ہے برنی کے بیان پر اور یہ مسلمہ امر ہے۔" [1]

اپنے سوانحی اور تاریخی مضامین میں درد کاکوروی نے یہی پہلو پیش نظر رکھا ہے۔ درد کی جو سوانحی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کے نام 'بارہ امام'، حالات اولیا، اللہ، سیرت قادری، حالات قمر اورنگ آبادی، حالات ازواج مطہرات ہیں۔ حضرت شاہ نظام الدین چشتی کاکوروی کے سلسلے میں ایک مضمون بھی قلمبند کیا ہے۔ ان کے تاریخی مضامین میں ترکوں کی ابتدائی تاریخ۔ سلطان عبدالمجید اور اس کا عہد، علامہ نفر اور مامون رشید، عرب کے بخیل وسخی۔ عربوں میں تعلیم وتدریس، مختصر تاریخ گورنمنٹ بھوپال، اور تاریخ عثمانیہ کا ایک ورق، شامل ہیں۔

انھوں نے اپنی کتاب "بارہ امام" میں اثنا عشر کے حالات اور ان کی تعلیمات وارشادات کو سپرد قلم کیا ہے۔ تمام صوفیوں کی طرح ان کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت فاطمہ رضؓ سے گہری عقیدت ہے اور وہ ان کی روحانی امامت کے قائل ہیں۔ اس کتاب میں درد نے امامت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ولایت کی ابتدا پر روشنی ڈالی ہے۔ ولایت کی ابتدا حضرت علیؓ سے ہوئی ہے

---

[1] فن تاریخ نویسی از درد کاکوروی عالمگیر ص۵۲ اپریل ۱۹۲۸ء۔

طریقت کے تمام مرشدوں اور عارفوں نے حضرت علیؑ کو فاتح باب ولایت محمدیہؐ لکھا ہے۔ درد صاحب چونکہ خود بھی صوفیانہ مزاج کے آدمی تھے اور تصوف ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اس لیے وہ بھی حضرت علیؓ کی فضیلت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"یوں تو حضرت علیؑ کی خصوصیات بہت سی ہیں مگر چند یہ ہیں:۔ کعبہ میں پیدا ہونا، آنحضرتؐ کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر کعبہ کے بتوں کو طاق پر سے اتار کر پھینکنا، سب سے پہلے اسلام لانا، ہجرت کی رات کو آنحضرتؐ کے بستر پر سونا، اسداللہ خطاب پانا، حضرت فاطمہؓ سے نکاح ہونا، رکوع میں انگوٹھی فقیر کو دینا، تین رات مسکین یتیم اور قیدی کو کھانا کھلانا وغیرہ وغیرہ۔" [1]

درد کاکوردی نے اپنی مذکورہ کتاب میں گیارہ اماموں کی وفات کی تاریخیں بھی اشعار میں نکال کر شائع کی ہیں اور حضرت امام مہدی آخرالزماں کی تاریخ غیوب بھی ایک شعر سے برآمد کی ہے۔ یہ تمام تاریخیں درد کاکوردی کی عقیدت کے ساتھ ساتھ شاعری اور تاریخ گوئی پر ان کی دسترس کی بھی شہادت دیتی ہیں۔

تاریخ رحلت حضرت علی کرم اللہ وجہہ

درد مولا کی شہادت پر لکھو
بے سزد یا ہو گیا لفظ عمل
۴۰ھ

---

[1] بارہ امام صفحہ ۴۰ از درد کاکوردی۔

تاریخ رحلت حضرت امام حسن علیہ السلام۔

سری شہادت انکی یہ کہتی ہے دردِ دل
بولاحسن کا "اُن" بیس سال وفات ہوں
سنہ ۵۰ھ

تاریخ رحلت حضرت امام حسین علیہ السلام

لکھوائے درد تاریخِ شہادت
حسین آگاہ دل ، یادِ الٰہی
سنہ ۶۱ھ سنہ ۶۱ھ

تاریخ رحلت امام زین العابدین علیہ السلام

درد زین العبا کے واسطے ہے
سالِ تاریخ ، زندہ عباد
سنہ ۹۵ھ

تاریخ رحلت امام باقر علیہ السلام

وفات حضرت باقر کی خاطر
یہی تھا دردِ دل ، حکم الٰہی
سنہ ۱۱۴ھ

تاریخ رحلت امام جعفر صادق علیہ السلام۔

یہ ہے سالِ رحلت کا اے دردِ دل
ہیں جعفر امام جہانِ ابد
سنہ ۱۴۸ھ

تاریخ رحلت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

بہر جناب موسیٰ کاظم امام دیں

ہجری میں سال نقل لکھو مژدۂ وصال ۔ ۱۸۳ھ

تاریخ رحلت امام محمد تقی علیہ السلام

اے درد بہر نقل امام شہ تقی

ہاتف نے کہہ دیا کہو تم علی علیؑ ۲۲۰ھ

تاریخ رحلت امام علی نقی علیہ السلام

علی عرف نقی کا سال رحلت

مطہر درد ہے یا قطب الاقطاب

۲۵۴ھ ۲۵۵ھ

تاریخ رحلت امام عسکری علیہ السلام

درد از بہر عسکری لکھ دو

سال تاریخ ۔ قدوۂ قدماء

۲۶۰ھ

تاریخ غیبوبت مہدی آخر الزماں علیہ السلام

ہوئے مخفی مہدی علیہ السلام

لکھو درد ۔ معدوم اہل جہاں

۲۶۰ھ ۔

قلندریہ سلسلہ میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بڑی گہری محبت اور والہانہ فریفتگی پائی جاتی ہے۔ درد کاکوروی نے گیارہویں شریف کے موقعوں پر مجلسوں میں پڑھنے سننے اور ثواب حاصل کرنے کی غرض سے سیرت قادری عرف گیارہویں شریف کے نام سے کتاب لکھی۔ یہ خیال ان کو اس لیے آیا کہ بارہویں اور گیارہویں

کی مقدس مجالس کی اصل افادیت پر لوگوں کی توجہ کم ہوتی جارہی تھی ۔ سیرت قادری کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے درد صاحب رقم طراز ہیں :۔

"عام طور پر میلاد شریف یا گیارہویں شریف کے متعلق جو کتابیں پائی جاتی ہیں ان میں اکثر غلط روایتیں ہوتی ہیں یا محض کرامتوں سے کتابیں بھردی جاتی ہیں ۔ عرصے سے خیال تھا کہ ان ہر دو موضوع پر کتابیں لکھی جائیں ۔ میلاد رسول عربی لکھا گیا قبولیت اس سے ظاہر ہے کہ اس کی جلدیں ختم ہوگئیں ۔ پھر میں نے میلاد رسول مدنی لکھا یہ وہ کتاب ہے کہ مولانا سلیمان ندوی صاحب نے رسالہ معارف میں اس کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے ۔

خدا کا شکر ہے کہ اب گیارہویں شریف کے متعلق یہ کتاب ہدیۂ ناظرین ہے جس میں حضرت سید عبدالقادر جیلانی کی تعلیمات پر زیادہ توجہ دلائی گئی ہے ۔ " [1]

سیرت قادری میں درد نے اپنی عقیدت کا اظہار تو نثر و نظم دونوں میں کیا ہی ہے لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں نظر آتی ۔ کشف و کرامات کے واقعات بھی لکھے ہیں اور آپ کی پوری سوانح حیات بھی درج کردی ہے لیکن سیرت قادری کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی روحانی تعلیمات اور اخلاقی تعلیمات کو بھی پیش کیا گیا ہے ۔ آپ کے وعظ بہت مشہور تھے اور یہ عربی زبان میں قلم بند کرلیے گئے تھے ۔ درد کاکوروی نے آپ کے وعظوں کا خلاصہ اور آپ کے اہم ارشادات کا ترجمہ بھی کتاب میں مناسب اور موزوں طریقہ سے درج کردیا ہے ۔ روحانی اور اخلاقی تعلیمات تمام صوفیائے کرام

---

[1] سیرت قادری ص ۱ از درد کاکوروی ۔

کے ارشادات میں ملتی ہیں۔ اسی طرح شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی تعلیمات وارشادات بھی یہی اہمیت رکھتے ہیں اور درد نے ان کو یکجا کر کے عوام کے سامنے پیش کیا ہے تاکہ گیارہویں شریف کی مجلسوں سے پورا فیض حاصل کیا جا سکے۔

بزرگان دین سے ان کی عقیدت ابتداء سے زندگی کے آخر زمانہ تک قائم رہی۔ چنانچہ انہوں نے حالات اولیاء اللہ کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں مشہور بزرگوں کی مختصر سوانح اور ان کی تعلیمات کو پیش کیا ہے۔ بارہویں صدی کے چشتی سلسلہ میں شیخ کلیم اللہ جہان آبادی اور ان کے مرید و جانشین شاہ نظام الدین اورنگ آبادی اور پھر ان کے فرزند و جانشین شاہ فخرالدین چشتی بہت مشہور عالم و درویش ہیں جنہوں نے تصوف کی بڑی خدمت کی ہے ان حضرات کی تحریروں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ درد کاکوروی نے خصوصیت سے شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کی سوانح لکھی ہے کیونکہ وہ کاکوری میں پیدا ہوئے تھے تعلیم و تربیت بھی وہیں ہوئی تھی پھر مرشد کی تلاش میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے روحانی تربیت دے کر ان کو اورنگ آباد دکن میں قیام کا حکم دیا۔ درد نے اپنی کتاب حالات اولیاء اللہ میں تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے۔[1]

درد کاکوروی کو تاریخ نویسی سے گہرا لگاؤ تھا اس لیے انہوں نے تاریخی شخصیتوں پر متعدد مضامین لکھے ہیں جو مختلف رسائل میں اشاعت سے ہمکنار ہوئے۔ اسی طرح تاریخ کے دوسرے گوشوں پر بھی نظر ڈالی ہے۔ "عربوں میں تعلیم و تدریس" کے عنوان سے اپنے مضمون میں انہوں نے امام غزالیؒ کے حوالے سے مسلمانوں میں تعلیم و تدریس کے قدیم زمانہ کا جائزہ لیا ہے اور استاد

---

[1] کاکوری اخبار یکم دسمبر ۱۹۶۲ء۔

و شاگرد دونوں کے لیے وہ فرائض بیان کیے ہیں جن کو انجام دیئے بغیر علم کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ اس میں شاگرد کے دس فرض بیان کیے ہیں اور استاد کے آٹھ فرض۔ یہ امام غزالی کا تعلیمی فلسفہ ہے جو ان کی کتاب احیاء العلوم کے ایک باب میں بیان ہوا ہے اور درد کاکوروی نے اس کو بڑی خوبصورتی سے سمیٹ کر اپنے اس مضمون میں پوری طرح بیان کر دیا ہے۔ [۱]

اس صدی کی تیسری دہائی تک ہندوستانی مسلمانوں کو عام طور پر ترکوں اور ترکوں کی تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی۔ کیونکہ ترکی کے عثمانی سلطان خلافت کا امتیاز بھی رکھتے تھے عثمانی خلافت سے جذباتی لگاؤ عام تھا۔ درد کاکوروی نے بھی ترکوں کی ابتدائی تاریخ کے باب میں بہت کچھ لکھا ہے "ترکوں کی ابتدائی تاریخ" [۲] میں انہوں نے تیرہویں صدی عیسوی میں اس سلطنت کے قیام کی پوری تاریخ کو تحریر کے حوالے کر دیا ہے۔ اور ترکی سلاطین کے جد امجد ارطغرل، اس کے جانشین غازی عثمان کے حالات قلم بند کیے ہیں۔ غازی عثمان ہی سلطنت عثمانیہ کا بانی تھا اور اسی کے نام سے عثمانی سلطنت اور خلافت منسوب ہوئی تھی۔ اس مختصر مضمون میں انھوں نے عثمانی سلطنت کے قیام اور عروج کا پورا حال درج کر دیا ہے۔ عثمانی سلاطین کے سلسلہ میں سب سے زیادہ کامیاب اور مشہور سلطان سلیم اعظم قانونی گزرا ہے۔

درد کاکوروی نے اپنے مضمون "تاریخ عثمانی کا ایک ورق" میں سلطان سلیمان اس کی فتوحات اور اس کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سلطان سلیمان کی علمی قدردانی اور رفاہ عام کے کاموں کو بھی سراہا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

---

[۱] عربوں میں تعلیم و تدریس از درد اسلامی خلافت جنتری ۱۳۴۲ھ

[۲] ماہنامہ عالمگیر ص ۲۴-۲۵ اپریل ۱۹۲۸ء

"سلطان سلیمان اعظم نے مذہبی حیثیت سے طبقۂ علماء اور صالحین کو خاص طور پر اعزاز دے رکھا تھا۔ سب سے بڑی جو چیز قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ علماء کو ٹیکس معاف کر دیا ــــ نہ صرف یہ بلکہ ان کی جائداد کو ضبطی سے بھی محفوظ رکھا گیا اور یہ حکم تھا کہ ہر عالم کی جائداد کا اسی عالم کا بیٹا وارث ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ عثمانیہ سلطنت میں علماء اور مفتیوں سے زیادہ دولت مند اور جاہ و حشمت والا کوئی نہیں تھا۔ سلطان سلیمان اعظم نے کئی عالی شان مدرسے اور کالج تیار کرائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے لیے بڑی بڑی جاگیریں وقف کر دیں۔" [1]

درد نے "سلطان عبد المجید کا عہد اور قومی اصلاح" [2] کے نام سے جو مضمون لکھا ہے اس میں بھی ان کے گہرے تاریخی شعور کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ بادشاہ اگرچہ کم عمر اور عیش پسند تھا لیکن اس کے ساتھ ہی منصف مزاج اور نیک دل بھی تھا۔ اس نے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی ملکی اصلاحات پر توجہ کی۔ اور ۳ نومبر ۱۸۳۹ء کو ایک فرمان جاری کر کے امن و امان، محصول وصول کرنے کا یکساں قاعدہ، فوج میں بھرتی کے نئے نئے قواعد نافذ کیے۔ اس سے زیادہ درد کاکوروی نے اہمیت اس بات کو دی ہے کہ سلطان عبد المجید نے فوجی نظام کی اصلاح کے پہلو بہ پہلو تعلیمی نظام کی بھی اصلاح کی۔ پہلی مرتبہ ۱۸۸۶ء میں ایک یونیورسٹی قائم کی گئی۔ عدالتی نظام کو بہتر اور کارگر بنایا گیا اس طرح ترکی میں عہد جدید کی ترقیوں کا آغاز ہوا۔

ہندوستان کی مشہور ریاست بھوپال سے اہل کاکوری کا بہت قریبی

---

[1] تاریخ عثمانیہ کا ایک ورق از درد عالمگیر ص ۱۵ خاص نمبر ۱۹۲۷ء دوسرا ایڈیشن۔

[2] ماہنامہ عالمگیر ص ۳۷-۳۲ اکتوبر ۱۹۲۸ء۔

رشتہ تھا۔ بھوپال کے سب سے کامیاب وزیر اعظم منشی امتیاز علی کاکوری کی مشہور شخصیت تھی۔ بہت سے اہل کاکوری بھوپال میں مختلف عہدوں پر فائز تھے۔
اس تاریخی نسبت کی وجہ سے درد کاکوروی نے "مختصر تاریخ گورنمنٹ بھوپال"[۱] کے نام سے ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے جو بھوپال سے ان کی گہری وابستگی اور اس کی پوری تاریخ سے ان کی واقفیت کا آئینہ دار ہے۔

اس مضمون میں انہوں نے ۱۷ ویں صدی میں سردار دوست محمد خاں کے حالات سے بھوپال کی ابتدا کی ہے اور بیسویں صدی میں پہونچ کر نواب سلطان جہاں بیگم اور پھر نواب شاہجہاں بیگم تک کے دورِ حکومت کا مفصل جائزہ لیا ہے نوابان بھوپال کی تاریخ کے ساتھ ہی انہوں نے بھوپال میں علمی اور تعلیمی ترقیوں اور علم پروری کا بیان بھی کیا ہے۔ یہ سابق ریاست بھوپال کی مکمل تاریخ ہے اور آج بھی اس کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس مضمون میں درد نے درس گاہوں، کتب خانوں، اسپتالوں، عجائب خانہ اور تاریخی مقامات و عمارات کا حال بھی درج کیا ہے۔

تاریخ سے ان کی دل چسپی کی وجہ سے اسلامی تاریخ کے کئی اہم گوشوں پر ان کے مضامین وجود میں آئے۔ "علامہ نضر اور مامون رشید" میں انہوں نے عباسی خلافت کے دورِ شباب یعنی مامون الرشید کے زمانہ کے ایک عظیم عرب عالم نضر بن شمیل بصری کے حالات سپرد قلم کیے ہیں جو عربی نحو کے امام خلیل بن احمد کے شاگردِ رشید تھے۔ درد کاکوروی نے علم و فضل کے اس دور میں بھی علم کی ناقدری اور پھر قدردانی دونوں کا نقشہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مذکورہ مضمون میں لکھا ہے کہ نضر بن شمیل کو بدویوں کے خالص عربی

---

[۱] اسلامی خلافت جنتری ص ۶۵-۵۷ ۱۳۴۲ھ

محاوروں سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے چالیس برس تک صحراؤں میں ان کے ساتھ رہنا پڑا۔ کے تنب و روز گذارنا پڑے۔ بصرہ میں ان کے سات سو شاگرد تھے۔ لیکن مالی حالت اتنی خراب تھی کہ آخر ان کو مامون الرشید کی سرپرستی حاصل کرنے کا خیال آیا اور انہوں نے بصرہ کو خیرباد کہا۔ اس واقعہ کے بیان میں درد رقمطراز ہیں :-

"جس وقت علامہ نضر بصرہ سے روانہ ہو رہے تھے اس وقت عجیب عالم تھا۔ ہزاروں آدمی علامہ نضر کو رخصت کرنے آئے ان میں سات سو آدمی تو علامہ نضر کے خاص شاگرد تھے۔ اگرچہ بہت شاگرد خوشحال بھی تھے لیکن ان میں سے کسی کو استاد کی افلاسی حالت کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ اگر شاگردوں میں کوئی شخص بھی اپنے ذمہ ان کے مصارف لے لیتا تو ان کو سفر کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ بعض شاگرد زار و قطار رو رہے تھے۔ علامہ نضر سے بھی ضبط نہ ہو سکا آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ کیونکہ ان کو صرف وطن چھوٹنے کا رنج نہ تھا بلکہ اپنے سات سو شاگردوں کی جدائی بھی شاق تھی۔ علامہ نضر نے ایک دلآویز تقریر کی اور کہا اگر تم لوگ ہر دن پاؤ بھر باقلا بھی دیتے رہو تو میں کہیں نہ جاؤں۔ مگر نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر علامہ نضر چل کھڑے ہوئے اور مرو میں جو خراسان کی دارالسلطنت تھا پہنچے"۔ [1]

درد کاکوروی نے اہل علم کی ناقدری کا یہ نقشہ پیش کرنے کے بعد دربار شاہی کے حال میں بھی ایک بڑی اہم بات واضح کی ہے۔ علامہ نضر بن شمیل

---

[1] ماہنامہ عالمگیر ص۱۱ جولائی ۱۹۲۸ء علامہ نضر اور مامون الرشید۔ از درد کاکوروی

کے سامنے ایک حدیث پڑھتے وقت مامون الرشید نے "محسن" (اعراب) کی غلطی کی۔ نضر بن شمیل نے مامون کو ٹوکنے کے بجائے ایک دوسری حدیث کی تلاوت کی اور اس میں اس لفظ کا استعمال درست تلفظ کے ساتھ کیا۔ مامون نے ناراض ہو کر پوچھا کہ کیا میں لحن کرتا ہوں۔ لیکن نضر بن شمیل نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ جواب دیا کہ آپ لحن نہیں کرتے بلکہ اس حدیث کے راوی ہیثم بہت لحن کرتے تھے اور یہ انھیں کا لحن ہے۔

درد کاکوروی کا ایک اور مضمون تاریخ عرب سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا مظہر "عرب کے بخیل و سخی" ہے۔ اس میں انہوں نے جہاں ایک طرف حاتم طائی، کعب بن امامہ، ہرم بن سنان، معن بن زائدہ، احمد بن فرخ اور خالد بن ولید جیسے سخاوت کے دریا بہانے والوں کے واقعات لکھے وہاں انہوں نے عربی تاریخ و ادب میں غیر معمولی کنجوسی کرنے والوں کی دلچسپ روداد بھی قلم بند کی ہے۔ ان بخیلوں میں انہوں نے خطیہ، حمید ارقط، ابو الاسود الدئلی، خالد بن صفوان، عمر بن یزید اسدی، مخارق بن ہلال کی کنجوسی کے اہم واقعات درج کیے ہیں۔

درد کاکوروی کی تاریخ سے دلچسپی آخر وقت تک برقرار رہی اور انہوں نے تصوف اور مذہب کے بارے میں متعدد مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایسی تحریروں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جو مختلف اخبارات و رسائل میں بکھرا ہوا ہے۔ اگر ان کو یکجا کر کے مرتب کیا جائے تو ان کے مضامین کا ایک ضخیم مجموعہ منظر عام پر آ سکتا ہے۔ تاریخ پر قلم اٹھانے کے لیے تاریخ سے دلچسپی ہی کافی نہیں بلکہ وسیع مطالعہ اور تنقیدی بصیرت بھی ضروری ہے۔ درد کاکوروی نے عربی، فارسی اور اردو زبان میں پائی جانے والی تاریخ کی اہم کتابوں سے براہ راست استفادہ کر کے تاریخی مضامین سپرد قلم کیے ہیں جن میں اہم کتابوں کا نچوڑ آ گیا ہے اس لحاظ سے ان کے تاریخی مضامین کی بڑی اہمیت ہے اور ان کو علمی حلقوں میں

ہمیشہ قدردانی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ عوام میں مقبولیت اس لیے ملی کہ ان کی تحریریں تاریخی معلومات کا خزانہ ہیں اور جو لوگ براہ راست عربی اور فارسی کے مصادر سے استفادہ نہیں کر سکتے ان کے لیے خاص طور پر مفید ہیں۔
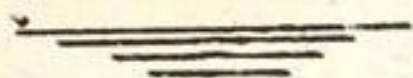
(ج) مذہبی وصوفیانہ موضوعات

دردؔ کاکوروی کی تحریری یادگاروں میں مذہب اور تصوف کی تاریخ ان کے اہم مسائل اور ان کی اخلاقی و روحانی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ ایک مذہبی انسان تھے، ایک صوفی تھے۔ جس قدیم تہذیبی ماحول میں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی وہ روحانی اور اخلاقی اقدار کی بالادستی کا ماحول تھا اور زندگی کی یہ ساری قدریں براہ راست مذہب اور تصوف سے وابستہ اور مذہب و تصوف کے اثرات کا نتیجہ تھیں۔ دردؔ کاکوروی کا ذہن اسی سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا۔ بیسویں صدی میں جو کچھ ہوا ہے اس کو تشکیک اور اعتراض کے سوا انھوں نے کچھ اور نہیں سمجھا اس لیے اپنی مذہبی نگارشات میں ان کا سارا زور اس پہلو پر نظر آتا ہے کہ روحانی اور اخلاقی تعلیمات کی وضاحت کرکے ان پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا جائے اور ان کو ذہن نشین کرنے کے لیے صاف اور سلیس زبان میں اپنا نقطۂ نظر پیش کر دیا جائے۔ وہ اپنی ان تحریروں میں کہیں بھی مناظرانہ انداز اختیار نہیں کرتے، اعتراضات کا سنجیدہ پیرایہ میں جواب دیتے ہیں۔ ان کا مقصد کسی کا رد کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد بزرگان دین کے مسلک کی ایسی ترجمانی کرنا بھی ہے جس کو جدید ذہن بھی قبول کر سکے۔

دردؔ کاکوروی نے دینی اور مذہبی مضامین کتابوں اور کتابچوں میں عوام کے لیے بنیادی معلومات فراہم کرنے کا مقصد بھی اپنے سامنے رکھا ہے۔ ان کی ایسی تحریروں میں محبت اور عقیدت کے جذبات بہت نمایاں ہیں۔ والہانہ عقیدت کے بغیر وہ اتنا وسیع کام نہیں کر سکتے تھے۔

انہوں نے سیرتِ سرورِ کائنات لکھنے کی سعادت بھی حاصل کی ہے۔ خلفائے راشدین حضرت صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سیرتیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی پہلی سیرت نبوی میلاد رسول عربی کے نام سے شائع ہوئی اور یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اس کے بعد درد نے میلاد رسول مدنی لکھی۔ درود شریف کی اہمیت وافادیت پر ان کی کتاب "درود شریف اور اس کے فائدے" کو بے حد سراہا گیا۔ کربلا کے واقعات کے ضمن میں انکی "دو جنتی پھول" بھی بہت مشہور ہوئی۔

درد نے بچوں میں اسلامی معلومات کو فروغ دینے کے لیے بھی متعدد کتابیں خاص طور پر بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ نبی کریمؐ کی احادیث کو یکجا کر کے انہوں نے 'مجموعہ مختصر احادیث' مرتب کی۔ اس میں ایمان، اسلام، صحابہؓ، اہل بیت اور ہمسایہ وغیرہ کے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ وضو اور نماز کے مسائل پر "وضو اور نماز کی حکمتیں" بھی قابل تعریف و توصیف کتاب ہے۔

ان کی ایک اہم کتاب عاشورا ہے جس میں انہوں نے یوم عاشورا کے سلسلے میں تاریخ، حدیث اور بزرگان دین کی روایات کو مرتب کر کے اپنے مسلک کا نظریہ واضح کیا ہے۔ اس میں منقبت آل اطہار کو نثر میں بھی بیان کیا گیا ہے اور نظموں میں بھی ان کے مراتب و فضائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی یہ کتاب توازن و اعتدال لانے کی ایک کوشش ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اہل بیت اور بارہ اماموں سے ان کی گہری عقیدت و محبت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور واقعات کربلا کا پورا پس منظر بھی سپرد قلم کیا ہے۔ اپنی اس تالیف میں انہوں نے بے شمار مستند کتابوں کے حوالے پیش کیے ہیں۔ درد نے لفظ "عاشورہ" کی تحقیق میں جس عرق ریزی سے کام لیا ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے :-

"کتاب شہادۃ الکونین میں منتخب، صراح، غیاث اللغات کے حوالوں سے لکھا ہے کہ "ہ" سے عاشورہ لکھنا غلط ہے۔ اس لفظ کے آخر میں الف ہے یعنی "عاشورا" کیونکہ یہ لفظ عشر سے نکلا ہے اور اس کے معنی ہیں دسواں۔ اردو زبان میں جب یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو شاعری کے فن کے لحاظ سے کبھی امالہ کیا جاتا ہے یعنی عاشورا نہیں بلکہ عاشورے لکھا جاتا ہے۔ جیسے عاشورے کا دن" [1]

درد کاکوروی نے عدم عاشورا کی ابتدا اور اس دن کے مخصوص مراسم کی بابت قدیم روایت پیش کی ہے کہ۔

"نزہتہ المجالس کے ص۱۵۸ میں ہے کہ نوحؑ کی بددعا سے جو طوفان آیا تھا تو چالیس رات دن آسمان سرخ اور چشموں کا پانی زرد رہا غرض (۱۵۰) دن تک بارش ہوتی رہی۔ آنحضرت صلعم کے نام کی برکت سے نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر رکی تو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا جس کے پاس جو کچھ توشہ ہو ایک جگہ جمع کر دے۔ یہ سن کر کوئی مٹھی بھر جوار لایا، کوئی جو، کوئی گیہوں، کوئی لوبیا، کوئی مسور، جب سب کا توشہ جمع ہو گیا تو نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ ان سب کو ملا کر پکالو۔ اس خوشی میں کہ اللہ نے تم کو سلامتی عطا فرمائی ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ اسی دن سے یہ رسم چلی آرہی ہے کہ مختلف اناج ملا کر عاشورے میں پکاتے ہیں اسی کو کھچڑا کہتے ہیں۔" [2]

عاشورا کا پہلا حصہ نثر میں ہے اس کے بعد ان کی منظومات ہیں جن میں شہدائے کربلا کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ان نظموں میں منقبت بھی ہے اور سلام بھی

---

[1] عاشورا ص۱۷ [2] عاشورا

اور مرثیہ بھی جو مسدس میں ہے۔ ان کے منظوم حصہ سے چند رباعیاں اور مرثیہ سے چند بند پیش ہیں:

چوں گشت شہید خود گواہ است حسینؑ
از نسبت جد جہاں پناہ است حسینؑ
چوں کرد حجابات ضلالت کافور
واللہ ضیائے لا الٰہ است حسینؑ

بھوکے رہے تین دن پیاسے ٹھہرے
وعدے ہوئے ارضِ نینوا سے ٹھہرے
کیا درد سے ہو سکتی ہے توصیفِ حسین
شبیر، رسولؐ کے نواسے ٹھہرے

اس کتاب میں شامل "مسدس واقعہ" سے چند بند جس میں وہ میر انیس و دبیر کی طرح پرشکوہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ حضرت امام حسین کی شان اور شجاعت ملاحظہ ہو:

ہے رن میں جو آمد پسرِ شیرِ خدا کی — ہیبت سے زمیں ہلتی ہے میدانِ وغا کی
کیا نور جھلکتا ہے جبینوں میں قضا کی — لو آئی سواری وہ شہِ کرب و بلا کی

وہ دیکھیے شمشیرِ دو دم زیبِ کمر ہے
قربان شجاعت ہے تو پابوس ظفر ہے

یوں کفر کی تیوری پہ ہے اس درجہ بل آیا — ہیں کہتے مناظر کہ پیامِ اجل آیا
ہے مہر تظلم کا بیانِ حمل آیا — یا سینۂ فطرت سے دھواں سا نکل آیا

یارا کسے میداں میں شمشیر بکف کا
ہو کون مقابل پسرِ شاہِ نجف کا

جب چیر دیا لشکرِ اعداء کے پروں کو — شمشیر نے برسا دیا میداں میں سروں کو
یوں چاک کیا اہلِ جفا کے جگروں کو — کاٹا تبرو تیغ و سنان و سپروں کو

تلوار پڑی یوں پسرِ شیرِ خدا کی
تھرا گئی ہیبت سے زمیں کرب و بلا کی

پایا جو سپر کو تو سپر کاٹ کے آئی — لپکی سرِ اعدا پہ تو سر کاٹ کے آئی
سر کاٹ کے، دل اور جگر کاٹ کے آئی — فارغ ہوئی اس سے تو کمر کاٹ کے آئی

افلاک پہ ٹھہری نہ رکی فرشِ زمیں پر
دو کرتی رہی ایک کے شمشیر دو پیکر

درد خدا کے حضور میں دعا گو ہیں :-

اے درد یہ خالق سے دعا ہے کہ جہاں میں — کہتے ہیں جسے مدحت شبیر بیاں میں
گویائی رہے بن کے ہمیشہ یہ زباں میں — فطرت کی زباں کرتی ہے اعلان جہاں میں

مردہ ہی رہے ذکر یزید ایسے شقی کا
ہاں زندہ رہے نام حسینؓ ابن علیؓ کا

درد کاکوروی نے خانقاہی مسلک کے دفاع میں کافی لکھا ہے۔ ان کی کتاب "اچھے اعتقاد" (قرآن و حدیث کی روشنی میں)" میں اسی نقطۂ نظر سے ان تمام مسائل پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے جو تقریباً دو سو برس سے متنازعہ ہیں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں مستند حوالوں کے ساتھ درد نے نذر و نیاز، فاتحہ، عرس، میلاد، ایصالِ ثواب، مزاروں پر چادر چڑھانا، مزارات کا بوسہ دینا، ان پر قبّوں کی تعمیر، جھاڑ پھونک، موئے مبارک کی زیارت، میلاد میں قیام

دست بوسی وقدم بوسی، انگوٹھے چومنا اور عام طور پر کسی کی وفات کے بعد فاتحہ سوئم (تیجہ) دسویں، بیسویں اور چالیسویں دن کھانا پکاکر فاتحہ کرنے کے عام مراسم کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی طرح وسیلے اور استغاثہ کے جواز پر بحث کی ہے۔ اسی طرح وہ تبرکات کی زیارت کے حق میں بھی نظر آتے ہیں۔ یہ ایسے مراسم ہیں جو مسلمانوں میں اب متنازعہ بھی بن گئے ہیں اور ان کے موافق اور مخالف حلقوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کو تفصیل سے عوام کے سامنے رکھ دیا ہے۔ درد کاکوروی نے بہرحال انتہا پسندی کا رویہ اختیار نہیں کیا ہے اور اپنے مسلک کے حق میں دفاعی رویہ سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں یہ لکھا ہے کہ:

"ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مسلمان بھائی آپس کے اختلافات کو بھول جائیں اور اعتدالی نقطۂ نظر نیز رواداری کے تحت ایک مرکز پر متحد ہوجائیں یہ آپس کے جھگڑوں کا زمانہ نہیں ہے۔"[1]

اس کتاب کے آخر میں انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ اسلام میں شاعری مطلقاً ناپسندیدہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے سورۂ شعراء کی اس آیت کی تفسیر بیان کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ شاعروں کی پیروی گمراہ کیا کرتے ہیں اور پھر یہ فرمایا گیا ہے کہ شاعر جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں۔ درد نے شاعری کے جواز میں نعت گوئی کا ذکر کرتے ہوئے یاد دلایا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے حضرت حسان بن ثابتؓ کی شاعری کی حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔ انہوں نے تین حدیثوں کا حوالہ بھی دیا ہے جن میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ شعر سیکھو کیونکہ وہ تمہاری زبان کی ترجمانی کرتا ہے۔ شعر میں سے حکمت اور علم والے اشعار سیکھو، عمدہ شعر عمدہ کلام کی

---

[1] اچھے اعتقاد ص ۳ از درد کاکوروی

کی طرح اور برا شعر برے کلام کی طرح ہے۔ آخر میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ:

"بہر حال یہ آیت شاعری یعنی جذبات نگاری کے منافی نہیں اس لیے کہ اس طرح اس آیت میں ان شعرا کی مذمت ہے جنہوں نے شاعری کو گمراہ باتوں کے لیے وقف کر دیا ہے اور اصل راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ رہا یہ کہ اصل راہ کیا ہے اور شاعری کیسی ہونی چاہیے اس کے لیے ہمارا وہ مضمون "شاعری مذہبی نقطۂ نظر سے" دیکھیے جو رسالہ 'پیمانہ' ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ہے۔ مولانا سیماب اکبرآبادی نے اس مضمون کو دیکھ کر اور خوش ہو کر جو خط مجھکو لکھا تھا وہ میرے پاس محفوظ ہے۔" [1]

سیرنگاری میں غزوات کو ایک خاص اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ کا زریں باب ہیں اور زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی اس مزاحمت کی داستان بھی ہیں جو وہ اسلام کی دعوت قبول نہ کرنے کی وجہ سے بڑی مدت تک کرتے رہے۔ درد کاکوروی نے اپنے مضمون "غزوات نبویہ" میں تمام مشہور غزوات کا پس منظر اور ان کے نتائج پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے اپنے اس مضمون میں خصوصیت سے سیر کے جس پہلو پر نظر ڈالی ہے وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:

"یورپ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کسی کتاب کو لے لیجئے قطع نظر اور باتوں کے سیرت، اخلاق اور آنحضرت صلعم کی رحم دلی نے ہر مورخ کو حیرت میں ڈال دیا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض مؤرخین پکار اٹھے کہ عالم میں محمد

---

[1] اچھے اعتقاد ص ۱۶۲ از درد کاکوروی

(صلی اللہ علیہ وسلم) کی نظیر نہیں ہے۔" ؎۱

مذہبیات کے دائرہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہی کی حیثیت سے لکھا ہے۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں درد کاکوروی نے مادیت پسندی اور مادیت پرستی کے تمام نظریات کو مسترد کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان "کیا واقعی جن اور فرشتوں کا وجود ہے" تھا اس میں درد نے غیر انسانی مخلوق کے وجود کے حق میں بالکل عقلی اور سائنسی دلیل دی ہے:

"تری اور خشکی سے لے کر انسانی ہستی تک جتنی درمیانی ہستیاں گذری ہیں ان سب کا ایک غیر محدود سلسلے میں شمار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ان درجوں اور مرتبوں کی طرف توجہ نہیں کرتا کیونکہ یہ تمام درجے نہایت ہی لطیف اور غیر محسوس ہیں لیکن انسانی درجہ تک خاص خاص ہستیاں موجود ہیں جو ایک دوسرے کے سلسلے بتلاتی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اسی طرح انسان اور خدا کے درمیان بھی مخلوقات کی بڑی تعداد ہو جس کے ذریعہ انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔ بے شبہ ہم کو وہ مخلوق نظر آتی ہے ہمارے اور خدا کے درمیان میں ہے۔ لیکن ہم ایسی چیز سے جو ہم کو نظر آئے اس کے وجود کا کسی طرح انکار نہیں کر سکتے اور اگر انکار کر دیں تو ہم بہت جلد جھٹلائے جا سکتے ہیں فرض کرو فلسفہ کا ایک عالم پانی کا ایک قطرہ لیے ہوئے ایک جاہل سے کہہ رہا ہے کہ یہ قطرہ جس میں تم کو کچھ نظر نہیں آتا خدا کی جاندار مخلوق چھوٹے چھوٹے کیڑوں سے بھرا ہوا ہے جو بالکل جانداروں کی طرح

؎۱ غزوات نبویہ ص ۳۸ اسلامی خلافت جنتری ۱۳۰۴۲ھ۔

پیدا ہوتے، زندہ رہتے اور مرتے ہیں۔ جاہل آدمی یہ سب باتیں سن کے بہت جھلائے گا اور فلسفے کے عالم کو دیوانہ سمجھے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اس جاہل کی آنکھوں پر خوردبین رکھ دی جائے تو اس کو بھی اس بات کا اقرار کرنا پڑے گا کہ بے شک کہنے والا سچ کہتا ہے کیونکہ اب وہ خوردبین کے ذریعہ ناچیز قطرے کی ہستی میں ایک بحری دنیا کو آباد پائے گا۔ غرض جہاں ہم کو کچھ نظر نہیں آتا وہاں خدا کی ایک بہت بڑی زندہ مخلوق آباد ہے۔ اسی طرح مرشد کسی شکی مزاج طالب کے دل کی آنکھوں پر غیر فانی خوردبین رکھ دیتا ہے تو اس کو فرشتے یا جن شیاطین وغیرہ سب نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں اور جس مخلوق کا وہ آج تک منکر تھا اس کو ان سب کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔"[1]

درد کاکوروی نے یہ دلیل تقریباً ۲۰ سال پہلے دی تھی جب مادیت پرستی کا فلسفہ عروج پر تھا اس کے فوراً بعد آئن اسٹائن جیسے سائنسداں نے مادہ کو توانائی قرار دے کر مادیت پرستی کی بنیاد ہی منہدم کر دی اور عالم روحانیت کا انکار یا بالکل انکار ممکن ہی نہیں رہا۔ درد نے ہماری دنیا میں غیر انسانی مخلوقات کے وجود کو ثابت کرنے کے بعد روحانی دنیا کے وجود کا ثبوت یوں پیش کیا ہے:

"اگر ہم جسمانی آنکھوں کے بجائے روحانی آنکھوں سے کام لیں تو ہم پر پُر اسرار مخلوق روشن ہو جائے گی۔ ذرہ سے لیکر انسان تک جتنی ہستیاں ہیں ان سب میں ایک درجہ ایک مرتبہ، ایک ترتیب، ایک سلسلہ ضرور پایا جاتا ہے اور ہر سلسلہ اور ہر درجہ ان سے ہر ایک پہلے درجے سے پاک اور بہتر ضرور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ

---

[1] کیا واقعی جن اور فرشتوں کا وجود ہے! درد ص ۵۵ اسلامی خلافت جنتری ۱۳۴۲ھ۔

انسانی ہستی کا ایک ایسا درجہ ملتا ہے جو تمام درجوں میں اشرف اور ممتاز تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس ہستی کو ہر طرح پر کامل اور اکمل نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اگر غور کیا جائے تو ابھی تک اس میں کچھ نہ کچھ کثافتیں موجود ہیں۔۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو قدرت کا وہ قانون جو اسفل سے اعلیٰ کی طرف لے جاتا ہے بتاتا ہے کہ انسانی ہستی سے اوپر بھی کئی قسم کی مخلوقات کے درجے ضرور موجود ہیں۔ اور وہ ایسے درجے ہیں جہاں کی مخلوق انسانی نقص اور کثافت سے بھی پاک ہے۔۔ یہی فرشتوں اور عالم ارواح کا مقام ہے۔ سورہ المدثر میں جناب باری فرماتا ہے کہ مَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ۔ (ترجمہ) اللہ کے لشکر کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ،، [1]

دردؔ کاکوروی۔ کاکوری میں خانقاہ تکیہ کاظمیہ سے وابستہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے پیر و مرشد شاہ علی انور قلندر کی کرامتوں کو یکجا کر کے "گلشن کرامت" کے نام سے مرتب کر کے مطبع سعیدی رام پور سے چھپوائی تھی۔ کتاب کے آغاز میں شاہ علی انور قلندر کے مختصر حالات بھی قلم بند کیے ہیں جو نغمات العنبریہ سے ماخوذ ہیں۔ گلشن کرامت میں ۱۸۲ واقعات درج کیے ہیں۔ جن سے روحانی دنیا کے معاملات پر روشنی پڑتی ہے۔ دردؔ نے اپنے پیر و مرشد کی کرامتوں کو جمع کرنے میں بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے ۲۹ حضرات سے وہ واقعات معلوم کر کے سپرد قلم کیے ہیں جو یا تو ان پر گذرے تھے یا جن کا انہوں نے خود مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے مقدمہ میں دردؔ کاکوروی نے کرامتوں کی صداقت سے انکار کرنے والوں کو مخاطب کر کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے

---

[1] کیا واقعی جن اور فرشتوں کا وجود ہے؟ از دردؔ اسلامی خلافت جنتری ص ۵۵ ۱۳۴۲ھ

کہ صدورِ کرامت عقل کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ عالمِ روحانیت کی ایک سچائی ہے اور خدا کے وجود پر ایمان رکھنے والا کسی چیز کو خلافِ عقل نہیں بلکہ قدرتِ الہٰی کا تابع سمجھتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

"اما بعد۔ بندۂ عاصی مکرم احمد عارض مدعا ہے کہ حضرات اولیاء کرام کے تصرفات و کرامات ایسی چیزیں ہیں جو اپنی بداہت کی وجہ سے محتاج ثبوت نہیں اگرچہ بعض مقیدان عقول جزئیہ اپنی استبداد طبیعت کی وجہ سے اب تک ان کے منکر ہیں۔ اور یہی مشاہدات کے بھی حتی الامکان فرضی تاویلات کیا کرتے ہیں۔ لیکن دراصل یہ کوئی الجھنے کی بات ہی نہیں۔ اس لیے کہ کارخانۂ عالم کو جب قدرتِ الہٰی پر منحصر سمجھا جائے تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خالق کو خلاف حالتِ موجودہ کے بھی قدرت حاصل تھی اور ہے اب یہ کہ حکمت اسی ترتیب کو مقتضی تھی جس پر کہ کارخانہ جاری ہے۔ لہٰذا اس طریقہ پر حق تعالیٰ نے اس کو جاری فرمایا۔ کیونکہ حق تعالیٰ قادر و مقتدر ہونے کے ساتھ حکیم مطلق بھی ہے۔ یہ صحیح ہے لیکن حکیم مطلق کی تعریف یہ نہیں ہے کہ اس کی حکمتوں کو مقیدانِ عقول جزئیہ احاطہ بھی کرلیں۔ لہٰذا ہم اسباب و علل سے قدرتِ الہٰی پر کسی امر کا لزوم نہیں قائم کرسکتے بلکہ ہر شے ہر وقت حضرت حق کے ارادہ و اقتدار کے تحت میں ہے کہ جو چاہے کرے۔" [1]

اپنے مقدمہ میں انہوں نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ کرامات اور صوفیاء کرام کے تصرفات میں ایک بنیادی فرق ہے اور کرامت و تصرف کا تعلق اس روحانی قوت

---

[1] گلشن کرامت از درد کاکوروی صدا ۔

سے ہے جو ساری کائنات پر حکمراں ہے۔ اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں :

" تصرف و کرامت میں عام و خاص کا فرق ہے یعنی کرامت کا صدور بلا ارادہ و با ارادہ دونوں طرح پر ہو سکتا ہے اور تصرف اس کرامت کو کہتے ہیں جو با ارادہ صادر ہو۔ بلا ارادہ صدور کرامت ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس طرح تیز ہوا کے جھونکے میں پڑ کر کوئی چیز گرد آلود ہو جائے یا آگ کے قریب گزرنے سے گرما جائے اسی طرح تاثیر روحی کسی شے پر ضمناً اپنا اثر کر جاتی ہے۔ جس کی خبر بھی بعض اوقات اس کو نہیں ہوتی۔ "[1]

درد کاکوروی نے 'گلشن کرامت' مرتب کر کے دراصل یہی کوشش کی ہے کہ کرامت اور تصرف کے مستند واقعات سپرد قلم ہو جائیں اور یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس دنیا میں پاکیزہ اور برگزیدہ نفوس کی روحانی تاثیر سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایک بہت متوازن کتاب ہے۔ اس کے بیشتر واقعات معتبر حضرات کے روایت کردہ ہیں اور یہ سب ان کے مشاہدات یا ان پر گزری ہوئی واردات کا بیان ہیں۔ ان کی صداقت سے انکار کرنا آسان نہیں ہے۔

درد کاکوروی کے اہم نثری کتابوں میں ایک کتاب "نور وحدت" ہے جو دراصل ایک قلمی فارسی رسالہ " نور وحدت " کا ترجمہ ہے۔ یہ فارسی رسالہ ہندوستان میں سلسلۂ نقشبندیہ کو فروغ دینے والے خواجہ باقی باللہ کے صاحبزادہ شیخ عبداللہ نقشبندی عرف حضرت خواجہ خورد سے منسوب کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کو خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی سے بھی منسوب کیا ہے لیکن عام طور پر محققین کی رائے یہی ہے کہ " نور وحدت " دراصل خواجہ خورد

---

[1] گلشن کرامت از درد کاکوروی ص ۲

کی تحریر ہے۔ بہرحال یہ بہت اہم نوشتہ ہے۔ مصنف نے اس کو بہت شاعرانہ زبان میں لکھا ہے اور اپنے کسی مرید کو مخاطب کرکے تصوف کے نظریات اور تصورات کی وضاحت مؤثر انداز میں کی ہے۔ درد کاکوروی نے اس کے اردو ترجمہ میں اصل کی والہانہ کیفیت بڑی کامیابی سے منتقل کی ہے۔

"سرور وحدت" میں صوفی عبدالغنی نیازی کا مقدمہ شامل ہے۔ وہ خود بھی یہ طے نہیں کرسکے ہیں کہ "نور وحدت" خواجہ خورد کا تالیف کردہ رسالہ ہے یا یہ حضرت چراغ دہلوی کا تالیف کردہ ہے جس کو انہوں نے اپنے خلفاء کے لیے تحریر کیا ہے۔ درد کاکوروی نے دیباچہ میں اسے خواجہ خورد کا تحریر کردہ لکھا ہے۔[1]

یہ رسالہ کسی نے بھی تحریر کیا ہو اور کسی کے لیے بھی تحریر کیا گیا ہو اس سے سارے مسلمانوں بلکہ سارے انسانوں کی فکر و نظر کو خدائے واحد کے وجود پر ایمان کامل ہونے کی تلقین ہوتی ہے۔ یہ رسالہ خدائے واحد پر نہایت دلچسپ پیرایہ میں قلمبند کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت اس طرح اور دوچند سہ چند ہوجاتی ہے کہ اس میں زیادہ زور خدائے واحد پر کامل یقین پر دیا گیا ہے۔ رسالہ کسی سید کو بار بار مخاطب کرکے ایسے پیرائے میں تحریر کیا گیا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے دو لوگ بیٹھے باتیں کررہے ہیں اس لیے اہم ہونے کے ساتھ یہ نہایت دلچسپ بھی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "اے سید عبادت، طاعت اور اذکار و اشغال میں چاہے لاکھوں برس صرف ہوجائیں لیکن اگر کوئی شخص توحید سے غافل ہے تو وہ معشوق ازل کے وصل سے محروم ہے چاہے اسکو عجیب عجیب کیفیتیں اور حالتیں نادر واقعات باطنی انوار نظر آتے ہیں۔ جب تک صحیح معنوں میں توحید اور عرفان کا زنگ

---

[1] دیباچہ سرور وحدت از درد ص۴

نہ چھپا جائے کچھ نہیں ۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں ؎

سیر زاہد ہر مہے یک سالہ راہ

سیر عارف ہر زماں تا تخت شاہ ۔ ،، [1]

غرض اسی طرح سید کو مخاطب کر کے تصوف کے مسائل اور وحدت الوجود کے فلسفہ کو سمجھانے کی سعی بلیغ اس رسالہ میں کی گئی۔ اس کتاب میں درد نے نثر میں حمد اور پھر نعت بھی سپرد قلم کی ہے۔ دونوں میں بڑی شاعرانہ زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ آخر میں انھوں نے اپنی چند منظومات بھی شامل کی ہیں۔ ایک نظم "عرفانی وصال ہجر" ہے جو درد کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ اس نظم سے ایک شعر پیش ہے ؎

حق کی ہیں شائیں مختلف سارے جہان کیلئے

پرچہ ہے امتحان کا سب کو ملا الگ الگ

دوسری نظم توحیدی نغمہ مخمس میں ہے اس خمسہ سے ایک بند ملاحظہ ہو:

تجھی کو ہر اک چیز میں میں نے پایا

کہ ہر شئے میں ہے تو نے جلوہ دکھایا

تو ہی مجھ میں ہے روح بن کر سمایا

مجھے اپنی صورت پہ تو نے بنایا

مرا تن ترا تن، ترا من مرا من

حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کی فارسی غزل پر درد نے اُردو اور فارسی دونوں میں تضمین کی ہے۔ درد کی فارسی تضمین ان کی فارسی زبان میں قدرت شعرگوئی کی مظہر ہے۔ دونوں تضمینوں سے ایک ایک بند

---

[1] سرور وحدت ۔ درد کاکوروی ص ۴۸ ۔

ملاحظہ فرمائیں:

ہے ذات احد شاہد مشہود ہوئے احمد — یوں درد حقیقت کا ہم پر ہے کھلا مقصد
جب حسن ازل کا ہے یہ عشق بنا مشہد — در سینۂ نصیرالدین جز عشق نمی گنجد
ایں طرفہ تماشا بیں دریا بہ حباب اندر

ہر پردۂ تاریکی نی الجملہ بروں گردد — در قلب جمال او خود رقص کناں تابد
اے درد چوں حسن او صد ظرف حسیں بخشد — در سینۂ نصیرالدین جز عشق نمی گنجد
ایں طرفہ تماشا بیں دریا بہ حباب اندر

"نور وحدت" کے ترجمہ میں درد کاکوروی پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں اس لیے کہ ایک طرف وہ فارسی زبان پر ماہرانہ قدرت رکھتے تھے اور دوسرے تصوف کی زبان، اصطلاحوں اور وجودی فلسفہ سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ اس لیے یہ ترجمہ صرف ترجمہ نہیں رہا ہے بلکہ اردو میں ایک صوفیانہ تخلیق کے درجہ پر پہونچ گیا ہے۔

خانقاہی نظام میں ایک اہم روایت سماع کی بھی ہے۔ لیکن سماع کی حقیقت پر اختلاف رہا ہے۔ علما، کے ایک طبقہ نے سماع کو اس لیے مسترد کیا ہے کہ یہ غنا (گانا) ہے۔ درد کاکوروی نے "سماع کی حقیقت قرآن وحدیث کی روشنی میں" کے نام سے ایک کتاب اس مسئلہ پر سپرد قلم کی ہے اس کتاب میں انہوں نے سب سے پہلے ثابت کیا ہے کہ مطلق غنا بھی ناجائز نہیں ہے۔ انہوں نے سیرت رسولؐ سے بھی دلیلیں دی ہیں اور صحابۂ کرامؓ کے طرز عمل سے بھی ایسے صحابہ کرامؓ اور تابعین کے اسمائے گرامی درج کیے ہیں جو سماع کے قائل تھے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد حنفی کے ساتھ ساتھ انہوں نے امام غزالی، مولانا روم، حضرت جنید

بغدادی، محی الدین ابن عربی، شہاب الدین سہروردی اور سید عبدالقادر جیلانی کے حوالے سے سماع کا جواز ثابت کیا ہے۔ پھر چشتی، قادری اور نقشبندی مسلک کے ان بزرگوں کے حوالے پیش کیے ہیں جو سماع کو جائز سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ درد کاکوروی نے جو بھی لکھا ہے اپنے مسلک کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن یہ ترجمانی سنجیدہ اور علمی انداز میں کی گئی ہے۔ انہوں نے سماع کے متعلق نہایت متوازن رویہ اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

" قدیم زمانہ میں راگ کی تین شرطیں تھیں۔ (۱) اخوان (۲) زمان (۳) مکان۔

اخوان :- اس لفظ سے اپنے ہم مذاق لوگ مراد ہیں۔

زمان :- اس لفظ سے وہ وقت مراد ہے جو نماز وغیرہ کا نہ ہو۔

مکان :- اس لفظ سے وہ جگہ مراد ہے جو عام لوگوں سے بالکل الگ ہو ۔ اگر اب بھی ان تینوں باتوں کی پابندی ہو تو سبحان اللہ۔ حضرت مولانا عزیز اللہ شاہ صاحب صفی پوری اپنی کتاب "عقائد العزیز" میں تحریر فرماتے ہیں کہ یہ شرطیں اس زمانہ میں پوری ہونا دشوار ہیں۔ اگر سختی برتی جائے تو فساد کا اندیشہ ہے۔ ایک بار فقیر اپنے پیر و مرشد خادم صفی محمد کے حضور میں حاضر تھا اور حسب الارشاد کتاب پڑھ رہا تھا اس میں بھی یہی شرطیں لکھی تھیں اور یہ بھی تھا کہ وہاں عورتیں نہ ہوں۔ فقیر کے دل میں آیا کہ اب یہ شرطیں نہیں پائی جاتیں۔ فوراً میرے مرشد نے فرمایا کہ ہم نے اپنے مرشد سے اس کی بابت عرض کیا تھا اس پر انہوں نے فرمایا کہ اگلوں کو سہل تھا ہم کو مشکل ہے۔ مگر ہم کسی شرط کے نہ ہونے سے اپنے پیروں کے طریقے کو نہ چھوڑ دیں گے۔ اور جب

ہم نے دل کو سب سے الگ کرلیا اور خدا کی طرف متوجہ ہوگئے تو سب شرطیں پوری ہوگئیں۔،، [1]

سماع کا مسئلہ بہر حال ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ اور اس کے سلسلہ میں مخالف اور موافق دلائل دونوں موجود ہیں۔ راقم الحروف اس سلسلہ میں کوئی موقف اختیار نہیں کرنا چاہتا ہے۔ میں نے صرف درد صاحب کے نقطہ نظر کو پیش کر دیا ہے۔ ان کی اس کتاب کی اشاعت کے بعد ماہنامہ فاران کراچی میں اس کے مدیر جناب ماہرالقادری مرحوم نے سماع کے جواز پر اعتراض کرتے ہوئے جون ۱۹۵۶ء میں کتاب پر تبصرہ کیا تھا۔ درد کاکوروی نے اعتراضات کے جواب میں "قوالی اور خدا اور رسول کی یاد" کے نام سے ایک کتابچہ تحریر کیا جس میں انہوں نے سماع کے جواز کے تمام دلائل کو پھر ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی ساری بحث اس نکتہ پر ختم کی ہے کہ:

"جس کتاب میں جہاں سماع کا تذکرہ آیا ہے وہاں غنا اور مزامیر دو لفظ بہت آتے ہیں۔ آئیے دیکھیں کہ لغت کے لحاظ سے آخر ان دونوں کے کیا معنی ہیں۔ بڑے بڑے لغات کو کم علم لوگ کیا دیکھ سکتے ہیں اس لیے چھوٹی کتاب لغات کشوری کا حوالہ کافی ہے۔ دیکھ لیجئے اس میں لکھا ہے کہ غنا راگ اور نغمے کو کہتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے مطبوعہ رسالہ سماع و مزامیر (ترجمہ وحیدالدین سلیم پانی پتی) کے صفحہ ۱۰۳ میں ہے معازف ان باجوں کو کہتے ہیں جو ہاتھ یا لکڑی سے بجائے جائیں۔ مثلاً دف،

---

[1] سماع کی حقیقت قرآن و حدیث کی روشنی میں۔ از درد ص ۴۷-۴۶

ڈھول، نقارہ، طنبورہ وغیرہ اور مزامیر ان باجوں کو کہتے ہیں
جو پھونک کر بجائے جاتے ہیں مثلاً بانسری، نفیری، شہنائی۔
غنا ایسے راگ کو کہتے ہیں جو خوشی پیدا کرے اور سریلی
ہو۔ عربی قاعدے سے غنا کا لفظ یتغنّ کے صیغہ سے حدیث شریف میں
آیا ہے اسی بنا پر حضور سرور کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں
(بخاری شریف) لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ۔ (ترجمہ)
وہ ہم میں سے نہیں جو قرآن کو غنا سے نہ پڑھے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے رسالہ سماع کا مولانا
وحید الدین پانی پتی نے جو ترجمہ کیا ہے اس کے ص ۱۰۹ میں اسی حدیث
کے متعلق یہ عبارت ہے:

ایک حدیث میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ جو شخص قرآن کو
گا کر نہیں پڑھتا وہ ہماری امت میں نہیں۔
مطلب یہ کہ جو گا کر قرآن شریف نہ پڑھے وہ امت سے خارج
ہے۔ قرآن شریف کو گا کر پڑھنے کو تجوید بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ قرآن
شریف ایسی چیز ہے جس کے پڑھنے سے بار بار وجد آتا ہے۔" [۱]

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بحث کا فیصلہ بہر حال نہ ہو سکا۔ ماہر القادری
اور درد کاکوروی اپنی اپنی بات پر قائم رہے اور شاید سماع اور مزامیر کے بارے
میں نقطۂ نظر کا یہ اختلاف ہمیشہ برقرار رہے گا۔

درد کاکوروی نے اوراد و وظائف کی بہت مشہور کتاب 'دلائل الخیرات'
کا انتخاب بھی اسی نام سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے اور اس کا ترجمہ بھی کیا ہے

---

[۱] قوالی اور خدا اور رسول کی یاد از درد کاکوروی۔ صفحہ ۲۵-۲۶۔

دلائل الخیرات' نویں صدی ہجری کی یادگار ہے۔ یہ شیخ عبداللہ محمد بن سلمان بن ابی بکر الجزولی کی تصنیف ہے۔ جس میں انہوں نے درود شریف کو موضوع بنا کر عربی میں درود لکھے ہیں۔ ساری اسلامی دنیا میں 'دلائل الخیرات' رائج ہے اور خانقاہی نظام میں اس کو بڑی مقبولیت کا شرف حاصل ہے۔ درد کاکوروی نے اپنے انتخاب و ترجمے کے بارے میں خود لکھا ہے کہ:

" اردو زبان میں آج تک درود شریف کے متعلق ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کو دلائل الخیرات کا عطر سمجھیے۔ اس کتاب میں نہایت مختصر اور آسان درود شریف لکھے گئے ہیں۔ شروع میں بزبان اردو درود شریف کا راز اور حکمت وغیرہ بیان کی گئی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور دن کی فضیلت کے ساتھ درود شریف کی منزلیں لکھی گئی ہیں۔ غرض یہ کتاب ہر حیثیت سے مختصر مگر جامع ہے۔ " [1]

آگے چل کر وہ درود شریف کی اہمیت وافادیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

" قرآن شریف کی تلاوت سب سے زیادہ مقدم ہے اس کے بعد حدیث شریف پڑھنے کا نمبر ہے (صحیح بخاری، موطا، ابن ماجہ، ترمذی مشکوٰۃ وغیرہ یہ حدیث کی کتابیں ہیں) اس کے بعد درود شریف پڑھنے کا نمبر ہے، اسی کی فضیلت میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، ہر دن کے متعلق درود شریف کی منزلیں بھی ہیں۔ " [2]

اس کتاب میں مولانا اقبال الدین احمد اور مولانا نذر عباس صاحب کی

---

[1] دلائل الخیرات از درد کاکوروی ص ۵۔

[2] " " " ص ۹

تقریظیں بھی شامل ہیں۔ دلائل الخیرات کے اردو میں کافی ترجمے اور انتخاب ہو چکے ہیں۔ لیکن درد کاکوروی نے بہت مفید اور روزانہ کے ورد کے لیے یہ انتخاب کیا ہے جس میں اصل عربی عبارت کا سلیس ترجمہ بھی شامل ہے۔ کتاب کے آخر میں درود شریف کے بعد مجرب اعمال بھی کتاب میں بیان کیے ہیں۔ قرآن شریف کے حروف مقطعات پر مختلف اشعار بھی لکھے ہیں جو کتاب میں شامل ہیں۔

درد کاکوروی نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے پیش نظر بچوں کو خدا و رسول کی عظمت سے واقف کرانے کی غرض سے بہت آسان زبان میں "اللہ میاں اور ہمارے رسول" نام سے ایک کتاب ترتیب دی ہے جس میں مختلف بچوں کے نام سے عیلاد میلاد النبی کے موقع پر سیرت پاک کے اہم واقعات بیان کیے ہیں اور بچوں ہی کی زبان سے نعت گوئی کرائی ہے۔ یہ کتاب بچوں میں اسلامی شعور بیدار کرنے کے لیے بڑی مفید اور کار آمد ہے۔ بچوں کے لیے اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کو آسان زبان میں پیش کرنے کا خیال ان کو ابتدا ہی سے تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۳۴۲ھ میں "بچوں کی تربیت پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو اسلامی خلافت جنتری میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے یہ لکھا تھا کہ:

"بچوں کو جھوٹی کہانیاں اور جھوٹے قصے سنائے جاتے ہیں یہ بھی برا طرز تعلیم ہے۔ اگر اسلامی تاریخی قصے چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھائے جائیں تو یہ بچے آئندہ اسلامی دنیا کے لیے نہایت مفید اور کار آمد ثابت ہوں گے۔" [1]

انہوں نے اپنے مذکورہ خیال کے پیش نظر ہی بچوں کے لیے یہ کتاب

---

[1] بچوں کی تربیت پر ایک نظر۔ از درد۔ اسلامی خلافت جنتری ۱۳۴۲ھ ص ۴۷۔

ترتیب دی ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ مختلف بچّے سوال کرتے ہیں اور بچّے ہی اس کا جواب دیتے ہیں۔ اس کتاب میں بچوں کو ماں باپ کی اہمیت، اسلام کے آداب، اسلام سے پہلے دنیا کی حالت، الہامی کتابیں، آخری رسول کی ولادت، عرب میں بکریاں چرانے کا دستور، تجارت، حرا کا غار، کعبہ اور حجر اسود، حضرت عمرؓ کی اسلام میں شمولیت، کھانا کھانے کا اسلامی طریقہ، معراج شریف وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت اور اسلامی تاریخ سے واقفیت کے لحاظ سے یہ کتاب بہت اہم، مفید اور کارآمد ہے۔

درد کاکوروی نے مذہبی موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے علم و یقین کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی بے مقصد تحریر نہیں لکھی۔ شاعری کی طرح ان کی نثر نگاری بھی واضح مقاصد کیلئے وقف ہے۔ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کا پوری طرح حق ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس عمیق مطالعہ اور وسیع مشاہدہ تھا جس کی بنیاد پر وہ ہر سطح پر کامیابی سے ہمکنار نظر آتے ہیں۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین ہوں یا سوانحی اور تاریخی، مذہبی موضوعات ہوں یا صوفیانہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا کر کے قاری کے علم میں اضافہ کرتے ہیں اور اس کے ذہن کی تربیت کرتے ہیں۔

--

بابِ ہفتم

اردو ادب میں درد کاکوروی کی
قدر و قیمت کا تعیّن

میر نذر علی درد کاکوروی بیک وقت کئی حیثیتوں کے مالک تھے۔ وہ نثر نگار بھی تھے اور شاعر بھی، مؤرخ بھی تھے اور محقق بھی۔ تصوف کے نظریاتی پس منظر سے ان کی واقفیت بہت وسیع تھی اور چونکہ بزرگوں کی تعلیمات پر ان کی گہری نگاہ تھی وہ خود بھی ایک صوفی تھے اس لیے ان کی شاعری میں ایسی انفرادیت ہے جو ان کے دوسرے ہمعصروں سے ان کو ممتاز کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں مجازی اظہار بہت کم ہے اور ان کی شاعری اس حقیقت کی آئینہ دار ہے جس کو صوفی حسن ازل کہتے ہیں اور آب و گل کی دنیا میں ہر حسن و خوبی میں اس کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ اپنی غزلوں میں درد کاکوروی نے یہی عارفانہ رنگ ظاہر کیا ہے اور بیسویں صدی کی اردو غزل گوئی میں یہ رنگ ان کے معاصرین شعرا میں صرف اصغر گونڈوی کے پاس نظر آتا ہے لیکن اصغر گونڈوی کی غزل گوئی پر تغزل حاوی ہے۔ درد کاکوروی نے اپنی غزل گوئی میں غزل کے روایتی مضامین سے بڑی حد تک دامن بچا کر غزل کو صرف عارفانہ شاعری بنانے کا کام کیا ہے۔ لکھنؤ کی زبان و بیان کی پوری پابندی کرنے کے باوجود ان کے پاس لکھنوی غزل گوئی کا وہ اثر نہیں ملتا جس کو لکھنؤ کی شاعری میں نمایاں سمجھا جاتا ہے۔ درد کاکوروی نے اپنی غزلوں میں معاملہ بندی اور جسمانی عشق سے گریز کیا ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں عروضی اور فنی تقاضوں کو پوری طرح ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ انہوں نے لکھنؤ کے اہلِ سخن کو ہمیشہ معیار بنایا ہے اس لیے وہ درحقیقت دبستانِ لکھنؤ کی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔

درد کاکوروی نے شاعری کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے بڑی تعداد میں نظمیں کہی ہیں جن میں رومانی نظمیں بھی ہیں اور صوفیانہ نظمیں بھی۔ سماجی مسائل پر ان کی متعدد منظومات ہیں۔ جب انہوں نے ہوش کی آنکھیں کھولی تھیں تو بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں میں نظم گوئی ایک نئی چیز تھی اور مغربی ادب سے براہِ راست اثر قبول کرنے کی شعوری تحریک کا نتیجہ تھی۔ خود کاکوری میں نادر علی خاں نادر کاکوروی اس جدید ادبی تحریک کے ایک بڑے ستون تھے اور وہ مغربی شاعری کو اردو دنیا میں اپنے ترجموں (منظوم) کے ذریعہ رائج کر رہے تھے۔ درد کاکوروی کی تعلیم و تربیت خالص مشرقی تھی لیکن انہوں نے بہت ابتداء سے شاعری کی دنیا میں اس بڑی تبدیلی اور انقلاب کو قبول کر لیا تھا اور اس بات پر زور دیا تھا کہ شاعری کو صرف غزل گوئی تک محدود نہ رکھا جائے۔ چنانچہ خود انہوں نے نظم گوئی پر خصوصی توجہ دی۔ ان کی شاعری میں نظموں کا ایک بڑا حصہ شامل ہے۔ ان میں خالص رومانی موضوعات، مناظر قدرت اور زندگی کے مسائل پر جو نظمیں ہیں ان میں فکر کے عناصر زیادہ غالب ہیں۔ اس کے باوجود ان نظموں کی زبان میں اس شعریت کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے جو ایشیائی شاعری کا مزاج ہے۔ درد کاکوروی فارسی زبان و ادب سے بھی غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے دو مجموعوں میں قندِ پارسی کے عنوان سے تقریباً تیس فارسی غزلیں یادگار چھوڑی ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی میں حمد و نعت، منقبت بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ تضمین نگاری میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے فارسی کے مشہور شاعروں اور صوفی بزرگوں کی نعتیہ شاعری اور غزل گوئی کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ فارسی کی نعتوں میں اور عارفانہ غزلوں پر انہوں نے خمسوں کی شکل میں جو تضمینیں کہی ہیں وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ان کی قادر الکلامی کی مظہر ہیں۔

انہوں نے جن اشعار پر تضمینیں کی ہیں ان کے مفہوم اور ان کی روح کو مجروح نہیں ہونے دیا بلکہ اصل شعر کے جذبے میں ڈوب کر اسی پر اپنے مصرعے لگائے ہیں۔ ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے درد کاکوروی ایک مذہبی شاعر بھی تھے انہوں نے حمد و منقبت اور نعتیہ شاعری کو بڑی عقیدت اور بڑے احترام سے اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کے حمدیہ اشعار پر وحدت الوجود کا بے حد اثر ہے اور ان میں بڑی سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ نعتیہ شاعری میں بھی وہ جذبات اور احساسات پر قابو رکھنے کے باوجود اپنے سوز و گداز اور عاشقانہ کیفیت کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتے ہیں۔ ان کی ساری نعتیہ شاعری میں والہانہ عشق کی کارفرمائی نظر آتی ہے یہ ان کے دل کی آواز ہے۔ اسی جذبہ کے تحت انہوں نے سیرتِ پاک کو کم پڑھے لکھے لوگوں اور بچوں کے لیے بھی آسان زبان میں سپردِ قلم کیا ہے۔

نصف صدی سے زیادہ کی سرگرم ادبی زندگی میں درد کاکوروی نے اردو زبان اور شاعری کے کئی اہم مرحلوں کا ذاتی تجربہ کیا اور زمانہ کا ایک بڑا انقلاب دیکھا جس نے زبان، تہذیب اور شعر و ادب کی ساری دنیا ہی درہم برہم کر دی لیکن وہ اردو زبان اور تہذیب کے دورِ شباب میں پروان چڑھنے والے فنکار تھے۔ وہ اپنے زمانہ میں نمائندہ ادبی رسالوں میں جگہ پاتے تھے۔ ہندوستان کے معتبر اور مستند رسائل مثلاً نیرنگِ خیال، عالمگیر، آستانہ، مولوی، ہمایوں، ساقی، الناظر، غالب، نگار، پیمانہ وغیرہ میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین بھی مذکورہ رسائل میں شائع ہوئے ہیں جن کی تعداد تقریباً بیس ہے۔

مذکورہ رسائل میں درد کا کلام جن شعراء کے کلام کے ساتھ شائع ہوتا تھا ان میں جلیل مانک پوری، عزیز لکھنوی، وحشت کلکتوی، سراج لکھنوی، احسان دانش

یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی، ریاض خیرآبادی، صفدر مرزاپوری، ابراحسنی
گنوری، ثاقب کانپوری، شاد عظیم آبادی، نوح ناروی، مخمور اکبرآبادی
ماہرالقادری، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، محوی
صدیقی، فراق گورکھپوری، روش صدیقی، اور سرشار کسمنڈوی، شامل ہیں۔
اس دور میں درد کاکوری ہندوستان کے ان مستند شاعروں کی صف میں شامل
تھے جو اپنی زبان وتہذیب، فکر اور فن کے نمائندہ تصور کیے جاتے تھے۔ درد
کاکوری کی شاعری کے متعدد مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئے۔
ان میں غزلوں، نظموں کے ساتھ فارسی کلام بھی موجود ہے۔ میکدۂ معنی، جذبات
درد اور متاع درد میں غزلیں، نظمیں، رباعیات، قطعات تاریخ اور فارسی
کلام شامل ہے۔ درد کا درماں اور جام کوثر نعتوں پر مشتمل ہیں۔ صوفیانہ
موضوعات کو "صوفیانہ نظمیں" میں یکجا کیا گیا ہے۔ قصیدہ بردہ شریف کا منظوم
ترجمہ مولانا روم کی مثنوی کی طرز میں اور دو کتابچے مناجات مکرم اور مناجات آہ
سرد بھی ہیں جس میں ان کی طویل مناجات ہے۔ انھوں نے اردو اور فارسی
کے مختلف شعراء کی عارفانہ غزلوں اور نعتیہ کلام پر تضمین کی ہیں جو کتابی شکل میں
خمسہ جات قوالی کے نام سے شائع ہوئی ہیں اور سماع کی محفلوں میں گائی جاتی
ہیں۔

درد نے شاعری کی جس صنف پر طبع آزمائی کی ہے اس کا پورا حق ادا کر دیا
ہے۔ وہ اپنی شاعری میں زبان وبیان کا خاص خیال رکھتے ہیں اور ایسا انداز اختیار
کرتے ہیں جس سے کوئی بات مبہم یا گنجلک نہ ہو جائے۔ وہ دل سے نکلی ہوئی
بات بالکل سادہ، صاف، رواں، دلکش اور پراثر زبان میں کہتے ہیں۔ زبان
وبیان کی حد تک ان کے اوپر لکھنؤ کے اہل زبان کے اثرات بھی پوری طرح نمایاں
ہیں اور فارسی شاعری کے اثرات بھی جو سلاست، روانی اور شیرینی میں اپنی مثال

نہیں رکھتے۔ بیسویں صدی میں فارسی شاعری کی بہترین روایتوں سے استفادہ کرنے کی روایت تقریباً مفقود ہو گئی ہے۔ حالانکہ اردو غزل کے تمام بڑے خیالوں نے اپنا وجدان فارسی غزل ہی سے حاصل کیا ہے۔ درد کاکوروی کی یہ بھی اہم انفرادیت ہے کہ انہوں نے اس زبان میں فارسی شاعری سے اپنا رشتہ برقرار رکھا۔

درد کاکوروی کامیاب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب نثر نگار بھی تھے انہوں نے نثر میں علمی، ادبی اور تاریخی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھے۔ سوانحی تحریریں یادگار چھوڑیں اور مذہبی اور صوفیانہ موضوعات پر تو ان کو کامل دستگاہ حاصل تھی۔ ان کی نثر سے ان کے غور و فکر اور ان کی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ سنجیدہ علمی موضوعات کو بھی بڑی کامیابی سے اور آسان زبان میں سپرد قلم کرتے ہیں۔ ان کے مضامین اور کتابیں ان کے تحقیقی شعور اور تنقیدی بصیرت کی غماز ہیں۔ تصوف اور وحدت الوجود کے دفاع میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی وضاحت سے تصوف کی ترجمانی کرتا ہے۔ متنازعہ مسائل پر انہوں نے کسی تلخی کے بغیر قلم اٹھایا ہے اور صرف اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں مناظرانہ صورتحال نہیں پائی جاتی۔ اپنے مخصوص مذہبی عقائد اور مسلک کی نمائندگی میں بھی وہ معتدل اور متوازن راہ اختیار کرتے ہیں اور تخریبی نکتہ چینی سے پرہیز کرتے ہیں۔

درد کی تحقیقی اور تنقیدی کتابوں میں 'اردو اور شمالی ہند'، 'امیر خسرو اور ان کا اردو کلام' اور 'اردو کا ابتدائی دور' خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ خواجہ حافظ شیرازی شوق قدوائی، امیر حسن دہلوی، امیر خسرو ایک اردو شاعر کی حیثیت سے، شاعری مذہبی نقطۂ نظر سے، مثنوی زلالی خوانساری، اور رہم اور ہماری شاعری موضوعات پر ان کے مضامین قابل ذکر ہیں۔ اردو نثر کی پہلی کتاب کی حیثیت سے اشرف

جہانگیر سمنانی" کے" رسالۂ معرفت" کو اردو دنیا سے روشناس کرانا تو ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ لیکن اس کتاب کا وجود عدم اشاعت کی وجہ سے آج تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچ سکا ہے پھر بھی اس کے وجود سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

درد کاکوروی نے جو سوانحی اور تاریخی مضامین وکتب سپرد قلم کیے ہیں ان میں بہت شائستہ زبان اور عقیدت کا رنگ غالب ہے۔ ان کی ایک کتاب بارہ امام ہے جس میں انہوں نے بارہ اماموں کے حالات و تعلیمات کو پیش کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تمام حضرات روحانی دنیا کے سربراہ تھے۔ حالات اولیاء اللہ میں انہوں نے بزرگان دین کے اثرانگیز واقعات رقم کیے ہیں۔ حالات ازواج مطہرات، سیرت قادری اور حالات شاہ فخر اورنگ آبادی کا موضوع بھی سیرت، تاریخ اور سوانح ہے۔ ان کی ایک کتاب عاشورا ہے جس میں یوم عاشورا کی تاریخ اور فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ درد کاکوروی کو تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے مضمون فن تاریخ نویسی میں انہوں نے تاریخ کے عمیق مطالعہ پر زور دیا ہے۔

مذہب اور تصوف تو درد کاکوروی کے خاص اور محبوب موضوع تھے۔ دونوں کے بارے میں ان کی معلومات بھی ان کے گہرے مطالعہ اور غور وفکر کی شہادت دیتی ہے۔ "دلائل الخیرات" انہوں نے عربی سے اور" سرور وحدت" فارسی سے اردو میں ترجمے کیے ہیں۔ قوالی اور سماع کے متنازعہ مسئلہ پر انہوں نے ایک کتاب "سماع کی حقیقت" پر قرآن اور حدیث کی روشنی میں نظر ڈالی اور غنا کا جواز ثابت کیا۔ اس سلسلہ میں ان کی دوسری کتاب" قوالی اور خدا اور رسول کی یاد" ہے۔ جس میں انہوں نے اس پہلو پر زور دیا ہے کہ قوالی نہ تو موسیقی کی محفل ہے اور نہ شعر وسخن کی مجلس بلکہ یہ دل و دماغ کو تربیت دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ تصوف کے کئی پہلو ان کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی سرگرم اور مصروف زندگی میں نثر ونظم کی شکل میں جو کچھ لکھا ہے وہ تقریباً چالیس مطبوعہ کتابوں کی شکل

میں ہے۔ ان کے تقریباً پچیس مضامین مختلف رسائل میں بکھرے ہیں۔

نثر و نظم کے اس سارے ذخیرہ کا جو جائزہ راقم الحروف نے اس مقالہ میں لیا ہے، وہ درد کاکوروی کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ ہمارے بزرگوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جس نے قدیم مشرقی تعلیم پائی تھی۔ عربی اور فارسی شعر و ادب سے پوری طرح واقف تھی۔ اپنے ماضی اور اپنی تہذیب پر اس کو فخر تھا اس کے باوجود وہ بیسویں صدی کی نئی روشنی کو بالکل مسترد نہیں کرتی تھی۔ درد نے اردو زبان و ادب کو اپنے اظہار کا ذریعہ اسی لیے بنایا تھا کہ بیسویں صدی میں اردو اس تہذیب کی نمائندہ زبان بن چکی تھی جس نے درد کاکوروی جیسے شخص کو جنم دیا تھا وہ ماضی اور حال کے درمیان وابستگی پیدا کرنے والی شخصیتوں میں تھے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا اس کی روشنی میں بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایوانِ اردو ادب میں درد کاکوروی کو ممتاز اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ اردو زبان و ادب اُن کے علمی، ادبی اور شعری کارناموں کو فراموش نہیں کر سکتے اور مستقبل میں اُن کی نگارشات / تخلیقات کی قدر و قیمت اس لیے اور زیادہ ہو جائے گی کہ ہمارے قدیم ادب سے استفادہ کرنے والوں کی نئی نسل کے پاس وہ علم، وہ شعور اور وہ نظر نہیں ہو گی جو درد کاکوروی اور ان کے ہمعصر بزرگوں کے پاس تھی۔

--

کتابیات

۱۔ اچھے اعتقاد — درد کاکوروی
۲۔ اُردو ادب کی تاریخ — ڈاکٹر نسیم قریشی
۳۔ اُردو زبان و ادب — ڈاکٹر مسعود حسین خاں
۴۔ اُردو اور شمالی ہند — درد کاکوروی
۵۔ اُردو کی نثری داستانیں — وقار عظیم
۶۔ اصناف ادب اُردو — قمر رئیس ۔ خلیق انجم
۷۔ اسلامی خلافت جنتری ۱۳۴۲ھ — لکھنؤ
۸۔ اللہ میاں اور ہمارے رسول — درد کاکوروی
۹۔ اقبال کامل — مولانا عبدالسلام ندوی
۱۰۔ امیر خسرو اور ان کا اردو کلام — درد کاکوروی
۱۱۔ آہ سرد — درد کاکوروی
۱۲۔ انتخاب کلام خسرو کاکوروی — ڈاکٹر مسعود انور علوی
۱۳۔ بارہ امام — درد کاکوروی
۱۴۔ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب — مرزا جعفر حسین
۱۵۔ پاکستان اور ہندوستان — عبدالقدوس ہاشمی
۱۶۔ پاکستان اور اس کا قیام اور ابتدائی حالات — محمد حمایت الحسن
۱۷۔ تحریک خلافت — قاضی عدیل عباسی
۱۸۔ تاریخ اودھ — حکیم نجم الغنی

۱۹۔ تاریخ تحریک آزادی ہند — ڈاکٹر تاراچند رستوگی

۲۰۔ تحقیق کا فن — پروفیسر گیان چند

۲۱۔ تذکرہ شعراء اترپردیش (جلد چہارم) — عرفان عباسی

۲۲۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری — شاہ علی حیدر قلندر

۲۳۔ تلامذۂ غالب — مالک رام

۲۴۔ تجلیات برق — شارب کوثر علوی

۲۵۔ جام کوثر — درد کاکوروی

۲۶۔ جدید غزل — رشید احمد صدیقی

۲۷۔ جدید ہندوستان — این، سی، ای، آر، ٹی

۲۸۔ جذبات درد — درد کاکوروی

۲۹۔ خطبات خلافت — مرتبہ پروفیسر محمود الٰہی

۳۰۔ خمسہ جات قوالی — درد کاکوروی

۳۱۔ داستان تاریخ اردو — حامد حسن قادری

۳۲۔ درد کا درماں — درد کاکوروی

۳۳۔ دردِ جگر — درد کاکوروی

۳۴۔ درود شریف اور اس کے فائدے — درد کاکوروی

۳۵۔ دلائل الخیرات — درد کاکوروی

۳۶۔ دو ادبی اسکول — علی جواد زیدی

۳۷۔ دلی کا دبستان شاعری — پروفیسر نورالحسن ہاشمی

۳۸۔ رواں اناوی حیات و کارنامے — ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

۳۹۔ سخنوران کاکوری — نثار احمد علوی

۴۰۔ سرور وحدت — درد کاکوروی

	کتاب	مصنف
۴۱-	سماع کی حقیقت	درد کاکوروی
۴۲-	سیرت سرور کائناتؐ	"
۴۳-	سیرت صدیقؓ	"
۴۴-	سیرت عمرؓ	"
۴۵-	سیرت عثمانؓ	"
۴۶-	سیرت قادری	"
۴۷-	شمالی ہند کی نثری داستانیں	پروفیسر گیان چند جین
۴۸-	صداقت حقیقت سماع	درد کاکوروی
۴۹-	صحیفۂ تواریخ	کوکب القادری
۵۰-	صوفیانہ نظمیں	درد کاکوروی
۵۱-	عاشورا	درد کاکوروی
۵۲-	غالب کے خطوط	خلیق انجم
۵۳-	غزل اور مطالعۂ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی
۵۴-	فسانۂ اعجاز	عابد علی خاں فریاد، مرتبہ نورالحسن ہاشمی
۵۵-	فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور
۵۶-	قوالی اور خدا و رسول کی یاد	درد کاکوروی
۵۷-	قصیدہ بردہ شریف	"
۵۸-	کلیات نعت محسن	مرتبہ نورالحسن نیر
۵۹-	گذشتہ لکھنؤ	عبدالحلیم شرر
۶۰-	گلشن کرامت	درد کاکوروی
۶۱-	گلزار	ولی الحق انصاری
۶۲-	لکھنؤ کی ادبی میراث	ڈاکٹر صفدر حسین

۶۳۔	لکھنؤ کی تہذیبی میراث	ڈاکٹر صفدر حسین
۶۴۔	لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
۶۵۔	متاع درد	درد کاکوروی
۶۶۔	مجموعہ مختصر احادیث	" "
۶۷۔	مطالعہ امیر مینائی	ڈاکٹر ابومحمد سحر
۶۸۔	مرقومات بے مثال	درد کاکوروی
۶۹۔	ملفوظات فخر نظامی	" "
۷۰۔	مناجات مکرم	" "
۷۱۔	منتخب التواریخ	عبدالقادر بدایونی
۷۲۔	منظوم شجرے	درد کاکوروی
۷۳۔	میکدۂ معنی	" "
۷۴۔	میلاد پیغمبر	" "
۷۵۔	ناسخ	پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی
۷۶۔	نفحات النسیم فی تحقیق اولاد ملا عبدالکریم	مولوی سمی علی علوی
۷۷۔	یادگار انیس	امیر احمد علوی
۷۸۔	یادگار شرر	ارتضیٰ علی شرر
۷۹۔	یاد وطن	اعجاز علوی کاکوروی
۸۰۔	جذبات نادر کاکوروی	نادر کاکوروی
۸۱۔	جنتی دو پھول	درد کاکوروی
۸۲۔	حالات اولیاء اللہ	" "
۸۳۔	حالات حضرت فخر	" "

رسائل

عالمگیر (لاہور) اپریل ۱۹۲۸ء، جولائی ۱۹۲۸ء، اکتوبر ۱۹۲۸ء
خاص نمبر ۱۹۲۷ء، فروری ۱۹۲۹ء، مئی ۱۹۳۱ء
خاص نمبر ۱۹۳۱ء۔

نگار (لکھنؤ) دسمبر ۱۹۲۵ء، اپریل ۱۹۵۵ء۔
(اصناف سخن نمبر) ۱۹۵۷ء

کاکوری اخبار ۱۵؍جولائی ۱۹۳۱ء، یکم دسمبر ۱۹۶۲ء، ۱۶؍جولائی ۱۹۳۱ء

پیمانہ (آگرہ) دسمبر ۱۹۳۹ء

غالب (آگرہ) اپریل ۱۹۲۹ء

ہفت روزہ قندیل ۲۹؍جون ۱۹۵۸ء۔

قومی آواز لکھنؤ ۱۷؍اکتوبر ۱۹۵۵ء

تعمیر انسانیت اگست تا دسمبر ۱۹۵۸ء

ذوالقرنین (بدایوں) ۲۸؍فروری ۱۹۵۹ء۔

مُصنف ایک نظر میں

نام	فرقان علی سلمانی
تخلص	مخمورؔ کاکوروی
تاریخ پیدائش	۱۷؍ جولائی ۱۹۵۹ء
والد	جناب سبحان علی سلمانی (متوفی ۵؍ جنوری ۱۹۷۹ء)
ابتدائی تعلیم	مدرسہ اسلامیہ جھنجھری روضہ، کاکوری، لکھنؤ
امتحانات جامعہ اردو	ادیب (۱۹۷۶ء) ادیب ماہر (۱۹۷۷ء) ادیب کامل (۱۹۷۸ء)
ثانوی تعلیم	ہائی اسکول (۱۹۸۰ء) انٹرمیڈیٹ (۱۹۸۲ء) (پرائیویٹ)
بی۔ اے	شیعہ ڈگری کالج، لکھنؤ (۱۹۸۴ء)
ایم۔ اے (اردو)	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ (۱۹۸۷ء)
پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو)	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ (۱۹۹۴ء)
ملازمت	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ (اکتوبر ۱۹۸۵ء تا حال)
اعزازی سکریٹری	بزم احباب اردو کاکوری، لکھنؤ اقصیٰ پبلک لائبریری کاکوری، لکھنؤ
اعزازی ایڈیٹر	ہفتہ وار امن کا نقیب، کاکوری لکھنؤ (ستمبر ۱۹۹۶ء تا حال)
منتخب ممبر	ضلع کوآپریٹیو بینک، لکھنؤ
سابق سکریٹری	اتر پردیش اردو اکادمی ملازمین یونین و اسٹاف کلب لکھنؤ
ایڈیٹر	یادگاری مجلہ، بزم احباب اردو کاکوری ۱۹۹۴ء یادگاری مجلہ اردو اکادمی اسٹاف کلب لکھنؤ

مثنوی

نگارستانِ راحت

(زیر طبع)

مصنف: بھگونت رائے راحت کاکوروی

ترتیب: ڈاکٹر فرقان علی مخمور کاکوروی

تاریخ گویان کاکوری

(زیر تالیف)

کاکوری کے ۵۰ سے زائد تاریخ گو شعرا کا تعارف، حالات زندگی اور قطعات تواریخ پر مشتمل

ڈاکٹر فرقان علی مخمور کاکوروی

DARD KAKORVI
Life & Works
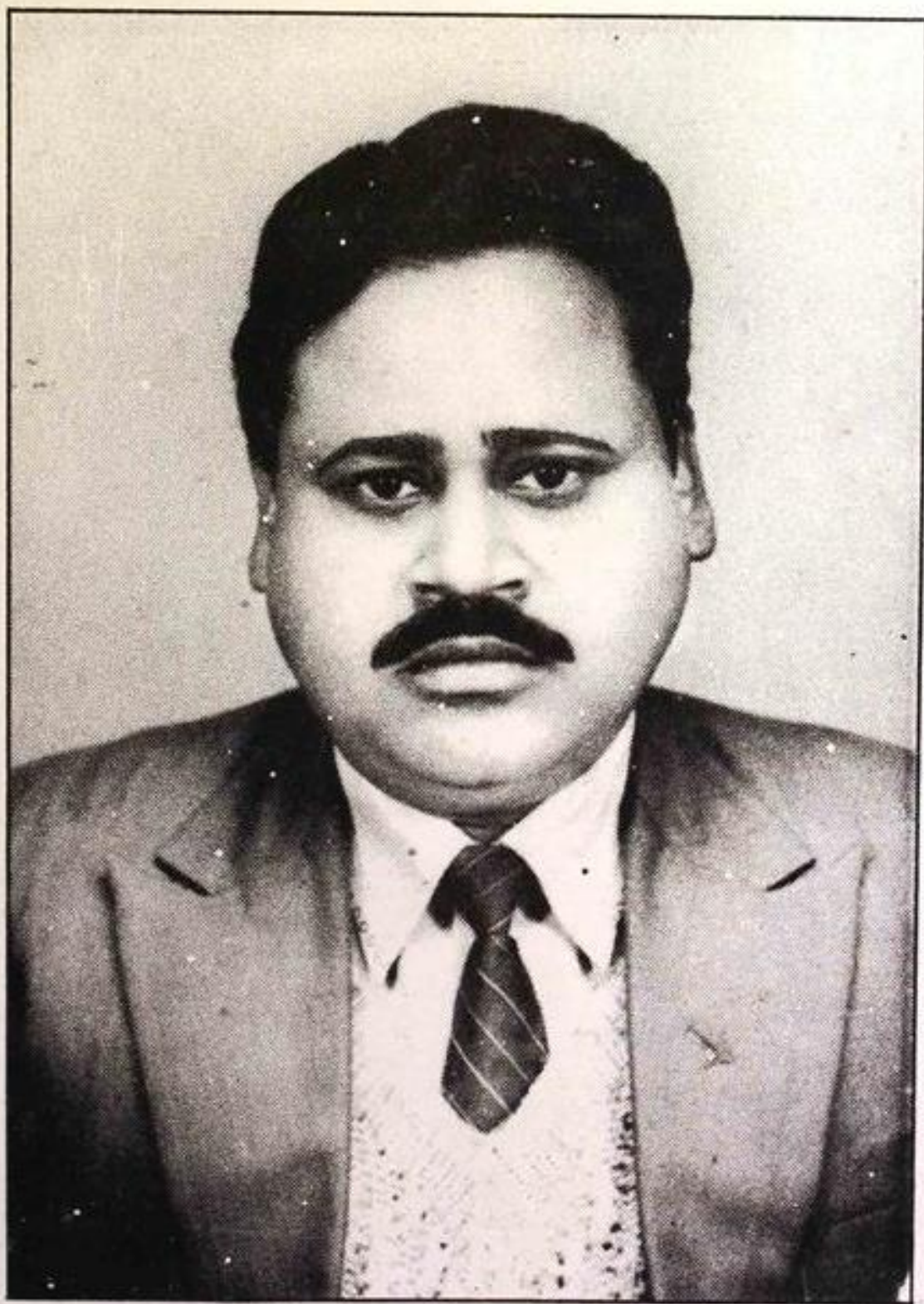
Dr. Furqan Ali Makhmoor Kakorvi

Price : Rs. 140/-